میرے دیدۂ تر کی بیخوابیاں　　میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنی

سلیم کے نام خطوط

جلد اوّل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵-بی-گلبرگ ۲-لاہور

نام کتاب ---------------- سلیم کے نام خطوط (جلد اول)

مصنف ---------------- پرویز

شائع کردہ ---------------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

25-B گلبرگ II لاہور۔ 54660

email: trust@toluislam.com

web: www.toluislam.com

ایڈیشن ہفتم ---------------- اگست 2000ء

Visit us at
www.tolueislam.com

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست مشمولات

چھٹا خط

مغربی اور قرآنی تہذیب کا بنیادی فرق

ساتواں خط

کیا انسانی زندگی محض آب و گل کا کھیل ہے؟

آٹھواں خط

کمیونزم اور اسلام (۱)

نواں خط

کمیونزم اور اسلام (۲)

دسواں خط

قرآنی نظامِ ربوبیّت

گیارھواں خط

زکوٰۃ و صلوٰۃ کا مفہوم

بارھواں خط

تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟

سولھواں خط

عمل بلامعاوضہ

ہر پیغمبر کی دعوت کا آغاز اس اعلان سے ہوا کہ میں اجر نہیں مانگتا۔
اجر کی مختلف شکلیں۔
للہ کے معنی کیا ہیں؟
ایک کہانی کے ذریعے اس کی وضاحت۔
جب مقصدِ حیات، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہو تو کام خود جذبۂ محرکہ بن جاتا ہے۔
قرآن اپنا نظام، ہماری تمدنی دنیا میں رائج کرتا ہے۔
اسلامی نظام ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔
ایمان، کیسے پیدا ہوتا ہے؟

سترھواں خط

غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

ہمارے معاشرے کے ہر گوشے میں بگاڑ برپا ہے۔
مرکزی بگاڑ کا علاج سب کچھ ٹھیک کر سکتا ہے۔
یہ کیسے ہو گا۔
ہم نے بیسویں صدی کے آغاز سے عالمگیر اسلامی برادری کا نعرہ لگایا۔
اس پیہم پکار کے بعد پاکستان ملا۔
لیکن پاکستان میں ہم اس آئیڈیالوجی کو نافذ نہ کر سکے۔
مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟
اب ہمارا معاشرہ کس طرح بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے؟
انھیں کسی ضابطۂ حیات پر ایمان اور کسی اصولِ زندگی پر یقین نہیں رہا۔
صحیح علاج نظریات پر یقینِ محکم ہے۔
قرآنِ کریم کی تعلیم پر یقین دنیا و آخرت کی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی اساس ہو گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(طبع اوّل)

○

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم! جانِ من و جانِ شما

تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے رموز و غوامض، انسانی سیرت و کردار کے نقوش اور قرآن کے حقائق و معارف اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ قوموں کی تقدیر ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس قسم کے سانچوں میں ان کے قلب و دماغ کو ڈھالا جائے گا اسی قسم کا اس قوم کا مستقبل ہوگا۔ یہی قوموں کی تخلیق کا معیار ہے اور یہی ان کی مدّتِ حیات کا پیمانہ۔ اسی سے یہ متعین ہوسکتا ہے کہ اقوامِ عالم کی صف میں کسی خاص قوم کا مقام کیا ہوگا اور اسی سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک کاروانِ انسانیت کے ساتھ چل سکے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ہنگامی حوادث کسی قوم کو اس کی قوّت و دولت سے محروم کردیں اور اس طرح وہ میدانِ منافست میں دیگر اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اضطراری اسباب و علل کی بنا پر اس کی شوکت و حشمت اس سے چھن جائے اور اقوامِ غالب اس کے سینۂ ناتواں پر کابوس کی طرح سوار ہوجائیں لیکن اگر وہ قوم اپنے بچوں کو سنبھال لے اور ان کی تعلیم و تربیت ٹھکانے سے کرلے تو دنیا دیکھے گی کہ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خونِ گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار کس طرح ایک کفِ بردہاں سیلاب کی طرح اُٹھتا اور ہر ٹکرانے والی قوّت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی قسمتوں کے فیصلے بساطِ سیاست یا میدانِ جنگ میں نہیں ہوتے۔ یہ فیصلے ان کے مکتبوں اور تربیت گاہوں میں ہوتے ہیں۔ کوئی قوم اپنے حریفِ مقابل سے نہیں پٹتی۔ وہ اپنے نوجوانوں کی غلط تعلیم سے پٹتی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر میں نے اپنی قرآنی بصیرت کا مخاطب ہمیشہ قوم کے نوجوان طبقہ کو سمجھا ہے۔ میں نے ہمیشہ انہیں اپنے قریب رکھا ہے' ان کے احساسات و جذبات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے قلبی اضطرابات و ذہنی شبہات کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان کی اُلجھنوں کو مشفقانہ انداز سے سُلجھانے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ تجربہ کامیاب رہا ہے۔ میرے پاس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے نوجوان آتے ہیں' مذہب کی طرف سے دل میں شکوک و شبہات کے سینکڑوں کانٹے اور دماغ میں سرکشی و طغیان کے ہزاروں شعلے لئے ہوئے۔ میں ایک ایسی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتا ہوں جو میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے (اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ ان کا یہ انداز درحقیقت ردِّ عمل ہے مذہب کے متعلق اس غلط تعلیم کا جو انہیں گھر کے ماحول اور مدرسہ کی چار دیواری میں ملی ہے)۔ میں ان کے تند و تلخ اعتراضات کو صبر و سکون سے سنتا ہوں۔ اس کے بعد اس "زبان" میں جو اُن کی سمجھ میں آجائے' انھیں قرآن سناتا ہوں۔ اور میری حیرت و مسرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کے شکوک و شبہات' یقین و اطمینان سے اور ان کی سرکشی کے جذبات' قرآن کی عظمت کے اعتراف سے بدل جاتے ہیں۔ وہ آتے ہیں خدا' وحی' رسالت' قرآن اور دین کے نام پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے اور جاتے ہیں ان کے گرویدہ ہوتے ہوئے۔ (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) دین کی طرف سے ہمارے نوجوانوں کے جذباتِ تنفّر و سرکشی کے ذمّہ دار ہم خود آپ ہیں۔ ہم انہیں فلسفہ اور سائنس میں تو وائٹ ہیڈ اور آئن سٹائن پڑھاتے ہیں اور مذہب وہ پیش کرتے ہیں جس پر عقل ہنسے اور علم ماتم کرے۔ اگر وہ اس قسم کے مذہب کی طرف سے سرکشی اختیار نہ کریں تو اور کیا کریں؟ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے' انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی بجائے (جو ہمارے معاشرے میں متوارث چلا آرہا ہے' جس کی تعلیم ہمارے مذہبی مدارس میں دی جاتی ہے اور جسے منبر و محراب سے دہرایا جاتا ہے)، خدا کی طرف سے دیا ہوا دین پیش کیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ ان کی نگاہیں اس کی عظمت کے اعتراف میں جُھک نہ جائیں۔

سلیم! اسی جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا نمائندہ ہے اور اس کے نام خطوط' ان شکوک و شبہات کے جواب ہیں جو اُن کی طرف سے گزشتہ پندرہ بیس سال میں میرے سامنے آتے رہے۔ اس سے آپ ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یوں تو انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے زمان و مکان کی تبدیلی سے تغیر پذیر

نہیں ہو سکتے (اسی لئے قرآن کی تعلیم جو انہی تقاضوں کا حل پیش کرتی ہے، ہمیشہ کے لئے انسانی رہنمائی کے لئے کافی ہے)۔ لیکن کسی ایک زمانے میں بعض تقاضے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے قرآن سے راہ نمائی کی تلاش (اور اسے پیش) کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اُبھرتے ہوئے تقاضوں سے واقف ہو اور انسانی علم جس سطح تک جا پہنچا ہے، وہ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ اگر کوئی شخص ان مبادیات سے کماحقہٗ باخبر نہیں تو وہ اپنے دَور کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اسی نہج سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی نہج سے میں اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس لئے ان خطوط میں آپ کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے آثار اور اس کی علمی سطح کی بلندی، دونوں کی خفیف سی جھلک نظر آجائے گی۔ (ان امور کا تفصیلی تعارف میری دوسری مبسوط تصانیف سے ہو سکے گا۔ خطوط میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہو سکتی)۔

میرے ایک دوست نے (جن کے ذوقِ سلیم کا میں معترف ہوں) کہا ہے کہ سلیم کے نام میں جان نہیں، حالانکہ میرا مخاطب نوجوان "کڑی کمان کے تیر" جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اعتراض درخورِ اعتنا ہے اور اسی لئے میں نے "سلیم کے تعارف" میں اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں لفظ "سلیم" کا وہ مفہوم نہیں جس مفہوم کے لئے یہ لفظ عام طور پر ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ "قلبِ سلیم" لے کر آئے تھے (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۳۷/۸۴)۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی تفصیلاً بتا دیا ہے کہ سیرتِ ابراہیمؑ کے خط و خال کیا تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ انہوں نے کائناتی قوانینِ خداوندی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۷۶)۔ جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ زندگی کے جو نقشے خارجی حوادث سے تغیر پذیر ہو سکتے ہوں وہ کبھی مستقل اقدار کے حامل نہیں ہو سکتے۔ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (۶/۷۶)۔ اُن کی دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جب تک کسی راستے کے متعلق پورا پورا اطمینان نہیں کر لیتے تھے، اس پر گامزن نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ وہ پیشِ نظر قوم تک زندگی کا پیغام پہنچائیں تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں یہ کچھ اسی صورت میں کر سکوں گا جب میرا اطمینان ہو جائے کہ مردہ قومیں کس نہج و اسلوب سے زندہ ہوا کرتی ہیں۔ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (۲/۲۶۰)۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ زندگی کا یہی راستہ صحیح ہے تو پھر

وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے راستہ میں حائل نہ ہو سکی اور کوئی مشکل اور مصیبت ان کے عزم و ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ انہوں نے سب سے پہلے خود اپنے باپ سے اعلانیہ کہہ دیا کہ تم کس غلط راستے پر چل رہے ہو۔ چھوڑو اس راہ کو اور زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرو۔ حالانکہ یہ ظاہر تھا کہ باپ کی اس مخالفت سے وہ اس جاہ و منصب سے محروم رہ جاتے تھے جو انہیں اس کی جانشینی میں ملنے والا تھا۔ اور اگر باپ ان کی بات مان لیتا تو ان کے خاندان سے وہ عزت و تکریم سب چھن جاتی تھی جو اس زمانے میں شاہی معبد کے پیشوا کو حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت جرأت و بیباکی سے باپ کو غلط راستے پر چلنے سے ٹوک دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو پوری کی پوری قوم کے خلاف آواز بلند کر دی اور انہیں للکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو! تمہاری روش تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ قوم سے آگے بڑھے تو خود بادشاہ سے ٹکر لے لی۔ اس بادشاہ سے جو اس وقت خدا سمجھا جاتا تھا۔ جسے اپنی قوت و جبروت کے متعلق ایسا گھمنڈ تھا کہ اس نے کہہ دیا کہ تم کس خدا کی باتیں کر رہے ہو کہ وہ مارتا ہے اور جلاتا ہے! اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ (۲/۲۵۸) "میں مارتا ہوں اور میں ہی جلاتا ہوں" زندگی اور موت میرے قبضے میں ہے۔ اس بادشاہ سے کھلے بندوں ٹکر لی اور اس کے تمرد کی آگ میں بلا تامل و توقف کود پڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ دیکھا کہ اپنے وطن کی فضا ان کے پیغام کے لئے سازگار نہیں، تو گھر بار، عزیز و اقارب، وطن اور ماحول کی تمام جاذبیتوں کو ٹھکراتے ہوئے یہ کہہ کر نکل کھڑے ہوئے کہ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷/۹۹)۔ میں اس فضا کی تلاش میں جا رہا ہوں جہاں اپنے خدا کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کر سکوں۔ پھر جب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے بیٹے جیسی متاعِ عزیز کی قربانی کا مطالبہ ہے تو اس کے حلق پر چھری رکھ دی اور جب "خدا کے گھر" کو بسانے کی خاطر اپنی اولاد کو ایک بے برگ و گیاہ وادی میں آباد کرنے کا سوال پیدا ہوا تو اس پر بھی لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے سامنے آ گئے۔

یہ ہیں اُس قلبِ سلیم کے خصائص و مظاہر جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینے میں ضوفشاں تھا۔ ان خصوصیات کا نتیجہ کیا تھا؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جہاں یہ فرمایا کہ انہیں "قوت و بصیرت دونوں حاصل تھیں" (۳۸/۴۵)۔ یہی ہے ان خطوط کا مخاطب سلیم۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کا پیکر۔ اس لئے کہ

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

لہٰذا سلیم دورِ حاضر کے آزادانہ ماحول میں براہیمی نظر کا حامل نوجوان ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

جہاں تک خطوط کا تعلق ہے، ان کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ اپنا تعارف آپ کرا دیں گے۔ صرف اتنا بتا دینے کی ضرورت ہے کہ ان کی ترتیب میں ذہنی تدریج اور فکری ارتقار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ان خطوط میں بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو شاید آپ کے سامنے پہلے پہل آئیں۔ چونکہ نامانوس چیز کو دیکھ کر متحیر ہو جانا (یا بدک جانا) مستبعد نہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک بار کے مطالعے سے آپ ان باتوں سے متفق نہ ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ ایسے مقامات کو زیادہ مرتبہ پڑھئے اور ان پر گہری نظر ڈالئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح آپ کا قلب اور دماغ دونوں مطمئن ہو جائیں گے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ میرا مسلک یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں آخری سند قرآن کریم ہے۔ اس لئے جن مقامات میں آپ کو کچھ تامل ہو وہاں یہ دیکھئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی سند قرآن سے ملتی ہے یا نہیں۔ یہ نہ کہیئے کہ چونکہ یہ چیز اس روش کے خلاف ہے جس پر ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں، اس لئے یہ غلط ہے۔ جب قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ ہمارے پاس موجود ہے تو ہم خود اپنا اطمینان کیوں نہ کر لیں کہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔

ان خطوط میں آپ کو بعض باتوں کی تکرار نظر آئے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی کتاب میں تکرارِ مضامین تصنیف کا نقص ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ یہ کتاب خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ اس قسم کے خطوط میں ہوتا یہ ہے کہ جو بات سامنے آئی، اسے وہیں بیان کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے خطوط یکجا (مجموعے کی شکل میں) سامنے آئیں گے تو ان میں بہت سی باتیں دہرائی ہوئی ملیں گی۔ یہ تکرار جہاں بعض نازک طبائع پر ناگوار گزرے گی وہاں اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جو باتیں نئی نئی معلوم ہوں گی، وہ بار بار سامنے آکر واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ (اسی مقصد کے پیشِ نظر، قرآن نے بھی اپنے ہاں "تکرار" کو روا رکھا ہے۔ وہ "تصریفِ آیات" سے اپنے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔

جیساکہ میں نے شروع میں لکھا ہے، میری تمام کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قرآن نے سمجھا ہے اسے کسی نہ کسی طرح قوم کے نوجوانوں تک پہنچاؤں۔ اگر میری اس کوشش سے قوم میں چند ایک نوجوان بھی ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن کے نورِ بصیرت کو عام کرنے اور اس کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تو میں سمجھوں گا کہ میری دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا صلہ مل گیا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو قرآنی فکر میں پیش کر رہا ہوں، موجودہ دَور کا مسلمان اسے قبول کرنے کے لئے بمشکل آمادہ ہوگا۔ لیکن میں "فطرت کے خاموش اشاروں" سے یہ سمجھ رہا ہوں کہ زمانہ خود تصوراتِ زندگی کو اپنانے کے لئے بڑا مضطرب اور بیقرار ہے۔ وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور وقت شاید قریب آرہا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ:

"زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔"

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کو متشکل کرنے کی سعادت کس قوم کے حصے میں آتی ہے۔ جس قوم کو یہ سعادت نصیب ہو گئی وہی نوعِ انسانی کی امامت کی مستحق قرار پائے گی۔

چونکہ ان خطوط نے ملک کے نوجوان طبقے میں نہایت عمدہ اثر پیدا کیا ہے اس لئے میں یہ کوشش کروں گا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ ان کے ساتھ ہی اب "طاہرہ کے نام خطوط" کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے کیونکہ سلیم کے ساتھ اس کا بھی برابر کا حق ہے (بلکہ ایک حیثیت سے اس سے بھی زیادہ)۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

۲۶ مئی ۱۹۵۳ء

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا خط

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآنِ کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتابِ مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوعِ انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں، ایسا یقین جو وجۂ طمانیتِ قلب اور باعثِ تسکینِ روح ہوا کرتا ہے، نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریبِ نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو، اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے۔ روزے بھی رکھتی ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتی ہے۔ حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے، تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ (حضور نبیٔ اکرمؐ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے۔ اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ "اعمالِ حسنہ" کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب، جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں

تمازت باقی نہیں رہی، رحمت کی بیوی اپنے خورد سال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔
رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہیئے) رونق اور زندگی، تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آبیٹھی۔ خشک ٹہنیاں، سوکھے ہوئے پتے، خس و خاشاک، دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں، لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اُس نے اُن کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں، ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں، پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئیں، گھٹنوں تک پرانا تہمد، پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس اس شدت کے جاڑے میں یہی کُل کائنات، چہرے پر زردی چھائی ہوئی، ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوئیں، گھر کی طرف قدم اٹھاتا، لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر اِدھر اُدھر پھرتا، لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

(٥)

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا! لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مَردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے

دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچّہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمّت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذباتِ غم و حزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آکر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچّے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

——— (٥) ———

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدّت ہوئی جالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچّہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلّہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنّی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلّے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بیچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول سٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

——— (٥) ———

اور تم نے رضیہ بیچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سُن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر

نکل سکے. جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا. اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اُجرت کیسے ساتھ چلا جاتا ؟ گاؤں میں دُور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہولے ؟ سارا گاؤں فتوخاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا. غریب اکیلی چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہوگئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے. (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (" شمس العلمار " تھے) دو حج کئے تھے). اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹرپن میں مشہور ہیں. لیکن وہ " مذہبی معاملات " کیا ہیں ؟ ذرا سُن لو. مقلّد اور غیر مقلّد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے. اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا. خود مقلّدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی. دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک " عظیم الشان " مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے. کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے. یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت " بھاری " مولوی تھے. تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی. انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسول اللہ کی شان سے بڑی ہے. کیونکہ رسول اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی. گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا. وہ رسول اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے. پھر کیا تھا، دو پارٹیاں بن گئیں، باہمی جھگڑے ہوئے، لڑائیاں ہوئیں، مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی. قریب سال بھر ہوگیا یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے اور ہر فریق اس مساعی حسنہ کو " جہادِ عظیم " قرار دے رہا ہے. اسی باہمی تشتّت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہورہے ہیں. فصلیں تباہ ہوچکی ہیں. زمین کا بیشتر حصّہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے. بقایا رہن رکھا ہوا ہے. کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ " دین دار " مسلمان ان کے مزارعہ ہوجائیں گے. اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا. اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں.

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں. لیکن تمہیں وہ خطبۂ جمعہ بھی تو یاد ہوگا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا. جناب خطیب نے 'جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے' یہی فرمایا تھا کہ " شبِ بارات "

ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں. میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا. لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ دار ہے " اس کے بعد تمہیں یاد ہوگا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمتِ خداوندی کے اس بحرِ ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہوگا. لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا. لوگوں کی آنکھیں اُوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہوگا جو ابرِ رحمت کی ایسی گہرباری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک؛ اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا. یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہوگا. یہ تو سلیم! "جہلا" کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے. انہیں یہ سب کچھ "عین اسلام" کہہ کر پڑھایا گیا تھا اور وہ اسی کو "عین اسلام" سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بیتا کی داستان سنا رہا تھا. اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے. ذرا اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے گذر جاتے ہیں. سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے "اعمالِ حسنہ" وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتے جو ہونے چاہئیں تھے، کچھ تعجب انگیز نہیں. سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے. دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں، مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں. لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے. اس مقصدِ عظیم کے لئے اسلام ہر عبدِ مومن کو اس کارگہ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پُرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے. اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے. لیکن اگر یہ پُرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو، مشینری بیکار ہو جائے گی. آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے. سلیم! غور سے قرآنِ کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا، خدا کا غضب ہے، اللہ کا عذاب ہے. اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے

بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عملِ صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت، تمکن و استخلاف نہیں یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے، وہ ایمان، ایمان اور وہ عمل، عملِ صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے، کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہرحال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراجِ کبریٰ، یعنی دورِ رسالتؐ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا، بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم، قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مردِ مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصودِ آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وجہِ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیتِ عامہ (نوعِ انسان کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا، جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

(۰)

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمالِ اسلامی کا ماحصل محض اسی دُنیا کی فلاح و کامیابی، غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمالِ اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اُترتے۔

(۰)

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی

بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خود ساختہ سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد اُمّت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا۔ اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ اُمَمِ گزشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلّت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوتی تھیں، کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو اُن پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہیئے تھا کہ ان کے پاس قانونِ خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا۔ لیکن انہوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہیئے؟ انہیں وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوعِ انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے میں، نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم: اخوّت، مساوات، حریّت، وحدتِ انسانی، جماعتی زندگی، مرکزیّت، اطاعت، فرد کا ملّت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملّت کا افراد کی ربوبیّت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظامِ حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دورِ ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآنِ کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ اُمّتِ مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ، عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رُو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنّی ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷/۹۶) ”اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی

کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔"
اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآنِ کریم سے ملے گی۔ بشرطیکہ تم اُسے، تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک　　(اقبالؒ)

والسلام

نومبر ۱۹۳۹ء

دوسرا خط

ہمارے مذہبی اجتماعات

سلیم! تم ٹھیک کہتے ہو کہ جمعتہ الوداع کے دن جامع مسجد میں قریب پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور تم نے یہ بھی درست کہا کہ اس عظیم الشان گروہ کے ایک آواز پر جھکنے اور اُٹھنے کی ہم آہنگی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ اس کی دلکشی تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ بڑے بڑے سیّاح آپ کے اس "تماشے" کی تصویریں لینے دُور دُور سے آتے ہیں اور ان کے لئے مسجد کے سب سے بلند مقام پر، اُن حضرات کی طرف سے سہولتوں کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں، جن سے اگر تصویر کشی کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے تو کبھی تکفیر سے ورے بات نہ کریں۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ لیکن سلیم! میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے ہجوم میں کتنے ایسے تھے کہ جسمانی حرکات کی ہم آہنگی کے ساتھ اُن کے قلوب بھی ہم آہنگ ہوں۔ اسلام، وحدتِ خیال کے بعد کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے، وحدت فی العمل کا سبق سکھانے آیا تھا اور اس اتحادِ عمل بلکہ وحدتِ خیال و عمل کے بہترین مظاہر اسی قسم کے اجتماعات تھے۔ لیکن ذرا غور کرکے بتاؤ تو سہی کہ اس ظاہری اتحادِ عمل میں حقیقی اتحادِ خیال و اعمال کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحبان صف بہ صف، اِدھر اُدھر لوگوں کو نماز باجماعت کے مسئلے بتاتے پھرتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ صفیں کس طرح سیدھی رکھنی چاہئیں۔ دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ کندھے کے ساتھ کندھا نہ ملنے سے کتنا عذاب ہوگا۔ پہلی صف میں بیٹھنے سے کس قدر ثواب ہوگا۔ لیکن سلیم! ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ بتایا کہ مسلمانو! تم یہاں جمع کس غرض کے لئے ہوئے ہو؟ تمہیں نماز کیا پیغام دیتی ہے؟ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اٹھنا بیٹھنا کیسا ہے؟ صفیں کیوں سیدھی ہونی چاہئیں؟ "امام" صرف ایک ہی کیوں ہوتا ہے؟ اور اس کی ایک آواز پر بلا چون وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں

کرنی پڑتی ہے؟ وہ بھول جاتا ہے تو اسے اس کی یاد دلانے کے لئے اشارہ تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی متابعت کیوں کرنی ہوتی ہے اور کیوں اس کی بھول کا کفارہ (سجدہ سہو کی شکل میں) ساری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے؟ ایک وقت میں ایک ہی جماعت کیوں ہوتی ہے؟ متعدد جماعتیں کیوں نہیں ہو سکتیں؟ "تماشا" دیکھنے والے سیاح جب اس نظارہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو مسلمانوں کے ضبط و انضباط، وحدتِ خیال و عمل، یک جہتی اور ہم آہنگی ــــ اطاعت و تمسک بالجماعت کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے بھی وہ آشنا ہو چکے ہیں کہ یہ مظاہرہ اب صرف جسموں تک محدود ہو چکا ہے۔ قلوب پر اس کا کچھ اثر نہیں۔ یہ ایک رسم بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی روح بالکل بھلائی جا چکی ہے۔ آج دنیا کی ہر قوم اپنی تمام قوت اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کر رہی ہے کہ اُن کے افراد میں اتحادِ خیال و وحدتِ عمل پیدا ہو۔ ان کے قلب و نگاہ میں یک جہتی اور ان کی حرکات و سکنات میں یگانگت ہو جائے۔ وہ ایک " امام متفق علیہ " کی آواز پر سب کے سب جُھک جائیں اور سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوں۔ اب اندازہ لگاؤ کہ جس قوم میں یہ سب چیزیں بلا محنت و کاوش خود بخود موجود ہوں لیکن اس سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہو' تو اسے تم بے روح مظاہرہ نہ کہو گے تو اور کیا کہو گے؟ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ دنیا ضبط و انضباط کی تلاش میں مارے مارے پھر رہی ہے۔ محض اس لئے کہ اس طرح اپنے اندر قوت پیدا کر کے کمزور قوموں کے خون سے اپنی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کرے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ میں یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا جاتا ہے کہ ان کے قلوب پاکیزہ ہوں۔ ان کی ذات نشو و نما پائے۔ وہ ہر وقت اللہ کے قانون کو سامنے رکھیں۔ ان کا جھکنا ہو تو اس کے لئے' اُٹھنا ہو تو اُس کے لئے۔ ان کی قوت' ناتوانوں کی حفاظت کے لئے ہو۔ ان کی طاقت' ضعیفوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ وہ اپنے ایمان و اعمالِ صالحہ سے ایسی قوت پیدا کریں کہ استخلاف فی الارض کی نعمتِ کبریٰ سے نوازے جائیں۔ اور اس استخلاف سے مقصود ملوکیت نہ ہو۔ بلکہ اس دُنیا خدا کی ربوبیت (نوعِ انسان کی پرورش) عام کرنا ہو۔ سلیم! اندازہ لگاؤ کہ رمضان کا آخری جمعہ ان مقاصدِ عالیہ کے حصول کے لئے کس قدر عظیم المرتبت نفسیاتی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ مہینہ بھر سے خدا کے بندوں میں جسمانی اور قلبی انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ انہیں خفیفۂ سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔ ان کے دلوں کو تمام خباثتوں سے پاک اور ان کی نگاہوں کو تمام آلودگیوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ اُن سے ایک وقتِ مقررہ کے لئے حلال و طیب چیزیں بھی چھڑائی گئی تھیں تاکہ وہ حرام و خبیث چیزوں کی طرف نگاہ تک بھی نہ اٹھائیں۔ اس کے بعد انہیں ایک جگہ جمع کیا گیا کہ وہ جائزہ لیں اپنے تمام اعمال کا اور محاسبہ کریں اس انقلاب کا جو ان کے اندر پیدا ہوا ہے۔ اپنی

انفرادی خودی جس کا یوں استحکام کرایا گیا ہے' اُسے ایک اجتماعی کُل کا جزو بنادیں اور یوں اطاعتِ امیر' مرکزیت' ایثار' تمسک بالجماعت' اتحادِ عمل اور ائتلافِ خیالات کے جیتے جاگتے مظاہرے تجدیدِ عہدِ وفا کریں اور اُٹھتے جھکتے بار بار اپنے اللہ کے سامنے اس دعوے کی عملی شہادت پیش کریں کہ

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۱۶۲)

میری صلوٰۃ اور تمام دیگر مخلص اعمال' میرا جینا' میرا مرنا' سب اللہ رب العالمین (یعنی اللہ کی ربّ العالمینی کو عام کرنے) کے لئے ہے۔

سلیم! تم سمجھتے ہو کہ ایسے انقلاب در آغوش افراد کی یہ جماعت دنیا میں کیا کچھ نہ کرسکتی ہوگی۔ لیکن اس کے بعد ذرا ایک مرتبہ اس "ہجومِ مومنین" کی نماز پر پھر نگاہ ڈالو۔ ساری نماز پر نہیں۔ نماز کے صرف ایک ٹکڑے پر۔ ذرا سوچو کہ پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کا گروہ' اللہ کے سامنے' رُو بہ قبلہ' مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اقرار کررہا ہو کہ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

اے اللہ! ہم صرف تیری محکومیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے سوا ہر قسم کی غلامی کا طوق ہم پر حرام ہے۔ لیکن زبان سے یہ الفاظ ادا کررہا ہو اور دماغ سینکڑوں خداؤں کا بُت کدہ بن رہا ہو' تو اس دعویٰ کو تم خدا فریبی اور خود فریبی نہ کہو گے تو اور کیا سمجھو گے؟ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان لوگوں نے نماز نہیں پڑھی بلکہ اپنے آپ سے غداری اور خدا سے دھوکہ کیا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے "حاملانِ دینِ متین" لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑجائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اس میں ان بچاروں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اس لئے کہ انہیں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اگر ہاتھ فلاں مقام پر باندھ لئے جائیں۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا جائے۔ انگلیوں کا رُخ فلاں سمت کو ہو۔ سجدے میں فلاں فلاں حصے پہلے زمین بوس ہوں۔ الفاظ اپنے صحیح مخرج سے نکلیں' تو نماز ہوجاتی ہے۔ اور جب پوچھو کہ اس بات کی کیا سند ہے کہ اس سے نماز واقعی ہوجاتی ہے اور اس سے وہ مقصد پورا ہوگیا ہے جس کے لئے صلوٰۃ کو فرض قرار دیا گیا تھا' تو جواب مل جاتا ہے کہ اس کا علم تو قیامت ہی کو ہوسکے گا کیونکہ دُنیا دارالعمل ہے۔ نتیجہ یہاں برآمد نہیں ہوسکتا۔ اور جب ان سے کہو کہ بھائی! اللہ تو ایمان و عمل کی جزا استخلاف فی الارض اور وراثتِ زمین فرماتا ہے' تو کہہ دیتے ہیں کہ اس ارض سے مراد جنّت کی زمین ہے۔ لیکن سلیم! ان باتوں کو تم کسی سے نہ پوچھو۔ قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انسانیت کے معراجِ کبریٰ کے دورِ ہمایوں کی تاریخ اس کے اندر ہے۔

چشم بردے او کشا۔ باز بخویشتن نگر

تمہیں معلوم ہے کہ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے اور اسی رمضان کی سترہ تاریخ کو ان روزہ دار نمازیوں کی تو تولی کا امتحان بھی لے لیا گیا۔ یوروپین مورخ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔ لیکن ان کی تنگ نگاہیں ذرا اور آگے بڑھتیں تو دیکھتیں کہ ۲ھ کے رمضان میں بدر کے میدان میں جو لڑائی ہوئی اس نے دنیا کی ہسٹری کو بدل دیا۔ باطل و ظلمت کی تمام تخریبی قوتیں اپنے ساز و سامان سے آراستہ اس ارادے سے میدان نکل آئیں کہ (معاذ اللہ) اللہ کے نور کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔ مسلمانوں کی کل کائنات، قریب تین صد نفوس جو ابھی ابھی اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک دور دراز مقام میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ بے سر و سامان، بظاہر بے کس و بے بس۔ ان کے لئے اب زندگی اور موت کا سوال تھا۔ نہیں۔ صحیح الفاظ میں حق یا باطل کے غلبہ کا سوال تھا۔ ان روزہ داروں نے کیا کیا؟ اپنے بچوں تک کو لے کر، کھجوروں کی ٹہنیوں اور اونٹوں کی پسلیوں سے مسلح میدانِ جہاد میں آگئے۔ سلیم! ذرا اس موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاؤ اور اس کا احساس اس سے کرو کہ خود نبیِ اکرمؐ نے اس لق و دق صحرا میں نہایت خشوع و خضوع سے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے اللہ! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت محض تیرے نام کی بلندی اور تیرے دین کی حفاظت کے لئے سربکف اس میدان میں جمع ہوگئی ہے۔ اگر آج یہ سب شہید ہوگئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ مانگنے والے نے ابھی دعا بھی نہیں کی تھی کہ دینے والے نے اسے اپنی رحمتوں سے یوں نوازا کہ

اِنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ (۸/۹)

میں تمہاری مدد کے لئے ہزار فرشتے لگاتار بھیجوں گا۔

فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے اور وہ آکر کیا کریں گے؟ ان سے کہا جائے گا کہ

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ...

(۸/۱۲)

مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھو۔ میں کفار کے دلوں میں دہشت طاری کر دوں گا۔

فی الحقیقت، وہ ملائکہ جنہوں نے خلیفہ فی الارض کو جھک کر سلام کیا تھا، انہیں ان مجاہدین کی یوں ہی مدد کرنی چاہیئے تھی۔ جب انسان قانونِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے عملاً باہر نکل آئے تو کائناتی قوتیں سب اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ لیکن سلیم! اللہ نے یہ نہیں کہہ دیا کہ تم مزے سے بیٹھے رہو سب کچھ ہمارے فرشتے ہی کر دیں گے۔ بلکہ اس وقت ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھ دیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ذرا غور سے سنو کہ وہ ضابطہ کیا تھا۔ وہ ہدایات کس قسم کی

تھیں۔ فرمایا:۔

"اے ایمان والو! جب تم میدانِ جنگ میں کفار کے سامنے جاؤ تو ان کو پیٹھ مت دکھاؤ۔ یاد رکھو۔ جو آج کے دن انہیں پیٹھ دکھائے گا بجز اس کے کہ وہ پینترا بدلتا ہو یا اپنی فوج میں آنے کے لئے ایسا کرتا ہو اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔" (۱۶—۸/۱۵)

سلیم! سنتے ہو کہ مخاطب کون سے مسلمان ہیں اور غور کرتے ہو کہ اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دینا، دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھا دینا، کس قدر جرمِ عظیم ہے؟

پھر فرمایا:۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے مت پھرو۔ درانحالیکہ تم سُن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سُن لیا۔ حالانکہ وہ (صحیح معنوں میں) سنتے نہ تھے۔ اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو جس وقت تمہیں وہ اس چیز کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔" (۲۴؛ ۲۱—۸/۲۰)

سمجھتے ہو کہ خدا کی راہ میں "مرجانے" کا نام زندگی کیوں رکھا جاتا ہے؟ اس عظیم الشان حقیقت پر غور کرو، موت اور حیات کے سربستہ راز تم پر منکشف ہو جائیں گے۔ اور پھر تم نے اس اطاعت پر بھی غور کیا جس میں "سُننا" شرط ہے۔ یہ بالمشافہ اطاعت زندہ مرکز کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام اُس وقت تک دین (نظامِ معاشرہ) رہتا ہے جب تک اس میں ایک زندہ مرکز ایسا ہو جس کی اطاعت کی جائے۔ انفرادی زندگی میں دین باقی نہیں رہتا۔ (یہ بہرحال ایک اور موضوع ہے جس کے متعلق تفصیلاً کسی دوسرے وقت لکھوں گا)۔

پھر فرمایا:۔

"اے ایمان والو! جب تم کسی جماعت کے مقابلہ میں جاؤ تو ثابت قدم رہو اور قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو استقامت کا ثبوت دیں۔" (۴۶—۸/۴۵)

سلیم! سنتے ہو کہ یہ ہدایات کیا ہیں؟ یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی رُوح ہیں۔ یہ ایک عبدِ مومن کے اظہار

عبودیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ یہ صرف ۲ھ کے بدر کے موقع کے وقتی احکام نہیں، بلکہ جب تک حق و باطل میں آویزش کا امکان ہے۔ جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے۔ جب تک شرارِ بولہبی، چراغِ مصطفوی سے ستیزہ کار ہے۔ اس وقت تک کے لئے تمام مسلمانانِ عالم کے واسطے ایک دستورِ اساسی ہیں۔ ایک لائحہ عمل ہیں۔ یہی ہدایات ہیں جن کے لئے رمضان کے روزے اور ان روزوں کا جمعتہ الوداع ہے۔

سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ صحیح نتائج پیدا کرنے والے روزے اور نمازیں ان تین سو مسلمانوں کی تھیں یا اس ساٹھ ستر ہزار کے رسمی اجتماع کی جس میں مقصد اور روح کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ سو بھائی نادان کیوں بنتے ہو؟ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ سحری اور افطاری کے گولے قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھا سکتے۔ ہر چند ان کا دھماکہ اور دھواں اصلی گولوں کا سا ہوتا ہے۔

(۰)

عید کے متعلق میں نے تمہیں پچھلے سال بتایا تھا کہ یہ نزولِ قرآن کی یاد میں اسلامی جشن ہے۔ تم دنیا بھر کی قوموں کے جشن و مسرت کے تہواروں کو دیکھو۔ ان میں یا تو کسی انسان کی یادگار کا جذبہ پنہاں ہوگا یا مظاہرِ فطرت کی نیرنگیوں کی تقریب یا نئے موسم کا استقبال۔ لیکن انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں۔ دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات گم ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانوں پر گاڑی ہوئی لاٹھیں اور ان لاٹھوں پر کندہ کی ہوئی داستانیں، زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن خدا کا وہ ازلی و ابدی پیغام جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے، کبھی مٹ نہیں سکتا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے لے لی ہے جو زندہ ہے، کبھی مر نہیں سکتا۔ جو قائم ہے، کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ باقی ہے، اس کا پیام بھی باقی ہے۔ وہ زندہ ہے، اس کا کلام بھی زندہ ہے۔ یہ جشنِ عید اسی خدائے حیّ و قیّوم کے زندہ قرآن کے نزول کی یادگار ہے۔ اور جب تک دنیا رہے گی، یہ یادگار بھی باقی رہے گی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ و اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ و للہ الحمد۔

پھر جس طرح یہ کتاب دنیا کی کتابوں میں عجیب تر ہے، اس کی یادگار بھی دنیا کی تمام یادگاروں سے نرالی ہے۔ دنیا کے جشن، کھیل تماشے، رنگ راگ، عیش و نشاط سے منائے جاتے ہیں۔ لیکن شعائرِ الٰہی کی یادگاروں کے جشن منانے کے لئے ایک بالکل الگ پروگرام تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے لئے لوگ مہینے بھر سے تیار کئے

لے دلی میں جامع مسجد قلعے کے سامنے ہے۔ وہاں سے سحر و افطار کے گولے چھوٹا کرتے تھے (شاید اب بھی چھوٹتے ہوں)۔

جا رہے تھے۔ انہیں سکھایا جا رہا تھا کہ دنیا کی تمام جھوٹی طاقتوں سے مُنہ موڑ کر اس ایک خدا کے قانون کے محکوم بن جاؤ۔ مانگو تو اسی سے مانگو۔ جھکو تو اسی کے سامنے جھکو۔ بھوکے اور پیاسے رہ کر اپنے فرائض سرانجام دو۔ یہ ایک ٹریننگ تھی جو سپاہی کو میدان میں لانے سے پیشتر دی جاتی ہے۔ پورے ایک مہینے کی ریاضت و محنت سے ذہنوں میں ایک بلند شعور پیدا ہو گیا تو انہیں ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا کہ نیک دل اور پاکیزہ دماغ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ ہمیں اس امتیازی زندگی کے حصول و بقار کے لئے کیا کچھ کرنا ہے جو مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کا وعدہ قرآنِ کریم میں موجود ہے۔

سلیم! اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں۔ دنیا تیاگ دینا' زیب و زینت سے نفرت کرنا' ہنسی خوشی سے بیزار ہو کر "عبوسا قمطریرا" بن جانا' اسلام نہیں سکھاتا۔ عمدہ عمدہ کپڑے پہننے سے' اچھے اچھے کھانے پکانے سے' دوستوں کو تحائف دینے سے' بچوں کے لئے خوشی اور مسرت کے سامان بہم پہنچانے سے' اس نے نہیں روکا۔ لیکن اسلام جس طرح دنیا کی ہر مصیبت کے وقت قانونِ خداوندی کی ہدایت کو سامنے لے آتا ہے' اسی طرح وہ ہر آسائش اور مسرت کی تقریب پر بھی محتاج و مفلس بندوں کو نہیں بھلاتا۔ لیکن یاد رکھو سلیم! محتاجوں اور مفلسوں کا وجود محض اس عبوری دَور تک ہوتا ہے جب ہنوز قرآن کا نظامِ ربوبیت قائم نہیں ہوتا۔ اس نظام کے قیام کے بعد کوئی مفلس اور محتاج باقی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا مفلسوں اور محتاجوں کے متعلق اس قسم کے احکام صرف عبوری دَور سے متعلق ہیں۔

سلیم! تمہیں کیا معلوم کہ قوم کی حالت کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے مت لگاؤ کہ تمہارے سامنے نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ قوم کی حالت کا اندازہ لگانا ہو تو وہاں جاؤ جہاں سے یہ نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمان باہر آئے ہیں۔ اور دیکھو کہ کتنے گھر ہیں جن میں مٹکے اور کٹھلیاں اوندھی پڑی ہیں کہ کئی دنوں سے اُن میں آٹا نہیں پڑا۔ دیکھو کہ کتنے چولہے ہیں جن میں مکڑی نے جالا تن رکھا ہے کہ کئی وقت سے ان میں آگ نہیں جلی۔ دیکھو کہ کتنی شریف عورتیں ضرورت کے لئے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں کہ ان کے سر پر چادر نہیں ہے۔ دیکھو کہ کتنے بچے اور بوڑھے رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے رہتے ہیں کہ اس سردی میں ان کے پاس اوڑھنے کو لحاف نہیں۔ دیکھو کہ کتنے جوان مریض موت کے مُنہ میں کھنچے چلے جا رہے ہیں کہ ان کی دوائی کے لئے گھر میں پیسہ نہیں بردی۔ بھوک' محتاجی اور بربادی کے ان ہولناک مناظر کو دیکھو اور پھر اندازہ لگاؤ کہ قوم کی کیا حالت ہے؟ اور اگر تمہارے سینے میں دل اور دل میں احساس کی کوئی رمق باقی ہے تو سوچو کہ آج یہ تمہارا جشن' مسرت کا جشن ہے یا بربادی کا ماتم!

سلیم! میں جانتا ہوں کہ خوشی کے موقع پر مصیبتوں اور تکلیفوں کی یاد بدشگونی خیال کی جاتی ہے۔ لیکن آج

جس دَور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں خوشی کو خوشی سمجھنا خود اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ قوم کی حالت یہ ہے لیکن سلیم! جانتے ہو کہ قوم کے راہ نما اور شریعتِ مقدسہ کے علمبرداروں کون سے اہم مسائل دریافت کرنے میں مصروفِ جہاد ہیں؟ اگر تم یہ جاننا چاہو تو دہلی سے شائع ہونے اخبار "محمدی" اور امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار "اہلحدیث" کے اکتوبر، نومبر کے پرچے اٹھا کر دیکھو۔ اُن میں اس مسئلہ جلیلہ پر گرما گرم بحث چل رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے ختنے کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اور یہ دونوں اخبار اس جماعت کے ترجمان ہیں جس کے اسلاف میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید علیہما الرحمہ کے درخشندہ اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور ان کی فوجیں شہر کی چار دیواری تک آپہنچیں تو شہر کے اندر پادریوں کی سب سے بڑی مجلس چالیس دن سے اس مسئلہ پر مصروفِ بحث تھی کہ حضرت عیسٰیؑ پر جو مائدہ نازل ہوا تھا اس میں روٹی خمیری تھی یا فطیری۔ مسلمان ان واقعات کو پڑھتے ہیں اور تحقیر کی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ لیکن نہیں سوچتے کہ خود اُن کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

(٥)

سلیم! اب تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا کہ جب ہمارے ان اجتماعات میں آج وہ روح اور مقصد نہیں رہا تو پھر ان کے باقی رکھنے سے کیا فائدہ؟ تمہارے دل میں اس سوال کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اچھا ہوا کہ تم نے اسے بھی پوچھ لیا۔ عزیزم! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ چیزیں (اپنی روح اور مقصد کو کھو دینے کے بعد) ہمارے قومی شعائر سی بن چکی ہیں۔ اگر قومی شعائر نقصان رساں نہ ہوں (اور نہ ہی وہ قرآن کی تعلیم سے ٹکرائیں) تو ان کا باقی رکھنا اچھا ہوتا ہے۔ ان سے بھی ایک حد تک اجتماعیت کی شکل قائم رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کبھی ہماری قسمت نے پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس بیدار ہوا جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے، تو ان ہی بے جان پیکروں میں پھر سے روح آجائے گی اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں، اس کے از سرِ نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں جمعۃ الوداع کے خطبہ میں باتیں کرنے سے منع کیا تھا۔ اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر پہنچتا بھی تو تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہ تھا کہ وہ عربی زبان میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں تمہیں کوئی بات مسائلِ حاضرہ کے متعلق نہ مل سکتی کہ ان کے نزدیک خطبہ ایک شرعی حکم ہے جس کی ادائیگی سے محض "ثواب" ہوتا ہے۔ مفہوم اور معانی سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ کہ اتنے بڑے مجمع میں لاؤڈ سپیکر کیوں نہیں لگایا گیا تھا۔ سو اس کا جواب مجھ سے نہیں، ان مولوی صاحبان سے لو جو اپنی ذاتی آواز

کو دُور تک پہنچانے کے لئے ٹیلیفون کا استعمال تو بالکل جائز سمجھتے ہیں، لیکن بحیثیت خطیب و امام اپنی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لئے آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کا استعمال حرام قرار دیتے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہمارے ان "مفتیان کرام" کے پاس ذرائع کیا ہیں۔ مکبر الصوت LOUD SPEAKER کی حلت و حرمت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ معلوم کیا جاتا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور جو آواز سامعین تک پہنچتی ہے، وہ واقعی متکلم کی آواز ہوتی ہے یا کوئی اور آواز۔ اب سنو کہ یہ تحقیق کن ذرائع سے ہوئی ہے۔ ہمارے دینی مرکز یعنی دار العلوم دیوبند کے ایک مفتی صاحب نے ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن میں "عباداتِ مقصودہ" کے لئے اس آلہ کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البدائع المفیدہ فی حکم الصناع الجدیدہ) کے صفحہ ۲ پر درج ہے کہ الگزنڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "برقی قوت کی وجہ سے ہیں تو کم از کم یہ ماننے میں تامّل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔" یہ ہیں وہ ذرائع تحقیق مفتیان کرام کے جن کی بناء پر علت و حرمت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں[1] اور یہ حضرات ان اسلاف کے جانشین ہونے کے مدعی ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا: وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ (۴۵/۱۳) (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے)۔ اب سلیم! تم خود سمجھ جاؤ گے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور ہم کہاں ہیں؟

والسلام

دسمبر ۱۹۳۹ء

---

[1] اس کی حرمت کے باوجود تمام علماء کرام اور مفتیانِ عظام مع ان مفتی صاحب کے جنہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا اور جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، سب لاؤڈ سپیکر استعمال کرتے ہیں اور اگر حکومت کبھی اس پر پابندی عائد کر دیتی ہے تو اس کے خلاف "جہاد" پر اُتر آتے ہیں۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

تیسرا خط

ذات پات کی تمیز

سلیم! تم نے اس موضوع کو چھیڑ کر ؏

اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!!

تمہارے سامنے تو ایک چوہدری فتح خاں کی لڑکی ہی کی داستانِ الم انگیز ہے اور میرے سامنے بیسیوں ایسے شریف گھرانے ہیں جن کی لڑکیاں پچیس پچیس، تیس تیس برس کی ہونے کو آئی ہیں اور ان کی شادی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس لئے کہ اپنی "ذات برادری" کا لڑکا نہیں ملتا۔ فتح خاں کی بات تو تم نے خود سُن لی تھی کہ لڑکا راجپوت ذات کا تو ٹھیک ہے لیکن اس کی گوت ہماری گوت سے نہیں ملتی۔ کبھی تم نے سوچا بھی کہ یہ کیا قیامت ہے سلیم! اگر تم غور سے سمجھنے کی کوشش کرو تو قرآنِ کریم کی تعلیم کا ماحصل ان دو لفظوں میں سمجھ میں آجائے گا۔ "وحدتِ خالق اور وحدتِ مخلوق"۔ ایک ضابطۂ قوانینِ خداوندی اور انسانوں کی ایک عالمگیر برادری۔ توحیدِ باری تعالیٰ اور مساواتِ انسانی۔ تمہیں معلوم ہے کہ دنیا کی طاغوتی قوتوں نے اسلام کی جو اس قدر مخالفت کی تھی وہ کس بنا پر تھی؟ اسی انسانی مساوات کے عقیدہ کی بنا پر۔ یہودی نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کو تیار تھے لیکن انہیں شکایت تھی تو یہی کہ آخری زمانے کا نبی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونا چاہیئے، نہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے۔ کفارِ عرب سب سے بڑی وجۂ مخاصمت یہی قرار دیتے تھے کہ اس نبیؐ کی تعلیم سے ہمارے خاندانی امتیازات خاک میں مل جاتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اسے دیکھو! دہقانوں کو بلا بلا کر اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہے ــــ غلام زادوں اور اونچے اونچے گھرانوں کے نجیب الطرفین شرفاء کو ایک ہی دسترخوان پر جمع کر لیتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نیا دین کس قسم کا ہے جو انسان اور انسان میں حسب و نسب کی رُو سے کچھ تمیز ہی روا نہیں

رکھتا۔ ابوجہل غلافِ کعبہ کو پکڑ پکڑ کر واویلا کرتا تھا تو وہ بھی یہی تھا کہ اس لڑکے (صلعم) نے تو ہمارے گھرانے کی ناک کاٹ دی ہے۔ ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ ہماری آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ ہماری آبائی شرافت کو ڈبو دیا ہے۔ وہ فریاد کرتا تھا کہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دودمانے ریختند

اور سچ تو یہ ہے کہ ان (قریش) کے نقطۂ نظر سے بات تھی بھی ٹھیک۔ وہ صدیوں سے شرف و مجد کے انہی امتیازات کو نسلاً بعد نسلٍ باپ دادا سے بطور وراثت لئے چلے آرہے تھے۔ یہ بات آسانی سے ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی کہ خان شہباز خان کا نورِ نظر اور رحمٰن نورباف کا لڑکا دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔

سلیم! ذرا تصور میں لاؤ اس انقلاب کو کہ تمام عرب کے ممتاز ترین قبیلہ (قریش) کے معزز ترین گھرانے (بنو ہاشم) کی واجب الاحترام خاتون ـــــ خود نبی اکرمؐ کی پھوپھی زاد بہن ـــــ کون ہوگا جو خاندانی شرافت و امتیاز کے اعتبار سے اس سے بلند کہلا سکے گا؟ اس خاتونِ محترمہ کی شادی اپنے گھر کے غلام سے کردی۔ اگر ابوجہل غلافِ کعبہ کو تھام کر لات و منات و ہبل و عزّیٰ کو نہ پکارتا تو اور کیا کرتا؟ ایک کام کرو' پھر یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ رحمت تمہارا ملازم ہے نا؟ کس قدر شریف لڑکا ہے۔ اور ملازم بھی ایسا کہ باہر کی دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ وہ تایا اباّ کی فرم میں حصہ دار ہے۔ ذرا کسی دن آپا سے کہنا کہ کلثوم کی شادی رحمت سے کیوں نہ کردی جائے۔ پھر دیکھنا کہ کیا گھر میں ابوجہل کے نوحہ سے کم کہرام مچتا ہے؟ اور ابھی غلام اور ملازم میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس سے آگے بڑھو تو ذرا اس منظر کو سامنے لاؤ کہ اسلامی لشکر مدینہ سے باہر کوچ کے لئے تیار کھڑا ہے۔ اولوالعزم صحابہؓ' بڑے بڑے سردارانِ قریش' ذی وقار و سن رسیدہ انصار جیشِ اسلامی میں موجود ہیں۔ سب کچھ طے ہوچکا ہے۔ شوقِ شہادت میں مجاہدین کی ولولہ انگیزی یہ عالم کہ

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

لیکن ابھی رسالت مآبؐ کی طرف سے علمِ قیادت کسی کو عطا نہیں ہوا۔ "ہر امیدوار" کی نگہ طلب فیصلہ کے انتظار میں مضطرب و بے قرار ہے کہ اتنے میں وہ شہنشاہِ بوریا نشینؐ' مساواتِ انسانی کے علَم کو بلند کئے جلوہ فرمائے عساکر ہوتے ہیں۔ ہر چشمِ منتظر کی آرزو میں سمٹ کر تِل میں آجاتی ہیں کہ حضورؐ مجاہدین کی صفوں کا معائنہ

فرماتے ہوئے ایک غلام ابنِ غلام (حضرت اسامہ بن زیدؓ) کے پاس کھڑے ہوجاتے ہیں اور علمِ قیادت ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ لشکرِ اسلامی میں کتنے کتنے بڑے سردارانِ قریش بطور سپاہی کام کر رہے ہیں اور ایک غلام کا بیٹا ان پر سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا ہے۔ تم نے جنگ بدر کا واقعہ تو پڑھا ہو گا۔ جب اسلامی لشکر سے بعض انصار میدان میں بڑھے تو صفِ مقابل سے قریشِ مکہ یہ کہہ کر میدان میں آنے سے رُک گئے تھے کہ ہم اپنے برابر کے قریش (مہاجرین) سے لڑیں گے۔ انصار ہماری برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یعنی خاندانی اور قبائلی تفوق کا یہ احساس کہ دوستی تو ایک طرف، اپنے سے فروتر قبیلہ والوں کی دشمنی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ کہاں عہدِ جاہلیت کا یہ تجبّر و نخوت اور کہاں پھر یہ عالم کہ ایک حبشی غلام (حضرت بلالؓ) نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو ان ہی قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے اپنی لڑکیوں کے رشتے فخریہ پیش کر دیئے۔ سلیم! یہ تھی اسلام کی عدیم النظیر تعلیم اور یہ تھا اس تعلیم پر فقید المثال عمل۔ چنانچہ یہی تعلیم اور اس تعلیم پر عمل تھا جس کے متعلق نبیٔ اکرمؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے انقلاب آفریں خطبہ میں فرمایا تھا کہ

> "آج عہدِ جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں تلے ہیں۔ لوگو! تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر، سیاہ کو سرخ پر، کوئی فضیلت نہیں، مگر تقوےٰ کے سبب۔"

سلیم! تم نے عہدِ جاہلیت کی تفریق و تقسیمِ انسانیت بھی دیکھ لی اور اس کے بعد اسلام کی اخوت و مساوات کے مناظر بھی دیکھے۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ تمہاری ذاتیں اور گوتیں، برادریاں اور قومیں کس عہد کی یادگار ہیں؟ ہندوستان میں تو مصیبت یہ ہوئی کہ ہمیں حقیقی اسلام کی جھلک تک بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ یوں کہنے کو تو یہاں مسلمانوں میں بھی اکثریت نومسلموں کی ہے جن کے اسلاف میں سے کوئی شخص کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ لیکن رسومات و عقائد وہی پرانے ساتھ رہے۔ تم نے فتح خاں کے باپ کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ مسلمان ہوئے تین پشتیں گزر گئیں۔ خود بھی کافی عمر کا ہو چکا ہے۔ لیکن جب کبھی چھینک آتی، زور سے کہتا۔ "جے نندی کی" کئی مرتبہ اس سے کہا کہ بابا "الحمد للہ" کہا کرو۔ وہ یہ سُن کر مُسکراتا اور کہتا کہ بیٹا! جے نندی نکلتے نکلے گی، "الحمد" آتے آتے آئے گی۔ یہی "جے نندی" ہے جو آج مسلمانوں کے عقائد و اعمال و رسومات و نظریاتِ حیات، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کے رگ و پے میں سرایت شدہ وراثتاً چلی آ رہی ہے اور ہم محسوس تک نہیں کرتے کہ ہم کس طرح مسلمان کہلاتے ہوئے عملی شرک میں گرفتار ہیں! میں نے اسی فتح خان سے ایک دن

ڈرتے ڈرتے کہا کہ "چودھری! ذرا سوچو تو سہی، تم نے لڑکی پر کیا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ تم اپنی ناک کی فکر میں ہو جسے بچانے کے لئے غیر گوت کے لڑکے سے ناطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جوان بیٹی کا تمہیں کوئی خیال نہیں کہ وہ بچاری کس طرح غمِ پنہاں کے تپِ دق سے اندر ہی اندر گھلے جا رہی ہے۔" تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کیا جواب دیا؟ کہنے لگا کہ "اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ میں لڑکی کے روٹی کپڑے سے نہیں مرتا۔ یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ میرے بعد اس کے بھائی اس سے اچھا سلوک نہ کریں۔ سو اس کے لئے میں بندوبست کر جاؤں گا۔ چار بیگھے زمین اس کے نام کر دوں گا۔ اسے اور کیا چاہیئے؟" سلیم! میں اُسے کیا سمجھاتا۔ داعیاتِ فطرت کو بھی چھوڑ دو کہ یہ تذکرہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں تو یہ بات بھی نہ آتی تھی کہ عورت کے لئے "اپنے گھر" کی سوکھی روٹی ماں باپ کے گھر کے خوانِ نعمت سے زیادہ خوش آئند ہوتی ہے کیونکہ "اپنے گھر" میں وہ اپنے آپ کو گھر کی مالکہ سمجھتی ہے اور ماں باپ کے گھر میں اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم کی محتاج آستاں افتادہ اور ذلیل شمار کرتی ہے۔ وہ ہر وقت محسوس کرتی ہے کہ میں اُن پر بوجھ ہوں۔ وہ کسی چیز پر اپنا حق تصور نہیں کرتی۔ قدم قدم پر اس کے لئے شکستِ پندار کا سامنا ہوتا ہے۔ سانس سانس پر اس کی خودی اور خودداری کا آئینہ چور ہوتا ہے۔ اس کا سینہ مردہ آرزوؤں کا مدفن، اس کا قلب خوں گشتہ تمناؤں کا مزار اور وہ خود ایک چلتا پھرتا جنازہ ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں انسان کی پرچھائیاں ہوتی ہے کہ جس کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

یہ عفت و عصمت کے نازک آبگینے! ان مظلوموں میں سے اکثر کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے احساسات کی آتشِ خاموش میں اس طرح اندر ہی اندر جل کر مر جاتی ہیں کہ مغزِ استخواں تک راکھ کا ڈھیر ہو جائے لیکن لب تک دھواں نہ آئے۔ لیکن ان میں سے جب کسی کے قدم پھسلتے ہیں تو پھر وہ اکیلی ہی بے آبروئی کے جہنم میں نہیں گرتی، خاندان بھر کی عزت و ناموس کو ساتھ لے کر تباہ ہوتی ہے اور یوں اونچے گھرانے کے چودھریوں کی ناک بیچ چوراہے کے کٹتی ہے۔

سلیم! اگر تم ناکتخدا جوان لڑکیوں کے اسبابِ موت کی تشخیص یا ایسی شریف زادیوں کے حادثاتِ لغزش تحقیق کرو گے تو ان کی تہہ میں بیشتر ان ہی "نجیب الطرفین" ذاتوں اور گوتوں کے اجارہ داروں کی "بولہبی ناک" کارفرما نظر آئے گی۔

پھر، یہ عزت و ذلت کی تفریق، ذاتوں پر ہی نہیں، پیشوں تک بھی آچکی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر ذاتیں مبنی ہی پیشوں پر ہیں۔ کسب و ہنر، اپنے ہاتھ سے کام کرنا کبھی ممتاز ترین جوہر انسانیت تھا۔ نبیٔ اکرم صلعم نے اس بدو کے ہاتھوں کو فرطِ مسرت سے چوم لیا تھا جس پر پھاوڑے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ لیکن آج مسلمانوں میں "دست کار" (ہاتھ سے کام کرنے والا) طبقہ سب سے ذلیل شمار ہوتا ہے۔ درزی، دھوبی، لوہار، نجار، سقہ، جولاہا "کمین" گنے جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ویدوں کی رُو سے یہ پیشہ ور برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں اور منوسمرتی کے مطابق انہیں شودر سمجھا جاتا ہے۔ کیا اس کے سوا مسلمان کے پاس ان دستکاروں کو ذلیل خیال کرنے کی کوئی اور دلیل بھی ہے؟ سلیم! سوچو کہ انسانیت کی یہ تقسیم کہاں سے شروع ہوئی اور اس کا استعمال کہاں ہو رہا ہے؟ اور اس پر پوچھئے، تو داڑھی پر ہاتھ پھیر کر نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ "الحمد اللہ مسلمان ہوں"! میرے ایک دوست نے ایک واقعہ سُنایا...... پٹھانوں کی بستی ہے۔ وہاں ایک محلہ میں چھوٹی سی مسجد تھی۔ محلہ کے خاں صاحب اس کے منتظم تھے۔ ایک شاہ صاحب (سید) کو امام رکھ چھوڑا تھا (ذرا اس پر بھی غور کیا تم نے کہ جیسے گھر میں ملازم رکھا جاتا ہے، اسی طرح مسجد میں "امام" رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ دل خراش داستان کبھی پھر سہی)۔ ایک دن شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ خان صاحب ابھی پہنچے نہیں تھے۔ محلہ کے دو چار نمازی جمع تھے۔ ان میں سے ایک سبزی فروش حافظِ قرآن تھا۔ لوگوں نے اسے آگے کھڑا کر دیا۔ مقتدیوں میں خاں صاحب کا چھوٹا لڑکا بھی شامل تھا۔ اتنے میں خاں صاحب بھی آگئے۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ نمازی رکوع میں جا چکے تھے۔ لپک کر بڑھے، دیکھا محراب میں شاہ جی نہیں، امام بخش سبزی والا ہے۔ دیکھ کر آنکھیں غضب آلود ہوگئیں۔ سارا جسم غصہ سے کانپنے لگ گیا۔ آگے بڑھ کر امام صاحب کے ایک لات رسید کی اور پانچ سات گالیاں سُنا کر کہا کہ ابے او کنجڑے! تجھے یہ جرأت کیسے ہوگئی کہ پٹھانوں کے بیٹے پیچھے کھڑے ہوں اور تو آگے محراب میں چلا جائے؟ سلیم! مسجد میں یہ کچھ ہو رہا تھا اور آسمان کے فرشتے انگشت بدنداں محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ یہ وہی قوم ہے جس کی یہ حالت تھی کہ بلالؓ حبشی آتے تو حضرت عمرؓ تعظیم کے لئے رُک جاتے کہ سیدنا بلالؓ آرہے ہیں۔ وہ قوم کہ جس کے امیرالمومنین (حضرت عمرؓ) کی سب سے آخری آرزو یہ تھی کہ ان کے جنازہ کی نماز ایک مسز دور (صہیب رومیؓ) پڑھائیں۔ آج اس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ تم کہہ دو کہ یہ واقعہ افراط کا (EXTREME CASE) ہے۔ لیکن ذرا تم (اوروں کو چھوڑ کر خود) اپنے دل سے پوچھو کہ کیا اس میں ایک موچی اور ایک سید کے لئے ایک جیسی تعظیم کا جذبہ موجود ہے؟ حالانکہ سید السادات صلعم جناب سرورِ کائنات خود

اپنے ہاتھوں سے اپنا جوتا گانٹھ لیا کرتے تھے۔ سیدوں کی تو یہ حالت ہے کہ مسلمانوں نے انہیں بالکل برہمن، اور برہمن بھی سب سے اونچی گوت کے "گوڑ برہمن" بنا رکھا ہے۔ کسی سیدزادی کے ساتھ رشتۂ مناکحت کا تصوّر ایک غیر سید کے دل میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یوں سمجھنے لگ جاتا ہے گویا اس سے کوئی عظیم گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ کانپتا ہے، لرزتا ہے۔ گویا اس نے کسی کے دامنِ تقدس کو ننگ مصیبت آلود سے داغدار کر دیا ہو۔ سلیم! سوچو کہ یہ چیزیں ہم میں کہاں سے آگئیں اور آنے کے بعد یوں ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئیں گویا یہ سب کچھ عین اسلام ہے۔

(۰)

تم نے لکھا ہے کہ ہمارا "بڑا طبقہ" اب ذات برادریوں کی بندشوں کو توڑتا جا رہا ہے۔ یہ درست ہے لیکن تم نے اس مسئلہ کا بھی سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے، اسی لئے حقیقت تمہاری نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ اگر تم ذرا سطح سے نیچے اُتر کر دیکھتے تو صورتِ حالات ایسی اطمینان بخش نظر نہ آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ مسلمان کا کوئی اجتماعی نظام موجود نہیں اس لئے اس کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ

رُست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دگر

ہمارا یہ "بڑا طبقہ" ذات برادری کی زنجیروں سے نکلا تو طبقاتی تقسیم کے طوق و سلاسل میں اُلجھ کر رہ گیا۔ انہوں نے ذات اور گوت کی پابندیوں کو اس لئے نہیں توڑا کہ یہ قیود خلافِ اسلام تھیں۔ بلکہ ان پابندیوں سے اس لئے آزادی حاصل کی کہ اپنی پوزیشن STATUS کے مطابق تعلقات وابستہ کرنے میں آسانی رہے۔

حسب و نسب کا معیار چھوٹا تو دولت و وجاہت کا معیار آگیا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کا قرآنی معیار پھر بھی قائم نہ ہوا۔ لہٰذا یہ تبدیلی کون سی مسرت بخش ہوئی؟ بلکہ اس سے تو ایک اور نقصان ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ منشی نبی احمد کا لڑکا اپنے چچا کے ہاں منسوب تھا اور اس کے تعلیمی اخراجات کی کفالت بھی دراصل اسی چچا نے کی تھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ ان غریبوں کی قسمت بر آئی۔ لڑکا آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں پاس ہو کر ڈپٹی کمشنر ہو گیا۔ اس کی منسوبہ اور اس کے چچا کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ لڑکے نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ لڑکی پڑھی لکھی نہیں یا کسی اور وجہ سے اسے پسند نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ (وہ کہتا ہے کہ) مجھے بڑے بڑے ڈپٹیوں اور ججوں کی طرف سے پیغام آرہے ہیں۔ میں بڑے (STATUS والوں کو چھوڑ کر (اپنے) چھوٹے سے خاندان میں شادی کیوں کروں؟

(۰)

اور پھر یہ ذات اور گوت کا مسئلہ صرف بیاہ شادیوں تک ہی محدود نہیں۔ اس کا دائرہ اثر و نفوذ حدود فراموش واقع ہوا ہے۔ یہ "آل پنجاب مسلم راجپوت کانفرنس" یہ "جمعیت القریش" یہ "الراعی لیگ" یہ "انجمنِ سادات" یہ "موتمر افغانان" یہ "اعوان کانفرنس" یہ سب کیا ہیں؛ اسی امتیازِ رنگ و بو کی عجمی تفسیریں۔ "منوجی" کے خواب کی "مومنانہ تعبیریں!

مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے لئے یہی تفریق و تقسیم کچھ کم نہ تھیں کہ پنجاب میں کاشتکار و غیر کاشت کار کی تقسیم جدید شروع ہو گئی۔ ؎

پہلے ہی سے نہ تھی مری کچھ قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

راجپوت، سادات، اعوان، قریش کی تقسیم تو خیر پھر بھی مسلمانوں کے اندر ہی احاطے اور دائرے قائم کرتی ہیں۔ اس جدید تقسیم کی رُو سے مسلمان کاشت کار اور غیر مسلم کاشتکار ایک طرف ہو گئے اور غیر کاشتکار ایک طرف۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے گاؤں میں نواب کی پٹی میں مسلمان جاٹ اور ہندو جاٹ رہتے ہیں اور باغ کی طرف شیخوں کا محلہ ہے۔ پچھلے دنوں گاؤں میں گیا تو دیکھا کہ کسی معاملہ میں ان شیخوں اور ہندو جاٹوں کا تنازعہ ہو گیا۔ میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ مسلمان جاٹوں نے ہندو جاٹوں کا ساتھ دیا حالانکہ وہ سراسر غلطی پر تھے۔ میں نے پوچھا تو چودھری کرم بخش نے بلا تامل جواب دیا کہ واہ صاحب! ہم جاٹوں کا ساتھ نہ دیتے تو اور کس کا دیتے۔ ہم اور وہ ایک قوم کے، ایک برادری کے، وہ بھی زمیندار، ہم بھی زمیندار۔ یہ شیخ نہ ہماری ذات نہ برادری۔ یہ تو دکان دار ہیں، زراعت پیشہ نہیں ہیں۔ سلیم! میں نے سُنا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، کہ لو! تم تو صرف ذاتوں کی تقسیم پر ہی خون کے آنسو بہا رہے تھے، اب انسانیت کی اس جدید تقسیم کا بھی ماتم کرو۔

(۶)

سلیم! تم نے بات چھیڑ دی تو آؤ تمہیں اپنے قلبِ درد آگیں کے نازک ترین گوشہ میں چھپا کر رکھا ہوا ایک اور واقعہ بھی سنا دوں۔ وہ واقعہ کہ جس کی یاد کو میں نے اس لئے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمانوں کے جرائم کی فہرست مرتب ہونے لگے تو اسے اس فردِ جرم کی پیشانی پر جگہ دوں۔ ہمت ہے تو ذرا ضبط سے سُنو۔

ایک صاحب صوبہ بنگال کے ہندو، سرکاری دفتر میں باعزت آسامی پر ملازم، خوشحال، صاحبِ وقار

لیکن ہندوؤں کی تقسیم انسانیت کے مطابق "نیچ ذات" (LOW CASTE) سے متعلق، میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اسلامی مساوات و اخوت کا شیدائی ہوں اور اپنے ذاتی مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی اور میرے بیوی بچے سب۔ میں نے کہا بسم اللہ۔ اس میں توقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے صوبہ میں جو نیچ ذات کا ہندو مسلمان ہو جاتا ہے وہ مسلمان ہونے پر بھی نیچ ذات ہی کا شمار ہوتا ہے۔ بڑی ذات کے مسلمان نہ اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرتے ہیں، نہ اخوت و مساوات کا برتاؤ روا رکھتے ہیں۔ میری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بڑی لڑکی شادی کے قابل ہے۔ اب تو یہ ہے کہ نیچ ذات ہی سہی، اپنا خاندان، اپنی برادری تو ہے۔ جب مسلمان ہو جاؤں گا تو ان سے قطع علائق ہو جاؤں گا۔ اگر اس وقت مسلمانوں نے بھی میرے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا تو ڈرتا ہوں کہ اس لڑکی کے لئے موزوں بر کہیں سے نہ مل سکے گا۔ سلیم! یقین مانو۔ میں یہ باتیں سن رہا تھا اور یوں سمجھ رہا تھا گویا کسی خواب کی دنیا میں ہوں۔ اس لئے کہ یہ بات میرے حیطۂ گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ مسلمان ایک نومسلم کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ میں نے اسے حوصلہ دلایا اور (سادگی ملاحظہ ہو) ذمہ لے لیا کہ اس کی بابت میں انتظام کرتا ہوں۔ اور تم حیران ہو گے کہ کامل ایک برس کی تگ و دو کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی کہ جو کچھ وہ صاحب کہتے تھے حرف بہ حرف صحیح تھا۔ اونچا طبقہ تو ایک طرف، متوسط درجے کے مسلمان بھی نہ اس سے معاشرتی تعلقات میں مساوات برتنے پر تیار تھے، نہ کوئی اس کے ساتھ قرابت داری کے تعلقات وابستہ کرنے پر آمادہ۔ سلیم! برس دن کی جدوجہد اور ناکام تگ و دو کے بعد اب ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

میں پوچھتا ہوں کہ اور جرائم کو چھوڑو۔ کیا مسلمانانِ ہند کی "فردِ جرم" میں یہی ایک جرم اتنا بڑا نہیں کہ اس کی پاداش میں اللہ کا ذلت آمیز عتاب اُن پر مسلط ہو جائے اور نکبت و ادبار کی گھٹائیں اُن پر منڈلانے لگیں۔ اور سچ پوچھو تو جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کا عذاب نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھ کر اس عذاب کو عذاب ہی نہ سمجھیں۔

———— (٠) ————

سلیم! سلسلۂ سخن دراز ہو گیا۔ جب بات ہی ایسی چھیڑ دو تو میں کیا کروں۔ مجھے تم جانتے ہو کہ ؎

جرس ہوں میں فغاں خوابیدہ ہے میرے رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

جب تم میرے بربطِ ہستی کے کسی ایک تار کو چھیڑ دیتے ہو تو اس میں خفتہ نغمات ایک ایک کر کے سکوت آگیں فضا میں تموّج پیدا کر دیتے ہیں. تم نے فتح خاں کی چھوٹی لڑکی کی داستانِ الم انگیز چھیڑی کیونکہ تمہارے نزدیک اس کی مصیبت سب سے بڑی اندوہناک ہے اور اس میں شبہ بھی کیا ہے ؟ لیکن اس کی بڑی لڑکی کی مصیبت تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی جو اپنی اجڑی ہوئی کائنات کو ساتھ لئے دس سال سے باپ کے گھر میں قبرستان کے محافظ کی طرح بیٹھی ہے. تم چونکہ کبھی کبھار گاؤں جاتے ہو' اس لئے یہ چیزیں تمہاری نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں. فتح خاں کی یہ بڑی لڑکی اپنے تایا رحمت خاں کے ہاں بیاہی ہوئی ہے اور رحمت خاں کی لڑکی فتح خاں کے بیٹے سے. دونوں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں ہنسی خوشی بستی رستی تھیں. دو دو' تین تین بچے' زندگی کی کشتی حسین بط کی طرح سکوت آفریں ندی میں تیرتی چلی جا رہی تھی کہ ایک دفعہ دونوں بھائیوں میں کسی معاملہ پر تکرار ہو گئی. رحمت خاں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگر میرا بیٹا ہے تو اسی وقت اپنی بیوی کو میکے بھیج دے. اس نے' ایک تو کہیں سے یہ سُن رکھا تھا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے' اس پر شاید جائیداد سے عاق ہونے کا ڈر بھی تھا' اپنے ہاتھوں اپنی جیتی جاگتی دنیا گھر سے رخصت کر دی. بیٹی گھر میں آ گئی تو فتح خاں نے بھی اپنے بیٹے سے وہی کہا. نتیجہ یہ کہ دوسرے ہی دن رحمت خاں کی بیٹی معہ بچوں کے اس کے گھر میں بیٹھی تھی. اس واقعہ کو دس برس ہونے کو آئے ہیں' دونوں لڑکیاں اجڑی بیٹھی ہیں اور کسی کو خیال تک بھی نہیں آتا کہ یہ کیا قیامت ہے. نہ انہیں گھروں میں بساتے ہیں نہ ہی طلاق دیتے ہیں. اب کہو کہ میں تمہیں کس کس کی دُکھ بھری کہانی سناؤں ؟ مشکل یہ ہے کہ میں نے یہاں طلاق کا لفظ لکھ دیا ہے. اب تمہارا اس کے متعلق استفسار آ جائے گا کہ طلاق کیا ہے ؟ کن حالات میں دی جاتی ہے ؟ کیسے دی جاتی ہے ؟ اس کی حدود و شرائط کیا ہیں ؟ بہرحال تم پوچھو گے تو یہ بھی بتانا ہو گا.

والسّلام

(جولائی ۱۹۴۰ء)

چوتھا خط

طلاق کا قرآنی مفہوم

سلیم! یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم نے نظری مباحث سے ہٹ کر اب عملی مسائل کے متعلق پوچھنا شروع کیا ہے، لیکن اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ تم نے غزل کو مقطع سے شروع کر دیا۔ تمہیں پہلے نکاح کے متعلق پوچھنا چاہیئے تھا۔ پھر ازدواجی زندگی کے فرائض وحقوق کی بابت اور سب سے آخر طلاق کے متعلق۔ لیکن خیر! تم یوں بہتر سمجھتے ہو تو یوں ہی سہی۔ تم نے جن لغو روایات اور شرمناک رسومات کا ذکر کیا ہے وہ صرف رسوم ورواج ہی نہیں، بلکہ یہ سُن کر تمہیں تعجب ہوگا کہ انہیں شریعت کے احکام کہہ کر منوایا جاتا ہے۔ دیر کی بات ہے۔ میں چھٹیوں میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ چندا تیلی نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے "تین طلاق" کہہ دیا۔ تم اس کی بیوی کو جانتے ہو۔ بڑی نیک بخت، دودھ پوت، آل اولاد والی، سر کے بال تک سفید ہو رہے تھے۔ چندا خود بھی بڑا بھلا مانس آدمی تھا۔ بات گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ غصہ اُترا تو چندا سخت محجوب و پشیمان تھا۔ اس کے جوان لڑکے لڑکیاں، بہوئیں سب گھر میں تھیں۔ مولوی چراغ دین (گھیر والا) کے ہاں فتوے کے لئے لے گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ طلاق بائن ہو گئی۔ اب حلالہ ضروری ہے۔ پوچھا کہ میاں جی حلالہ کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ چندا کی بیوی کو کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرنا ہوگا، اس شرط کے ساتھ کہ ایک شب کی ہمبستری کے بعد وہ اسے طلاق دے دے گا۔ اس کے بعد چندا پھر اپنی بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ چندا کے گھر میں اس سے کہرام مچ گیا۔ اس کے بیٹوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ اپنی ماں کی اس بے عزّتی کے تصور سے اس درجہ مشتعل ہوئے کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ چندا کو مار ڈالیں گے۔ چندا بیچارہ الگ شرم سے مُنہ چھپائے پھر رہا تھا۔ سب سے بُرا حال اس کی بیوی کا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ غصہ میں آکر قصور

تو چند اٹے کیا اور اس بڑھاپے میں مٹی میری خراب کی جا رہی ہے۔ یہ خدا کا حکم کیسا ہے؟ سلیم! یہ بات واقعی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ خدا کا یہ حکم کیسا ہے؟ لیکن چونکہ مولوی چراغ دین نے کہہ دیا تھا کہ یہی خدا اور رسولؐ کا حکم ہے اس لئے کس کی مجال تھی کہ اس سے انکار کرتا اور مولوی چراغ دین بھی سچا تھا۔ اسے بڑھاپا ہی یہی گیا تھا۔ وہ بچارا کیا کرتا۔

سلیم! قرآن کے اعجاز پر غور کرو۔ جہاں اس میں سب سے پہلے، طلاق کے احکام بیان ہوئے ہیں وہاں یہ ٹکڑا بھی موجود ہے کہ

وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱)

دیکھنا، احکامِ خداوندی کا مذاق نہ اڑانا۔

سوچو کہ ہمارے ہاں کس طرح احکامِ خداوندی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے؟ قرآن میں، سلیم! جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بہت تھوڑے احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی دے دی گئی ہیں۔ باقی سب احکام بطور اصول مذکور ہیں۔ جن احکام کی جزئیات بھی قرآن ہی نے متعین کر دی ہیں، وہ بیشتر عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس سے تم اندازہ لگاؤ کہ عائلی زندگی انسانی نظامِ حیات میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عائلی زندگی، چھوٹے پیمانے پر مملکتی نظام کا عکس ہے۔ گھر کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی ریاست جس میں بزرگِ خاندان بمنزلہ حاکمِ اعلیٰ کے ہے۔ اس میں مجلسِ مشاورت بھی ہے اور مجلسِ عمل بھی۔ ذمہ داریاں بھی ہیں اور حقوق بھی۔ تادیب و ترتیب بھی ہے اور نظم و ضبط بھی۔ یہ ریاست میاں بیوی کی باہمی رفاقت سے چلتی ہے جس کے لئے ان کا ہم آہنگ اور متحد الخیال ہونا لاینفک ہے۔ اگر ان میں وحدتِ خیال اور اشتراکِ عمل نہیں تو اس ریاست میں فساد برپا ہو جائے گا اور اس کے مضر عواقب ملت کی اجتماعی زندگی تک اثر انداز ہوں گے۔ لہٰذا، نکاح نام ہے ان مشترکہ ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے لئے باہمی معاہدہ کا، جس کی بنیاد تراضی مابین پر ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ میاں بیوی میں بعض وجوہات کے باعث ہم آہنگیِ خیال و عمل نہ رہے اور اس عدم اشتراک و توافق کی وجہ سے عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو رہا ہو، تو قرآن نے اس معاہدہ کے فسخ کر دینے کی بھی اجازت دی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے جس معاہدہ کی توثیق پر اتنا زور دیا ہے اور اس کے ایفاء کی ابتداء قدر اہمیت بتائی ہے وہ اس کی تنسیخ کو بچوں کا کھیل نہیں بنائے گا۔ اس لئے اس نے ایسی شرائط و حدود متعین کی ہیں کہ جب تک انہیں پورا نہ کیا جائے یہ معاہدہ فسخ

نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے ان شرائط و قیود کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ان تفاصیل پر غور کرنے سے سلیم! یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے سفرِ زندگی کی رفاقت کا یہ معاہدہ ٹوٹنے نہ پائے۔ وہ انسانی طبائع کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ انسان بعض اوقات شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا فیصلہ کر بیٹھتا ہے جس پر بعد میں خود ہی متاسف و پشیمان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا وہ غلط فیصلہ ناطق نہ قرار پا جائے۔ قرآن نے اس کی گنجائش رکھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن اس توثیق و تنسیخِ معاہدہ کو بازیچۂ اطفال بھی بنانا نہیں چاہتا کہ انسان عمر بھر یہی کھیل کھیلتا رہے۔ ان مبادیات کو سامنے رکھو اور پھر سلیم! قرآن کی حدود و شرائط پر غور کرو۔ بات واضح ہوجائے گی کہ قرآن کی رُو سے طلاق کس طرح عمل میں آتی ہے۔

لیکن قرآنی احکام تک پہنچنے سے پہلے اس تمہید کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ وہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جس پر اجتماعی نظام کی شکل میں عمل کیا جاتا ہے۔ نکاح کے معاملہ میں اس نے شرط یہ عائد کی ہے کہ فریقین بالغ اور عاقل ہوں اور وہ برضا و رغبت ازدواجی تعلقات وابستہ کرنا چاہیں۔ یعنی نہ لڑکے پر کسی قسم کا جبر ہو اور نہ لڑکی پر۔ اس طرح یہ فریقین جو باہمی معاہدہ کریں اسے نکاح کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاہدہ کے لئے کسی ثالث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن اگر اس معاہدہ کو منسوخ کرنا ہو تو اس وقت ثالث یا حَکم کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ فریقین (اور ان کے بچوں) کے حقوق کے تحفظ کا خیال رکھے۔ لہٰذا قرآن نے طلاق کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر نہیں دی جاسکتی۔ اس کا فیصلہ نظامِ معاشرہ (عدالت) کی رُو سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے معاشرہ سے کہا کہ وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا (۴/۳۵) اگر تم میاں بیوی میں باہمی اختلاف، جھگڑے یا مخالفت و عداوت کا خدشہ محسوس کرو، تو فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا تو تمہیں چاہیئے کہ ایک ثالث شوہر کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبے سے۔ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اگر یہ پنچ (دل سے) کوشش کریں گے کہ میاں بیوی میں صلح صفائی کرادیں، تو اللہ، میاں بیوی میں موافقت کے سامان پیدا کر دے گا۔ لیکن اگر یہ ثالث اس نتیجہ پر پہنچیں کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور حالات اس درجہ کشیدگی اختیار کر چکے ہیں کہ میاں بیوی کی باہمی موافقت ناممکن ہے، تو اس کے بعد عدالت علیحدگی کا فیصلہ کر دے گی۔ اسے طلاق کہتے ہیں[1]۔

(له فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ طلاق تک پہنچنے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ شرائط طلاق کے مبادیات میں سے ہیں اور طلاق ہو نہیں سکتی جب تک پہلے ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے۔ یعنی ثالثوں کی رپورٹ کے بعد عدالت فیصلہ کرے گی کہ باہمی موافقت کی صورت نکل سکتی ہے یا طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں نہیں رہا۔ اگر فیصلہ یہ ہو کہ طلاق ناگزیر ہے تو اس کی صورت حسبِ ذیل ہوگی:۔

پہلی بات یہ ہے کہ عدالت کو طلاق کا حکم کب دینا چاہیئے یا فیصلہ کس وقت نفاذ پذیر ہوگا۔ اس کے متعلق سورۂ طلاق میں ہے:۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵/۱)

اے نبیؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کی مدت پوری کرنے کے لئے طلاق دو۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ طلاق ایسے وقت میں دینی چاہیئے جہاں سے عدت کا شمار ہو سکے (عدت کسے کہتے ہیں اس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)۔ عدت کس قدر ہے اس کے متعلق فرمایا:۔

۱۔ وَٱلْمُطَلَّقَٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَٰثَةَ قُرُوٓءٍ (۲/۲۲۸)

اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔

۲۔ وَٱلَّٰٓـِٔى يَئِسْنَ مِنَ ٱلْمَحِيضِ مِن نِّسَآئِكُمْ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَٰثَةُ أَشْهُرٍ وَٱلَّٰٓـِٔى لَمْ يَحِضْنَ (۶۵/۴)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے نا امید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہ آسکا ہو۔

۳۔ وَأُو۟لَٰتُ ٱلْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (۶۵/۴)

اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔

۱؎ (گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) یہ خط ۱۹۴۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے عائلی قوانین نافذ ہوئے جن میں علاوہ دیگر اصلاحات، طلاق کے متعلق بھی مصالحتی کونسل کی شق رکھی گئی ہے۔ ہمارے علماء حضرات نے ان قوانین کی مخالفت کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

یعنی عدت ؛-

(۱) ان عورتوں کے لئے جنہیں حیض آتا ہو تین حیض کا زمانہ۔

(۲) جنہیں حیض نہ آسکتا ہو (بوجہ کبر سنی یا بیماری) تین ماہ ' اور

(۳) حاملہ کے لئے وضع حمل تک کا زمانہ۔

(جس عورت کو " ہاتھ لگانے سے قبل " طلاق دے دی جائے اس کی کوئی عدت نہیں (۳۳/۴۹)۔
صورتِ اوّل میں ظاہر ہے کہ چونکہ عدت کا زمانہ ماہواری ایّام کے شمار سے ہوگا ' اس لئے عدت کی ابتدا حیض کے بعد سے ہوگی۔ اگر عدت حیض سے پہلے یا دورانِ حیض شروع ہوگئی (اور اگر وہ حیض گنتی میں لے لیا) تو تین حیض کا زمانہ ' تین ماہ سے کم رہ جائے گا (اور اگر وہ حیض نہ شمار کیا تو) ایامِ عدت میں چار حیض ہو جائیں گے۔ اس لئے اس کی صحیح صورت یہی ہے کہ عدت کا شمار حیض کے فوری بعد سے شروع ہو۔ لہٰذا ' حائضہ کی صورت میں ' طلاق حیض کے بعد ' حالت طہر میں ہوگی۔ اس میں علاوہ دیگر مصالح کے ' ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر اس باہمی منافشت کے دوران حمل قرار پاگیا ہے تو اس کا علم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبائع میں تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بن جائے اور طلاق کا فیصلہ ٹال دیا جائے اور اس کے بعد بچہ ہونے کی صورت میں ایک نئی ازدواجی زندگی کی خوشگواری تعلقات میں موافقت پیدا کر دے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے کس طرح چلتے چلتے بھی ایک ممکن الوقوع تبدیلی سے اصلاحی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد اتصال ہے ' انقطاع نہیں۔ ملاپ ہے ' تفریق نہیں۔

لہٰذا ' حائضہ کی صورت میں طلاق کا وقت ' بعدِ حیض بحالتِ طہر ہے۔ البتہ دوسری صورتوں میں یہ شرط نہیں عائد کی جا سکتی۔

جب ان تمام مبادیات کے پورا کرنے کے بعد عدالت کا فیصلہ نافذ ہو جائے تو اسے طلاق کہا جائیگا۔ اس کے بعد نکاح ختم ہوگیا۔ میاں بیوی عقد کی بندشوں سے آزاد ہو گئے (طلاق کے معنی ہی بندشوں سے آزاد ہو جانے کے ہیں)۔ رجعی ' بدعی ' بائن وغیرہ طلاق کی قسمیں سب ہماری ایجاد کردہ ہیں۔ قرآن میں طلاق کی ایک ہی قسم ہے ' جس طرح نکاح کی ایک ہی قسم ہے۔ معاہدہ یا قائم رہتا ہے یا فسخ ہو جاتا ہے۔ ان کے بین بین کوئی اور شکل نہیں ہوتی۔ اب اس عورت کے ساتھ اس مرد کا نکاح باقی نہیں رہا۔

اب کیا ہوگا؟ اب عدت کا زمانہ شروع ہوگیا۔ تم پوچھو گے کہ عدت کیا ہوتی ہے؟ عدت اس مدت

کو کہتے ہیں جس میں یہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن یہی (سابقہ) میاں بیوی اگر چاہیں تو اس دوران میں باہمی نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ بالکل اسی قسم کا نکاح ہوگا جیسا عام حالات میں نکاح ہوتا ہے۔ ان ہی شرائط وقیود کے ساتھ جو قرآن نے نکاح کے لئے مقرر کی ہیں (ان کی تفصیل سلیم! اس وقت بتاؤں گا جب تم اپنی غزل کو مطلع سے شروع کرو گے)۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن انسانی کمزوریوں کی کس قدر رعایت رکھتا ہے۔ یہ عدت کا وقفہ کیسا عجیب مہلت کا وقفہ ہے جس میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر مفارقت کی زندگی کے تجربات سامنے آجاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی تجربات انہیں وابستگیٔ تعلقات پر پھر آمادہ کردیں اور ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جڑ جائے۔ اگر طلاق کی تحریک مرد کی طرف سے ہوئی تھی۔ یعنی عورت تو اس کے نکاح میں رہنا چاہتی تھی لیکن مرد اس تعلق کو منقطع کرنا چاہتا تھا اور اس طرح عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر دیا تھا۔ تو اگر یہ مرد اصلاح کا ارادہ رکھتا ہو تو عدت کے دوران اپنی بیوی سے پھر نکاح کرنے کے لئے اس کا حق فائق ہوگا؛ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (۲/۲۲۸) "اس (زمانۂ عدت) میں ان کے خاوند انہیں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں"۔ لیکن اگر اس زمانۂ عدت میں بھی انہوں نے تجدیدِ نکاح نہ کی تو اس کے بعد عورت آزاد ہوگی کہ چاہے اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرلے، چاہے کسی اور سے۔ اس آخری منزلِ انقطاعِ تعلقات کے وقت بھی دو گواہوں کی موجودگی کی ضرورت ہوگی تاکہ یہ بات چھپی نہ رہے کہ عورت اب جدید نکاح کے لئے آزاد ہے۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۶۵/۲)۔

اگر ان میاں بیوی نے عدت کے دوران یا اس کے بعد باہمی نکاح کرلیا تو انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں طلاق کے ایک CHANCE کو AVAIL کرلیا۔ (ان الفاظ سے سلیم! تم مفہوم کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکو گے) اب اگر ان کی دوبارہ ازدواجی زندگی میں، پھر وہی کشیدگی کے حالات رونما ہوگئے تو پھر اس طریق کے مطابق جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، باہمی طلاق ہو سکتی ہے۔ اس طلاق کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ عدت کے زمانہ میں یا اس کے بعد، یہ پھر باہمی تجدیدِ نکاح سے ازدواجی رشتہ استوار کرلیں۔ اگر انہوں نے دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد پھر نکاح کرلیا تو ان کے دو (CHANCES) ختم ہوگئے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹)

طلاق دو مرتبہ (ایسی ہوتی ہے جس میں) چاہے بطریقِ معروف اس عورت کو رکھ لیا جائے

یا بہ حسنِ سلوک اسے رخصت کردیا جائے۔

اب دوسری مرتبہ کی طلاق (اور تیسری مرتبہ کے نکاح) کے بعد انہیں (WARN) کردیا جاتا ہے کہ یہ لیلا بار بار نہیں رچائی جاسکتی۔ زندگی مذاق نہیں، سنجیدہ حقیقت کا نام ہے۔ اب بھلے مانسوں کی طرح زندگی کی کشتی کو کنارے تک لے جاؤ۔ اگر اس مرتبہ بھی تم نے آپس میں نباہ کی صورت پیدا نہ کی اور پھر رشتۂ مناکحت کو منقطع کرلیا، تو یاد رکھو اس تیسری بار کی طلاق کے بعد یہ عورت تمہارے نکاح میں نہیں آسکے گی۔ نہ دوران عدت، نہ اس کے بعد۔ اس لئے اب کے فیصلہ کرو تو سوچ سمجھ کے کرو۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ (۲/۲۳۰)

اگر تیسری بار طلاق دے دی تو پھر یہ عورت اس مرد کے لئے جائز نہیں رہے گی۔

یہ ہوگئی تیسری طلاق۔ اس جوڑے نے اپنی ازدواجی زندگی میں وصل و فصل کے سب (CHANCES) یعنی تینوں مواقع (AVAIL) کرلئے۔

اب یہاں سلیم! یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا یہ عورت اس مرد کے لئے ابد الآباد تک حرام ہوگئی؟ قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں۔ اگر اس عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کرلیا اور وہ نکاح بھی کامیاب ثابت نہ ہوا اور نوبت طلاق تک آگئی (اسی طرح طلاق جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے) تو اگر وہ عورت زمانۂ عدت کے بعد اس پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے۔ اوپر کی آیت یوں مکمل ہوتی ہے۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۚ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ (۲/۲۳۰)

تیسری طلاق کے بعد یہ عورت اس خاوند کے لئے جائز نہیں ہوگی الا اس کے کہ اگر وہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے اور وہ اسے طلاق دے دے تو اس صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف پھر رجوع کرلیں بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم رکھیں گے۔

یہ ہے سلیم! وہ آیۂ مقدسہ جس سے "حلالہ" کا مسئلہ وضع کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے تو طلاق کی یوں ہنسی اڑائی کہ جوں ہی کسی شخص نے غصہ میں آکر کہہ دیا تین طلاق (یا طلاق طلاق طلاق) تو یہ وہ طلاق ہوگئی کہ جس کے بعد

یہ عورت اس وقت تک اپنے خاوند کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے۔ پہلے تو احکام خداوندی کے استہزاء سے یہ مصیبت اپنے گلے ڈال لی پھر مصیبت کا لگے حل تلاش کرنے۔ اب حل یوں ڈھونڈا گیا کہ کسی شخص کو تیار کیا جائے کہ وہ اس عورت سے ایک رات کے لئے شادی کرلے اور ایک شب کی ہمبستری کے بعد اسے دوسری صبح طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرلے۔ سلیم! سوچو! کہ دنیا کی کسی قوم میں اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت بھی ہو سکتی ہے؟ کیا اس نکاح کو نکاح کہا جا سکتا ہے؟ یہ نکاح کا مذاق ہے۔ یہ خدا کے احکام سے استہزاء ہے۔ خدا کے احکام سے کیا' خود اپنی ذات سے استہزاء ہے۔ تم حیران ہو گے کہ اس بدبخت قوم میں پیشہ ور حلالہ کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ کس کس قسم کی شرائط منواتے ہوں گے؟ سلیم! مجھے تو تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لیکن جب تم نے بات پوچھی ہے تو مجھے بتانا ہی پڑے گا اور تمہیں بھی یہ بے حیائی کے تذکرے سننے ہی پڑیں گے۔ اور ابھی تو میں نے تمہیں حلالہ کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ انہیں نہ میں بتا سکوں گا نہ تم سُن سکو گے۔

بہر حال سلیم! یہ ہے قرآن کی رُو سے طلاق۔ اچھا ہوا تم نے بات پوچھ لی اور یوں اس باب میں قرآنی احکام سامنے آگئے۔ تم دیکھو گے کہ اس بارے میں مسلمان کس قدر جہالت میں گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے' ہمارے معاشرے میں قرآن کے مطابق طلاق کہیں نظر نہیں آتی۔ کہیں ایک ہی مرتبہ ایک' دو' تین سے تینوں طلاقیں پوری کر دی جاتی ہیں اور کہیں تین مہینوں (عدت کے زمانہ) میں ایک ایک ماہ کے بعد' تین طلاقیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ یہ فقہ اور روایات کی طلاق ہے' قرآن کی نہیں۔ اور قرآن کا مسلمانوں کے ہاں باقی ہی کیا ہے؟ یہ تو خدا کا احسان ہے (اور یہ اس لئے کہ اس نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور قرآن کی حفاظت کا خود ذمہ لے رکھا ہے) کہ قرآن اپنی اصلی شکل میں ہمارے ہاں موجود ہے جس کی وجہ سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ ہمارا کون کون سا عمل قرآن کے مطابق اور کون کون سا کام اس کے خلاف ہے' ورنہ کوئی صورت ہی نہ تھی کہ ہم آج یہ معلوم کر سکتے کہ اسلام کی صحیح شکل کیا تھی۔ قرآن اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ ہوتا تو آج نہ میں یہ کچھ بتا سکتا' نہ تم سُن سکتے۔ باقی مذاہب کے ساتھ یہی ہوا کہ ان کی آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ رہیں۔ اس لئے وہ آج اس قابل ہی نہیں کہ یہ بتا سکیں کہ وہ کہاں کہاں غلطی کر گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ مذہب کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بہر حال یہ داستان الگ ہے۔

جو بات تم نے پوچھی وہ اوپر آچکی ہے۔

(۰)

ایک بات سلیم! اور رہ گئی۔ مندرجہ بالا احکام سے یوں مترشح ہوتا ہے گویا طلاق کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے اور عورت بے چاری مجبور ہے کہ جو فیصلہ مرد کرے اسے تسلیم کرلے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ قرآن نے ان احکام کے ساتھ ہی فرمادیا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸) - "عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں۔" یہ ایک ایسا کلیہ اور اصولِ جامع بیان کردیا گیا ہے جس کے اندر وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی ہیں جو نکاح وطلاق کے متعلق مردوں کو مخاطب کرکے بیان ہوئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن حالات کے ماتحت، جن جن شرائط کے مطابق، ایک خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے ان ہی حالات و شرائط کے مطابق عورت اپنے خاوند سے طلاق لے سکتی ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ اگر بیوی کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو اس کے لئے بھی اس طرح مصالحتی اقدامات کرنے چاہئیں جس طرح مردوں کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے (۴/۱۲۸)۔ اگر موافقت کی کوئی شکل پیدا نہ ہوتی ہو تو پھر عدالت ان میں مفارقت (طلاق) کا حکم صادر کرسکتی ہے (۴/۱۳۰)۔ اس صورت میں (جب عدالت دیکھے کہ مرد نباہ کرنا چاہتا ہے لیکن عورت علیحدگی چاہتی ہے) تو عورت کو اپنے مہر میں سے کچھ رقم بطور ہرجانہ ادا کرنی ہوگی (۲/۲۲۹)۔

(۰)

اب تمہاری آخری بات باقی رہ گئی کہ اگر ایک شخص غصہ کی حالت میں ایسے الفاظ کہہ دے یا قسم کھالے جس سے میاں بیوی کے تعلقات زناشوئی میں فرق آجاتا ہو تو اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ قرآن میں ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (۲/۲۲۵)

تمہاری قسموں میں جو لغو اور بے معنی ہوں گی ان پر اللہ پکڑ نہیں کرے گا۔ جو کچھ بھی پکڑ ہوگی تو وہ اس بات پر ہوگی جو (تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے۔ اور اس لئے) تمہارے دلوں نے (اپنے قصد وارادہ سے) قسم کھائی ہے۔ اللہ غفور و حلیم ہے۔

یعنی جو قسم بلا قصد وارادہ کھالی جائے اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ یہ لغویت ضرور ہے جس سے اجتناب کرتے

کا حکم قرآن میں آیا ہے (۳/۲۳)۔ باقی رہیں وہ قسمیں جو دل کے ارادہ سے کھائی ہوں لیکن بعد میں انسان ان پر متاسف ہو اور چاہے کہ ان سے رجوع کرے، تو ان کے متعلق دوسری جگہ کفارہ کا حکم ہے۔ یعنی کچھ تاوان دے کر اپنی حماقت کا خمیازہ بھگتے (دیکھو ۵/۸۹) لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی سے (مثلاً) مقاربت کے بارے میں قسم کھالے اور اس کے بعد اس پر نادم و متاسف بھی نہ ہو تو اس سے بیوی معلق حالت میں رہ جائے گی۔ اس حالت کو غیر معین عرصہ تک کے لیے روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (۲/۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کی قسم کھالیں تو ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ اس مدت کے اندر رجوع کرلیں تو اللہ رحمت سے بخشنے والا ہے۔ لیکن اگر (ایسا نہ ہو سکے اور) وہ طلاق کی ٹھان لیں تو (یہ سمجھ رکھو کہ) اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی ایسی صورت میں چار ماہ کے اندر فیصلہ کرنا ہوگا کہ تمہارا باہمی نباہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر تم اپنے کئے پر پچھتاؤ، تو قسم کا کفارہ ادا کر کے باہمی ملاپ کرلو۔ لیکن اگر معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہو اور ملاپ کی صورت نظر نہ آتی ہو تو پھر وہ تمام شرائط پوری کر کے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، اپنے ازدواجی معاہدہ کو ختم کرالو۔

اس چیز پر بھی تم نے سلیم! غور کیا ہوگا کہ قرآن نے وجوہِ طلاق کو معین نہیں کیا۔ عیسائیت صرف زنا کی صورت میں طلاق کی اجازت دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میاں بیوی خواہ کسی وجہ سے الگ ہونا چاہیں انہیں زنا ثابت کرنا پڑتا ہے اور یہ صورتِ حالات جس قدر خرابیوں کا موجب بن سکتی ہے، ظاہر ہے۔ ان ہی دقتوں کی بنا پر اب عیسائی حکومتوں نے طلاق کے مذہبی قانون کو چھوڑ کر "دنیاوی قانون" الگ بنالئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ حدود و شرائط نہیں جو قرآن نے متعین کی ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کو لیجئے تو ان کے ہاں مذہباً طلاق جائز ہی نہیں۔ اس لئے اب انہیں بھی اپنے مذہب کو چھوڑ کر طلاق کے لئے الگ راہیں تلاش کرنی پڑ رہی ہیں۔ تیسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہیں ان کے خدا کی طرف سے ایسے عمدہ احکام ملے، لیکن انہوں نے خود ساختہ قوانین اختیار کر کے اپنے آپ کو جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ ان سب خرابیوں کا علاج، سلیم! ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم تمام دوسرے قوانین و رسوم سے منہ موڑ کر صرف اس قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ

بنائیں جو خدائے احکم الحاکمین نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور یہی اصل دین ہے۔

(٥)

جاتے جاتے تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش ہوا تھا جسے ساردا بل کہتے تھے اور جس کی رُو سے نابالغان کی شادی ممنوع قرار پا جاتی تھی۔ یہ بل ایک ہندو کی طرف سے پیش ہوا تھا جن کی مقدس مذہبی کتابوں میں نابالغان کی شادی کی اجازت ہی نہیں بلکہ اسے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ سُن کر سلیم! تمہاری حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ اس موقع پر مسلمانوں کے تمام مذہبی فرقوں نے اس بل کی سخت مخالفت کی اور ایک متحدہ محاذ بنا کر وائسرائے سے اپیل کی کہ مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ کس قدر بوالعجبی ہے کہ ہمارے علماء کا حق پر کبھی اتحاد اجماع نہیں ہوتا۔ اگر کبھی یہ باہم متفق ہوتے ہیں تو اس معاملہ پر جو قرآن کے خلاف ہو۔ کس قدر تاسف انگیز تھا سلیم! یہ منظر کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نمائندے، یعنی حضرات علمائے کرام، ایک غیر مسلم حاکم سے استدعا کر رہے ہیں کہ وہ نابالغوں کی شادی کو ناجائز قرار نہ دے کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہوگی۔ ہر قلب حساس کی آنکھ اس منظر پر خون فشاں تھی۔ بعض حضرات نے جو فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار نہ تھے دریافت کیا کہ نابالغ کے نکاح کے جواز میں کوئی قرآنی سند بھی موجود ہے۔ جواب ملا کہ ہاں موجود ہے۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ نابالغوں کے نکاح کے جواز میں قرآنی سند کیسے مل سکتی ہے؟ نکاح تو ایک بہت بڑا اور اہم معاہدہ ہے اور معاہدہ کی اولین شرط فریقین کی بلاجبر و اکراہ رضامندی ہے جو بلوغت کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن سنو! کہ وہ سند کیا تھی؟ عدت کے ضمن میں تم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ
ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ط (۶۵/۴)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں، اگر تمہیں شک ہو تو ان کی
عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہ آسکتا ہو۔

انہوں نے کہا کہ سند یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آیا ہو (لَمْ يَحِضْنَ) ان کی عدت تین ماہ ہے۔ "وہ عورتیں جنہیں حیض نہ آیا ہو" نابالغ لڑکیاں ہی ہو سکتی ہیں، سو جب ان کی عدت کا ذکر ہے تو ان کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن نے سلیم! "لَمْ يَحِضْنَ" کہا ہے جس کے معنی "حیض نہ آیا ہو" نہیں،

بلکہ یہ ہیں کہ "جنہیں حیض نہ آسکا ہو" یعنی بیماری کی وجہ سے یا کسی جسمانی نقص کے باعث (CONSTITU TIONALLY) حیض نہ آسکے۔ اور اگر سلیم! بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن نے نابالغ لڑکی کی عدت کی مدت بیان کی ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ وہ نابالغ لڑکی کی شادی کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مقصود ہے کہ اگر ایسی صورت سامنے آجائے جس میں کسی نے (خلافِ حکمِ قرآن) کسی نابالغ لڑکی سے شادی کرلی ہو تو اس میں عدت یوں گنی جائے گی۔ یہ ویسی ہی امکانی شکل ہے جیسی نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی۔ قرآن میں ہے کہ تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز نہ پڑھو۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں ثابت ہوجاتا کہ قرآن شراب کی اجازت دیتا ہے۔ شراب ممنوع ہے لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اس امرِ ممنوع کا ارتکاب کرے تو وہ اس حالت میں نماز کے قریب نہ جائے۔

بہرحال سلیم! یہ تو ایک ضمنی گوشہ تھا اس کے متعلق تفصیلی بحث کبھی پھر سہی۔ اس وقت تم نے طلاق کے متعلق پوچھا تھا۔ سو میرا خیال ہے کہ قرآن کی رُو سے طلاق کے احکام واضح ہوگئے ہوں گے۔ مختصراً پھر سُن لو کہ اس کے لئے حسبِ ذیل شرائط لانیفک ہیں۔

۱۔ میاں بیوی کے اختلاف کی صورت میں:۔

(الف) باہمی افہام و تفہیم سے اصلاحِ احوال کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(ب) اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو عدالت یا (پنچایت) کی طرف سے دو ثالثوں کا تقرر۔ اگر ثالث بھی اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر عدالت کی رُو سے فیصلہ کہ طلاق کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

۲۔ طلاق کے حکم کا نفاذ حیض کے بعد حالتِ طہر میں ہوگا۔

۳۔ اس فیصلہ کے بعد نکاح کا معاہدہ ختم ہوجائے گا اور عدت کا زمانہ شروع۔

۴۔ زمانۂ عدت میں عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کرسکے گی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی رضامند ہوں تو آپس میں نکاح کرسکتے ہیں۔

۵۔ عدت کے بعد عورت آزاد ہے کہ جس مرد سے چاہے شادی کرے خواہ اپنے پہلے خاوند سے یا کسی اور سے۔ پہلے خاوند سے بھی نکاح پوری شرائط کے ساتھ ہوگا۔

۶۔ اگر یہ آپس میں نکاح کریں تو اُس کے بعد ان کی نئی ازدواجی زندگی شروع ہوگی۔

۷۔ اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے تو زمانۂ عدت میں یا اس کے بعد بھی میاں بیوی دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں۔

اب یہ دو مرتبہ کی طلاق ہوگئی۔

۸۔ اس کے بعد، اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے (جو تیسری مرتبہ کی طلاق ہے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کرسکتے، نہ زمانۂ عدت میں، نہ عدت کے بعد۔

۹۔ البتہ اگر اس عورت کو اس کے نئے خاوند سے ان ہی شرائط کے مطابق جو اُوپر درج کی جاچکی ہیں، طلاق مل جائے یا وہ بیوہ ہوجائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے شادی کرلے۔

۱۰۔ طلاق کے متعلق جو حقوق و فرائض مرد کے ہیں، وہی عورت کے ہیں۔ عورت بھی اسی طرح مرد کے حلقۂ تزویج سے آزاد ہوسکتی ہے جس طرح مرد معاہدۂ نکاح کو فسخ کراسکتا ہے۔ لیکن نہ یہ جس طرح جی میں آئے کرسکتا ہے، نہ وہ ایسا کرسکتی ہے۔ اُسے بھی قرآنی شرائط و حدود کے مطابق عدالت سے طلاق حاصل کرنی ہوگی اور اسے بھی۔

سمجھ گئے سلیم! یہ ہے قرآنی طلاق، جسے تم تو مان لوگے لیکن مولوی صاحبان نہیں مانیں گے! اس لئے کہ ان کا مذہب خدا کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور کہتے یہی ہیں کہ وہ منزل من اللہ ہے؛ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

وَالسَّلَام

(جنوری ۱۹۴۹ء)

---

[1] ازدواجی زندگی اور عورتوں سے متعلق دیگر احکام "طاہرہ کے نام خطوط" میں ملیں گے۔ یہ کتاب ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ طلاق کے متعلق مزید وضاحتیں بھی اس کتاب میں ملیں گی۔ ویسے، عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد، یہ معاملات ان قوانین کی رُو سے طے پاتے ہیں۔ ضرورت کے وقت انہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

پانچواں خط

اِسلامی نظام کے بُنیادی اُصول

تمھارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اس دن سے انتظار کر رہا تھا جس دن تمہیں طلوعِ اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام" سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔[1] اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے۔ سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہو اور توارث اور ماحول کے اثرات سے انسانی تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS) کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو، وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہنِ انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس عقیدہ کو دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظِ ذات (PRESERVATION OF SELF) ہے اور شکستِ پندار (خواہ وہ نظری اور علمی میدان ہی میں کیوں نہ ہو) انسان کی خفت کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو، دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریقِ مقابل سے شکست کھا کر انسان کے اندر احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) نہ پیدا ہو جائے، کیونکہ احساسِ کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت انسانی خفت کا سبب۔ اس لئے جب کبھی کسی کے سامنے کوئی ایسی بات آئے جس سے اس کے کسی عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو، تو عقل کی طرف سے

---

[1] اس کے بعد اس موضوع پر بکثرت لکھا اور شائع کیا جا چکا ہے۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

پہلا ردِّ عمل، اس نئے نظریئے یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو مُنَزَّہ عَنِ الخطا سمجھ کر ان کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا نام تقلیدِ اعمیٰ ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوت الی الحق اور ہر حرکتِ انقلاب کی اوّلین مخالف ہوتی ہے۔ آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ ہر داعیٔ الی اللہ کی دعوتِ حق و صداقت کے جواب میں یہی کہا گیا کہ جو عقائد ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلے آ رہے ہیں ہم انہیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳) "اسی طرح اے رسولِ عربیؐ! ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا، مگر وہاں کے سہل انگار خوشحال دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے طبقہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں۔" لیکن سلیم! ذرا سوچو کہ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کی یہ دلیل کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں فنا کر دیا جائے تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ انکی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیٔ مبین کی شکل میں ہماری رشد و ہدایت کے لئے آئی ہے۔ لہٰذا میں نے جو کچھ کہا ہے اُسے اس ازلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہہ دینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے، نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے نہ میری معروضات کو غلط ٹھہرا سکتا۔ صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے۔ نہ میرا دعوےٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی شخص میری گزارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اس سے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(٭)

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی چاہے بڑھائے جائیے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور مختصر ؎

ہم عشق کے ماروں کا اتنا سا فسانہ ہے　　سمٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ اور جو عقیدہ وراثتاً تمہیں ملا ہے اسے بھی الگ رکھ دو (ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا) پھر از خود غور کرو کہ قرآن تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے لیکن شراب کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن شراب خوری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (۵/۹۰) ہے۔ یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔ اور

(۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے) اس لئے جس طرح زنا فواحش میں سے ہے "فلہٰذا جرم" اسی طرح شراب فواحش میں سے ہے "فلہٰذا جرم"۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی ہے۔

ایک غیر مسلم معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے۔ وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جن جرائم کی سزا قرآن نے متعین نہیں کی ان کی تعیین رسول اللہؐ نے کر دی اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہو گئی۔ اس کا نام سنت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن اور سنت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے؟ اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود ان چیزوں کی تعیین نہیں کر سکتا تھا جو انہیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر ان کی رسول اللہؐ

---

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے مقرر کی تھی اس لئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کر دیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے کے اقوال و اعمال سب شامل کر لئے جاتے ہیں۔

سے تکمیل کرانی پڑی؟ اسے کون سا امر مانع تھا جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کر دیتا یا جس طرح روزوں کے مہینے اور اوقات کی تخصیص کر دی تھی، زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کر دیتا۔
مقامِ رسالت کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ـــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــ ذاتِ خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی؟ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کو اس کے جواب کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحیٔ متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر رسول اللہ کی روایات میں ہے (اسے وحیٔ غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں دیا گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کر دی ہے، البتہ وہ اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ روایات کے مجموعوں میں ہیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح بداہتاً غلط اور درایتاً کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ وہاں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے۔

وَ اتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ (۱۸/۲۷)

تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔

سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا[1]۔

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم! کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا) وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی) وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی) وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "مقامِ حدیث"۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلہٗ معہٗ[1]) لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ قرآن سے باہر۔ یہ حکم کہ اٰتُوا الزَّكٰوۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں اور یہ کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فیصد دو' قرآن سے باہر۔ کیا قرآن میں "اڑھائی فیصد" کے الفاظ نہیں لائے جا سکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ[2] تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس تقسیم خداوندی میں کون سی مصلحت تھی؟ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک قسم کی وحی سے حکم دیا کہ زکوٰۃ دو اور اسے قرآن میں محفوظ کر دیا اور دوسری قسم کی وحی سے بتایا کہ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد ہے اور اسے قرآن سے باہر رکھا۔ یہ تو ہوا عملِ خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کر دی۔ اب اس کے بعد عملِ رسالتؐ دیکھئے۔ اس عقیدہ کی رُو سے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام و کمال لکھوا دیا۔ شروع سے اخیر تک اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے۔ حفّاظ کو زبانی یاد کرا دیا۔ ان کے حفظ کردہ کو بار بار سُن لیا اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے امت کو دے دی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم (روایات) سو اسے نہ کہیں لکھوایا نہ کسی کو یاد کرایا۔ نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ نہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا۔ بلکہ اگر کسی نے از خود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا کہ لَا تَكْتُبُوا عَنِّي غَيْرَ الْقُرْاٰن (مسلم) "مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔" ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) اور سنّت (وحی غیر متلو) کے مجموعے کا۔ اور دین کے جزوِ اوّل کی حفاظت کا تو اس قدر انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے لیکن جزوِ ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے! کیا اس سے رسول اللہ کے منصبِ رسالت (دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر بھی غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابلِ اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی' اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کرا کر ان کی تصدیق کر دی گئی؟ اس کے علاوہ اس حقیقت

---

[1] قدامت پرست حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ روایات قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہیں۔

[2] سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اس کے لئے یہی دلیل دی ہے کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ (تفہیمات' حصہ اوّل' صفحہ ۲۳۷)

کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ روایات، رسولؐ اللہ سے بلفظہٖ منقول نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ رسولؐ اللہ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہی الفاظ روایات میں موجود ہیں۔ روایات بالمعنیٰ نقل ہوئی ہیں۔ یعنی رسولؐ اللہ نے جو ارشاد فرمایا تھا اس کا مفہوم آگے منتقل ہوا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو اس میں حافظہ کے قوی یا کمزور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"وحیٔ غیر متلو" کی تدوین و تحفظ کے بارے میں عملِ خداوندی اور عملِ رسالتؐ تم دیکھ چکے۔ اب عملِ خلفائے راشدینؓ دیکھو۔ انہوں نے کس اہتمام سے قرآنِ کریم کے نسخے تیار کئے اور ان مصدقہ نسخوں کو سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچایا اور اس کا حکم دے دیا کہ جہاں کوئی اختلاف ہو ان مصدقہ نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ کچھ انہوں نے دین کے ایک جزو (وحیٔ متلو یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحیٔ غیر متلو یعنی احادیث) کے متعلق نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر د روایت کی کوشش کر رہا ہے، اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا (تفصیل اس کی تم کئی بار سُن چکے ہو[1])۔ ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں؟ کیا لا محالہ تم اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے؟ نہ یہ منشائے خداوندی تھا، نہ منشائے رسالتؐ اور نہ مسلکِ خلافتِ راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسولؐ کو دیا۔ اسی کو رسولؐ نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہؓ نے آگے بڑھایا۔

اسے ایک بار پھر سُن لو سلیم! کہ رسولؐ اللہ نے احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ اگر احادیث دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسولؐ اللہ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ دین کے اس حصے کو بھی مستند طور پر مرتب کر کے اُمت کو دے کر جاتے؟ احادیث کے مجموعے حضورؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد، لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کئے تھے[2]۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ رسولؐ اللہ دین کے ایسے اہم حصے کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کے نزدیک یہ حصہ دین کا جزو تھا ہی نہیں۔ جو لوگ اب احادیث کو دین

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے "مقامِ حدیث"۔

[2] احادیث کا صحیح ترین مجموعہ (بخاری) تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوا تھا۔ اس کے مرتب، امام بخاریؒ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

سمجھ رہے ہیں ان سے یہ سوال پوچھئے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکے گا۔ اب یہ دیکھو کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں؟ قرآن اپنی محفوظ شکل میں امت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ امت کے پاس نہ تھا۔ لیکن انہیں قرآن کا ہم پلہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف و الحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسولؐ ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں وہ روایات پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ غور کرو سلیم! کہ جس دین (قرآن) کو خدا اور اس کے رسولؐ نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اس دین میں تحریف و الحاق کے کتنے بڑے امکان کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپؐ کو بھی اس کے مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے: قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآيِٕ نَفْسِيٓ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۖ (۱۰/۱۵) ان سے کہہ دو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝
ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ (۶۹/۴۴ - ۴۶)

اگر رسول کسی بات کو یوں ہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ ڈالتے۔

لیکن اب واضعین حدیث کو کھلی چھٹی تھی کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیں اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ قرآن کی تعلیم میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ جس کے رسول اللہؐ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ تو وحیٔ غیر متلو کے ذریعہ سے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا۔ اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا

ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس "وحیِ غیر متلو" نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کر دیا جنہیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کر دی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سَو دُرّے مقرر کی ہے۔ روایات (وحیِ غیر متلو) نے کہہ دیا کہ یہ سزا غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی ہے۔ شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے لیکن روایات (وحیِ غیر متلو) نے کہہ دیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ چونکہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات خود متعین نہیں کیں اس لئے یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ لیکن وحیِ غیر متلو کے عقیدہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ جن جن احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ بھی ناقص ہیں اور ان کی تکمیل و ترمیم وحیِ غیر متلو کے ذریعہ ہوتی ہے اور "وحیِ غیر متلو" (روایات) وضع کرنے کے دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ چنانچہ تنقیدِ حدیث کی کتابیں اس پر شاہد ہیں کہ وضعی احادیث لاکھوں کی تعداد میں بنتی گئی تھیں۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہوگا کہ

(الف) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا۔ اور

(ب) یہ کہ وحیِ غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا؟

اگر تم نے اصل مضمون کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جوابات بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام کیا کرتے ہیں کہ جونہی کوئی ایسا خیال سامنے آیا جو اُن کے کسی مروّجہ عقیدہ کے خلاف ہو انہوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کر دیئے۔ یہ روش تو تمہاری فطری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذرت پر میری نگاہ ہے (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفسِ غیر شعوریہ کی گہرائیوں میں مسلّم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے اب آؤ ان اعتراضات کی طرف۔

تم جانتے ہو کہ قرآن، تمام دنیا کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور دوسری چیز فرع۔ قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدّل رہتی ہیں۔ لیکن ان کی فروعات انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے

تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدّل نہیں ہوسکتیں۔ قرآن نے بجز (چند فروعات کے) انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بتائے ہیں، اُن کی جزئیات خود متعیّن نہیں کیں۔ اس لئے کہ قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدّل ہے (لا تبدیل لکلمٰت اللّٰہ)۔ اگر قرآن جزئیات خود متعیّن کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیّر و تبدّل نہ ہو سکتا۔ جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اس نے متعیّن کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی یہی تھا کہ انہیں غیر متبدّل رکھا جائے۔ اس قسم کا قانون (جس میں تمام جزئیات تک بھی غیر متبدّل ہوتیں) تمام نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطہ حیات قرار نہیں پا سکتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندو مت وغیرہ آج اس طرح ناکام کیوں ہوئے ہیں؟ انہیں کیوں ان کے اپنے پیروؤں نے چھوڑ دیا ہے؟ انہوں نے اپنے اپنے مذہب کو خوشی سے نہیں چھوڑا ہے۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ یہی کہ جو مذہبی رسوم و قیود (یعنی جزئیاتِ قانون) کسی زمانہ میں متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدّل قرار پا گئیں۔ اب وہ جزئیات عصرِ حاضر کے انسان کے تمدّنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ اربابِ مذہب، اس عقیدہ کی بناء پر کہ وہ غیر متبدّل ہیں، ان کی پابندی پر مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر ان کے معتقدین وقت کے اٹل تقاضوں سے ایسے مجبور ہوئے کہ انہیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ ان کی آسمانی کتاب ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں، اس لئے ان جزئیات کے ساتھ ہی مذہب بھی گیا۔ (در اصل ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا)۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات اور ہندوؤں کو منوجی کی جزئیات (جنہیں ابدی اور غیر متبدّل کہا جاتا تھا) کس طرح زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی پڑیں۔ قرآن کے پیشِ نظر جہاں انسانی زندگی کے نشو و ارتقاء کے لئے مستقل اقدار اور غیر متبدّل اصول تھے وہاں اس کی تمدّنی زندگی کے بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطہ حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بناء پر اس نوعِ انسانی کے لئے ابدی ضابطہ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔

لہٰذا، یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے متعیّن نہیں کیا کہ وہ انہیں قابلِ تغیّر و تبدّل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی زمانہ کی متعیّن شدہ جزئیات کو ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رکھنا مقصود ہوتا تو قرآن خود ہی انہیں متعیّن کر دیتا۔ لہٰذا، قرآن کی غیر متعیّن جزئیات کو کسی ایک زمانہ میں متعیّن کر کے انہیں آئندہ کے لئے غیر متبدّل

قرار دے دینا دین کی اس صلاحیت کو سلب کرلینا ہے جس کی بنا پر وہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا ہے۔
ذرا سوچو سلیم! کہ اگر کسی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فیصد سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہ کرسکے اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضلہ اثاثہ (SURPLUS ASSETS) پر ہو تو حکومت کبھی چل سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے[1]۔ اگر خلافتِ راشدہ نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اڑھائی فیصد مناسب سمجھا تھا تو اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فیصد ہے تو یہی بیس فیصد شرعی شرح قرار پا جائے گی (اور جب قرآنی نظامِ ربوبیت اپنی آخری شکل میں قائم ہوگا تو اس کی نوعیت کچھ اور ہی ہو جائے گی[2]۔
یہ ہے وہ مصلحت سلیم! جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ہم نے کسی ایک زمانہ کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر کے اس دینِ ابدی کو وقتی بنا دیا ہے۔ سلیم! تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصرِ حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس کے موجودہ زمانہ کے تقاضوں میں (FIT) نہیں بیٹھتیں۔ اگر اس زمانہ کے مسلمان کے سامنے قرآن کے اصول رکھ دیئے جائیں اور اس کے بعد اس سے کہا جائے کہ اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والی جزئیات خود متعین کرو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک کہتا ہے اس حریمِ فطرت کے گرد مستانہ وار طواف کرتا ہے۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست	عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست	ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

(۰)

اب دوسری شق لو۔ یعنی یہ کہ یہ جزئیات، غیر متبدل کس طرح قرار پا گئیں؟ اسی کو بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ

[1] زکوٰۃ کا صحیح مفہوم دوسری جگہ سامنے آئے گا۔　(اپریل ۱۹۸۰ء)
[2] تفصیل کے لئے دیکھئے "نظامِ ربوبیت"۔ (شائع کردہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ)۔

وحیٔ غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہو گیا؟

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ان جزئیات میں حسبِ ضرورت اضافے بھی ہوتے رہے اور ترمیمات بھی۔ خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے دیئے جو حضورؐ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور یہی کہہ کر دیئے کہ ہمارے زمانے کے حالات کا یہی تقاضا ہے۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ وحیٔ غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں ملتا ہے، نہ صحابہؓ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح تک سے ناواقف تھا۔ ان کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی۔ اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امورِ سلطنت اپنے لئے مختص کر لئے اور امورِ دین کو انفرادی طور پر علماءؔ کے سپرد کر دیا تو قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی اسلامی نظامِ مملکت کی وساطت سے) وہ خود بخود مٹ گیا۔ حسنِ ظن کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جن لوگوں کے ذمے امورِ دین کا تحفظ قرار پایا، انہوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو قانون کی حیثیت دے کر نافذ کرنے کا فریضہ ترک کر دیا ہے، اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ وہ صرف اس زمانے کے لوگوں کے لئے شریعت تھیں جن کے لئے انہیں مرتب کیا گیا تھا تو ملت، شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (ANARCHY) پھیل جائے گا۔ لہٰذا، ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ تھا کہ اس وقت کی مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر واجب التعمیل ٹھہرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انہیں بہ تمام و کمال ذاتِ رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جاتا اور

لے سلیم! تم حیران ہو گے کہ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دکھائی دیتے ہیں نہ زمانۂ خلافتِ راشدہؓ میں۔ یہ بھی اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہو گئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائرِ منصب جداگانہ قرار پا گئے۔ "حضرت مولانا ابوبکر صدیقؓ اور حضرت مولوی عمر فاروقؓ" آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

یہ کہہ دیا جاتا کہ حضورؐ نے انہیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہیں۔ انہیں وحی قرار دینے میں غالباً یہ مصلحت بھی تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہاد سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہلِ فقہ) اس عقیدے کی رُو سے ان کے مخالف گروہ (اہلِ حدیث) کو اُن کے ردّ کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابویوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کی جبین عقیدت اوّل الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدّل قرار دینے کا اوّلین جذبۂ محرکہ یہی تھا[1] یعنی ملّت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آرار کے تابع کر دینے کے بجائے انہیں تقلید کی حدود میں مقید کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضعِ احادیث کا اتنا بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اس نے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزوِ دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملّت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیّر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں علیٰ حالہٖ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیّر و تبدّل ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہوئی یا چالیس فیصد دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، لیکن مذہب حکومت سے الگ ہے، وہاں ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہاں حکومت کے ٹیکس الگ ہیں اور زکوٰۃ بطور خیرات دی جاتی ہے۔ اس لئے اس سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد یہ آواز ہر در و دیوار سے اٹھنی شروع ہوئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہیئے (اور یہی تشکیلِ پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب اس سوال نے

---

[1] میں اس وقت اس سازش سے بحث نہیں کر رہا جو عجمی عناصر (یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت) نے اسلام سے انتقام لینے کی غرض سے کی اور جس کی رُو سے انہوں نے روایات سازی کے راستے اپنے خیالات اور عقائد کو عین اسلام بنا کر دکھایا۔ اس کے متعلق دوسرے مقامات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے نیک نیتی سے اس قسم کا عقیدہ پیدا کیا ان کے پیشِ نظر غالباً اسی قسم کی مصلحت تھی۔ اور اگر یہ مصلحت نہ تھی تو لامحالہ کہنا پڑے گا کہ وہ بھی اس عجمی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔

بھی عملی شکل اختیار کر لی ہے کہ یہ جزئیات جو ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں یا زمانہ کے مقتضیات کے مطابق' ان میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے ؟ جو لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں نظامِ شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت ان ہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں اربابِ شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں' تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا ؟ اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ یہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انہیں چھوا تک نہیں جا سکتا۔ اس لئے انہیں اسی طرح اختیار کرنا ہوگا۔ اس سے انہیں کچھ واسطہ نہیں کہ اس سے ہم زمانہ کے ساتھ بھی چل سکتے ہیں یا نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے پرکھا نہیں جاتا۔ تمہیں یاد ہے' ایک دفعہ دہلی میں ہم ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین سرگرمی سے چل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر' پورے زور شور کے ساتھ۔ لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا۔ اس لئے مشین چل رہی تھی لیکن چھپ کچھ نہیں رہا تھا۔ مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپ کچھ نہیں رہا۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) ضَلَّ سَعْيُهُمْ (ان کی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں) لیکن اب سلیم! خدا خدا کر کے ہمیں ایک ایسا موقع ملا ہے جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن ملوکیت کا استبداد و تغلب ہنوز ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنا لیں۔ صدیوں کے بعد پھر وقت آیا ہے کہ ناقوسِ فطرت ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ؎

تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبداءِ فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس کے بعد قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا اور ہم آزادی کی فضائے بسیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے سلیم! ؎

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں   میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز   مری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ ؎

نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ ؎

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویدار وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ فقہ و روایات کی وہ جزئیات جو ہزار سال پیشتر کے زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں اس لئے وہ انہی جزئیات، کے مجموعہ کو قانونِ شریعت، بنا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا اور مسلمان اس سے ایسا بدکے گا کہ دوبارہ اس کی طرف رُخ نہیں کرے گا اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہوگا بلکہ تمام نوعِ انسان پر بھی ظلم ہوگا کہ اس سے انسانیت اس نور سے محروم رہ جائے گی جس کی روشنی میں اس نے اپنے اشرف و مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں[1]۔ وَ ذٰلِكَ خُسْرَانِ الْمُبِيْن۔

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولی قوانین اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانہ میں متعین کیں تو رسولؐ پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہوگا؟ تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی کہ اس ملئے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ رسولؐ اللہ کا خود ساختہ نہیں)۔ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا ہمیں بھی اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ثبوت ہے اور وہ یہ کہ خود محمدؐ ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے، قرآن کے منزّل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قانون

---

[1] اس کے بعد پاکستان میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اربابِ شریعت نے وہی قدیمی فقہی قوانین کو اسلامی کہہ کر پیش کیا اور حکومت نے انہیں ملک میں نافذ کر دیا اور وہ ناقابلِ عمل ثابت ہوئے۔ اسی موضوع پر ادارہ طلوعِ اسلام نے کثیر لٹریچر شائع کیا ہے۔　(اپریل ۱۹۸۰ء)

ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہ شرفِ انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعثِ احترامِ آدمیت سمجھتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے آشنا کرایا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہم نے متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انہیں متعین نہ فرماتے تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول کیا ہے! درحقیقت واجب تقلید حضورؐ کی وہ سیرتِ طیبہ ہے جسے تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک، اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا گیا ہے۔ جزئی قوانین، زمان و مکان کی حدود میں گھرے ہوئے ہیں لیکن سیرتِ مقدسہ کی ضوفشانیاں عالمتاب اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ یہی وہ سیرتِ خلوص ہے جس سے حضورؐ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور اس طرح اسے حریتِ فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جن میں وہ جکڑے چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل وہ استبداد تھا جو ملوکیت، سرمایہ داری اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار چلا آتا تھا۔ قرآن نے آ کر یہ اعلان کیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا سے ورے میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے چاہیئے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم سب ربانی انسان بن جاؤ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقیدالمثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھائے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہِ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت نے اس تعلق کو مسلسل قائم رکھنا تھا، لیکن اُمت بہت جلد اس راستہ سے بھٹک

گئی اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی غیر خدائی شخصیتیں حائل کر لیں جنہیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جنہیں رسول اللہ نے ہٹا کر دکھا دیا تھا۔ یہ اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار و رہبان' جنہوں نے خدائی احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رُو سے آئمہ کا آسرا لے کر اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہ کا سہارا پکڑ کر۔ حالانکہ نہ ان آئمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہ نے اس کی تعلیم دی تھی کہ یہ جزئیات قیامت تک غیر متبدل ہیں۔ تو پھر سلیم! کوئی تو وقت ایسا آنا چاہیئے جب امت کو اس غلط راستے سے ہٹا کر اس راستے پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہِ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقع بہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اب بھی اگر ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ حائل رہے۔ یعنی حکومت اربابِ سیاست کے اپنے تصورات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار و رہبان کے اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق' تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔ یہ خدشہ ہے سلیم! میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں ـــــ اور میرے دل کی پوشیدہ بے تابیوں کا موجب[1]۔

اس آخری ٹکڑا سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کی اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں۔ قانون کیا ہے؟ انسانوں کو ان اقدامات سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد و انتشار واقع ہو جاتے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قوموں ـــــ (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز و طرق (قوانین) وضع کئے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قتلِ عمد کی سزا (موت) انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنہیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں' تو کیا سلیم! اس سے یہ سمجھا جائیگا کہ انگریز کا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں۔ اب اس سے ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی اپنے ہاں

---

[1] اور یہاں یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ (اپریل ۱۹۵۸ء)

جرائم کی وہی سزائیں تجویز کر لیں جنہیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔ اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ فقط شرعی قوانینِ جرم و سزا کو نافذ کر دینے کا نام اسلامی نظام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانینِ شرعی نظامِ اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جس قدر مطالبات پیش ہو رہے ہیں وہ محض قوانینِ شرعی کی تنفیذ کے لئے ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کر لے تو ہمارے اربابِ شریعت مطمئن ہو جائیں گے کہ "حکومتِ خداوندی" کا قیام ہو گیا۔ لیکن ادھر سے ان قوانین کا نفاذ ہوگا اور اُدھر سے قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے لئے حیلے وضع کئے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب "باب الحیل" بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہو گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو خود اٹھا کر دیکھ لو اور پھر امام ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیلوں میں سے صرف ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤ گے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے؟ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چُرایا اور موقع پر گرفتار ہو گئے۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رُو سے چور کا ہاتھ کٹنا چاہیئے لیکن اب دیکھئے کہ یہ کس طرح اس سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے .... نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور اسے لے کر چلا، لیکن منقوب مکان میں پڑا ہوا مال 'مالِ محفوظ' نہیں کہلا سکتا اور چوری 'مالِ محفوظ' کو لے جانے کا نام ہے۔ لہٰذا مجھ پر چوری کا جرم عائد نہیں ہو سکتا۔ لیجئے دونوں چور، چوری کے جرم سے بری ہو گئے۔ اب ان پر کوئی اور فردِ جرم لگائیے۔ اس قسم کے حیلے سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں[1]۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اسی قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہٰذا محض شرعی قوانین کی تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہو سکتی۔ قلوب میں انقلاب قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام سے ہوگا۔ قرآنی ربوبیت کیا ہے؟ اسے سلیم! میں تمہیں اس

---

[1] سال بھر سے اوپر ہو گیا جب پاکستان میں شرعی سزاؤں سے متعلق قوانین نافذ ہوئے تھے۔ آج تک کسی ایک مجرم کو بھی ان کے مطابق سزا نہیں ملی۔ سزا انگریز کے قوانین کی رُو ہی سے ملی ہے۔ (اپریل ۱۹۸۰ء)

خط میں نہیں سمجھا سکتا۔ اس کے متعلق تمہیں دوسری فرصت میں لکھوں گا۔[1] لیکن وہ پھر بھی جامع اور مکمل نہیں ہوگا۔ قرآنی نظامِ ربوبیت انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا انسانی جسم کو لپٹی ہوتی ہے اور بایں نمط کہ یہ کرّۂ ہوائی اس کی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اسکی آزادیوں میں کہیں خلل انداز نہیں ہوتا۔ اس نظام کے متعلق چند الفاظ میں، یوں سمجھ لو کہ

۱۔ خارجی کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں جاری ہے۔

۲۔ اسی طرح انسان کی زندگی بھی ایک مقصد لئے ہوئے ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ اس نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

۳۔ خارجی کائنات میں ہر شے بلا اختیار و ارادہ اس مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

۴۔ لیکن انسان اپنی دنیا میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے اسے اس نصب العین کی طرف اپنے نظامِ اجتماعیہ کی رُو سے بڑھنا ہوگا۔

۵۔ اس نظامِ اجتماعیہ کا نام "الدین" یعنی اسلامی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد وحدتِ خالق، وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ مقصد پر ہے۔

۶۔ اس نظام کا اوّلین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ کی تمام انسانی صلاحیتوں کے کامل طور پر نشوونما پانے کے لئے تمام اسباب و ذرائع ہر ایک کے لئے یکساں طور پر میسّر ہوتے ہیں۔

۷۔ اس نظام کی رُو سے تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔

لہٰذا، قوانینِ تعزیرات اس نظام کا ایک جزو ہیں جو افرادِ معاشرہ کی اجتماعی زندگیوں میں بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے نافذ کئے جاتے ہیں۔

چونکہ اس وقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئے گی اس لئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں اپنے آپ کو صرف اسی نقطہ تک محدود رکھا ہے۔ اس مضمون

---

[1] میری کتاب "نظامِ ربوبیت" دیکھئے۔

کے عنوان سے اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطہ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جزو بن کر اس مقصدِ عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہیٰ آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کے لئے سلیم! ع

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ تمہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول کرسکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ بابِ رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہ تھی وہ اُلجھن جس کے لئے کہیں ہر صدی کے اخیر میں ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدیٔ آخرالزماں کا انتظار اٹھانا پڑا۔ اسی سے مدّعیانِ نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ اگرچہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت پڑتی، نہ کسی مہدی کی، نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں، نہ ان پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید و ہدایت کا سلسلہ مسلسل و متواتر قائم رہتا۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا۔ اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو اُن کے ایسے ایسے حل تجویز کئے جن سے وہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج ہی وہ امور ہوتے ہیں جن میں مقتضیاتِ زمانہ کی رُو سے ردّ و بدل ہوسکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بن جانا ہوتا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا اور اسے انسانی اجتہاد کے لئے کُھلا نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانہ کے اجتہاد کے لئے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اجتہاد انفرادی نہیں ہوگا، بلکہ ملت کے نمائندے تمام حالات پر غور و فکر کے بعد اجتہاد کریں گے اور اس سے یہ جزئیات مرتب ہوں گی۔ یہ ہے وہ طریق سلیم! جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں، ہر زمانہ کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔[1]

(1 فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یہ ہے دینِ مبین ؎

لایزال و وارداتش نَو بنَو　　برگ و بارِ محکماتش نَو بنَو

باطنِ اُو از تغیر بے غمے　　ظاهرِ اُو انقلاب ہر دمے

والسّلام

اگست ۱۹۴۸ء

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) ایک اسلامی سلطنت میں قوانین کس طرح مرتب ہوں گے۔ اس کے لئے دیکھئے ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب " اسلام میں قانون سازی کا اصول"

چھٹا خط

مغربی اور قرآنی تہذیب کا بنیادی فرق

ہاں سلیم! تم نے ٹھیک کہا. قریب چھ سال کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں. یوں تو سال بھی صبح اور شام کے مجموعے ہی کا نام ہوتا ہے. اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے "وقت" کے لامتناہی سلسلہ پر یہ نشانات حساب وشمار کی سہولت کی غرض سے لگا رکھے ہیں، جیسے گز پر گرہیں لگا دی جاتی ہیں. ان گرہوں کا وجود اعتباری ہوتا ہے، فی الواقعہ نہیں ہوتا. اسی طرح دن، مہینے، سال، وقت کے گز پر گرہیں لگی ہوئی ہیں. ان کا وجود ہمارے ذہن کا پیدا کردہ ہے. اگر کوئی آنکھ سورج سے اونچی جا کر زمین کو دیکھے تو اس کے سامنے ہر وقت دن ہی دن رہے گا، رات کبھی نہیں آئے گی. اس لئے اس کے نزدیک امروز و فردا کا امتیاز بھی باقی نہیں رہے گا. لہٰذا، جوں جوں انسان بلندیوں پر پہنچتا جائے تعینات کے پردے اُٹھتے جاتے ہیں. لیکن وقت کے اس لامتناہی دریا میں واقعات کے حباب ذہنِ انسانی پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ جاتے ہیں. ان ہی نقوش سے انسانی زندگی ترتیب پاتی ہے. گذشتہ چھ سال کے حوادث و کوائف پر ایک نگۂ بازگشت ڈالو اور پھر سوچو کہ وہ جو اس مردِ قلندر نے جسے بصیرتِ فرقانی نے مومنانہ فراست عطا کی تھی، کہا تھا کہ ؏

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

کس قدر مبنی بر حقیقت تھا. اس چھ سال کے عرصہ میں دیکھو کہ کس قدر تابناک و درخشندہ تاج ہیں جو فضا میں اڑتے دکھائی دے رہے ہیں. کیسی کیسی عظیم المرتبت سلطنتیں ہیں جو مٹی میں ملتی نظر آ رہی ہیں. کیسے کیسے بلند آہنگ دعاویٔ نمرودیت و فرعونیت ہیں جو سربخاک سامنے آ رہے ہیں. کس قدر تحیّر انگیز انقلابات ہیں جو سینما کی تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں. جو واقعات و حوادث پہلے کہیں صدیوں میں بھی

تکمیل پذیر نہ ہوا کرتے تھے، اب کس طرح دنوں بلکہ گھنٹوں میں رونما ہو جاتے ہیں. اس "عصرِ رفتار" (AGE OF SPEED) نے وقت کے پہیوں میں بھی بجلیاں بھر دی ہیں. اس چھ سال کے عرصہ کو دیکھو اور اتنے انقلابات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی. بقول تمہارے محبوب "خیامِ ہندی" کے: ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی　　(ریاضؔ)

اور پھر اس دُوربین کو آنکھوں سے الگ کر کے، ذرا اپنے قریب کی دنیا کو دیکھو. وہ "خواب" جو اُسی مردِ دانا نے جس کا ذکر ابھی ابھی وجہِ نشاطِ روح ہو چکا ہے، ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا اور جس کا استقبال ہر ایک نے ایک استحقار آمیز تبسمِ زیرلبی سے کیا تھا کہ اُن کے نزدیک یہ "شاعرانہ تخیل" اسی سلوک کا مستحق تھا. ہاں وہی "خواب" کس طرح محسوس پیکروں میں ہمارے سامنے آگیا اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ یہ "خوابِ شیریں" ہماری شامتِ اعمال سے، کس طرح اپنے ساتھ وہ "تیشۂ فرہاد" لے کر آیا جس نے ہمارے اثاثِ قومی کے ہر کاخ اور متاعِ ملّی کے ہر در و دیوار کو اس طرح تودہ خاک بنا کر رکھ دیا کَاَنْ لَّمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا. سلیم! یہ قیامتیں کہیں باہر سے ہم پر نہیں ٹوٹیں، خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تھیں (وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ). لیکن سلیم! اس حدیثِ جگر پاش و داستانِ سینہ سوز کو اس وقت نہ چھیڑو، ورنہ تمہارے سوالات کا جواب رہ جائے گا. میرے بربطِ ہستی کے ان تاروں کے قریب مضراب مت لاؤ کہ ان میں نغمے نہیں آگ بھری ہے. میں آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر دہک رہا ہوں. میرے سینۂ سوزاں کو بند ہی رہنے دو کہ اگر اسے کسی طرف سے بھی ہوا لگ گئی، تو یہ آگ شعلۂ جوالا کی طرح بھڑک اُٹھے گی. لہٰذا، سلیم! مجھے رُکنے دو کہ تمہارے شبہات کا ازالہ کر سکوں. غور سے سنو کہ بات بڑی اہم ہے.

تم پوچھتے یہ ہو کہ میں نے "وراثتِ ارض کے ابدی قانون[1]" کے سلسلہ میں "صلاحیت" اور "صالحیت" میں جو فرق بتایا ہے اس کی لِم اور تفصیل کیا ہے؟ اگرچہ تم نے وضاحت سے نہیں لکھا، لیکن اس باب میں جو شکل تمہارے سینہ میں پھانس بن کر کھٹک رہی ہے مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے. یہ خلش کچھ تم ہی سے مخصوص

---

[1] مطبوعہ "فردوسِ گم گشتہ".

نہیں۔ آج قریب قریب ساری دُنیا اسی بیچاک میں اُلجھی نظر آرہی ہے۔ تمہارے متعلق یہ امر میرے لئے ہمیشہ باعثِ اطمینان رہا ہے تم اپنی کھٹک کو بلا تامل کہہ ڈالتے ہو۔ یاد رکھو! حقیقی اطمینان اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان دل میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو واضح طور پر بیان کر دے اور جب تک وہ بالکل صاف نہ ہو جائیں، پیچھا نہ چھوڑے۔ "حقیقی اطمینان" کے الفاظ میں "حقیقی" کو خاص طور پر ملحوظ رکھو۔ اس لئے کہ "جھوٹے" اطمینان کی دنیا میں بہت سی شکلیں ہیں۔ لیکن اطمینان وہی اطمینان ہے جو حقیقی ہو اور یہی ایمان کی اساس ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھوڑی دُور پیچھے جانا پڑے گا۔

(۱) ایک شخص سنکھیا کھالیتا ہے۔ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعی زندگی ایک خاص نظام اور خاص قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس نظام اور قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) نے سنکھیے کو مہلک بتایا ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی جسم پر ایک اثر مرتب کرتا ہے جو قاطعِ زندگی ہے۔ اس لئے سنکھیا کھانے والے کی موت یقینی ہے۔ یہ قانونِ فطرت کا تقاضا ہے اور اس کا ثبوت بدیہی۔

(۲) ایک شخص گھی کھاتا ہے۔ گھی ممدِ حیات ہے اس لئے اس سے اس میں توانائی پیدا ہوتی ہے اور توانائی سے زندگی کا قیام ہے۔

(۳) ایک شخص گھی خرید کر لاتا ہے۔ دوسرا شخص چُرا کر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں پر گھی کا اثر یکساں ہوگا یا مختلف؟ قوانینِ طبیعی کا جواب صاف اور واضح ہے کہ گھی کے اثر پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گھی دونوں صورتوں میں توانائی بخش اور ممدِ حیات ثابت ہوگا۔ اس سے ہر حالت میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۴) مغرب کی مادّی (میکانکی) تہذیب چونکہ قوانینِ طبیعی سے ماوراء کسی اور نظامِ قوانین کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے اس کے نزدیک جو شے ممدِ حیات اور تقویت بخش ہے (یعنی انسان یا اس سے آگے بڑھئے تو انسانوں کے مجموعہ یعنی قوم میں زندگی کی صلاحیت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے) وہ نفع رساں ہے۔ اور چونکہ کسی شے کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار لامحالہ یہی ہے کہ وہ نفع رساں ہے یا نقصان دہ، اس لئے ذریعہ حصول کو اس فیصلہ میں کوئی دخل نہیں۔ گھی اچھی چیز ہے خواہ کسی طریق سے حاصل کیا جائے۔

(۵) تم یہ کہو گے کہ اہلِ مغرب جب چوری کو معیوب قرار دیتے ہیں اور قانون کی رُو سے جرم، تو وہ لامحالہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "چوری کا گھی" بُری چیز ہے اور "خریدا ہوا گھی" اچھی چیز۔

لیکن ہم نے ابھی ابھی اوپر دیکھا ہے کہ قوانینِ طبیعی کی رُو سے گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے خواہ وہ مسروقہ ہو یا

خرید کردہ۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ مادّی تہذیب کی رُو سے چوری کا گھی اور نتیجہ پیدا کرتا ہے اور خرید کردہ اور۔
لہٰذا، بات زیادہ سے زیادہ یوں ہوئی کہ

۱۔ گھی بہرحال، اچھی چیز ہے۔

۲۔ چوری بُری چیز ہے۔

شق (۲) یعنی "چوری بُری چیز ہے" قوانینِ طبیعی سے متعلق نہیں، ضابطۂ اخلاق (CODE OF ETHICS) سے متعلق ہے۔

لیکن جب انسان کی زندگی صرف قوانینِ طبیعی کے ماتحت ہے تو پھر یہ ضابطۂ اخلاق کیا ہے؟ زید چوری، ڈاکہ، دھوکا، فریب سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے اسلحہ خریدتا ہے۔ اپنے گرد ایک جماعت پیدا کر لیتا ہے۔ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے متوسّلین کو بھی آسائش و راحت کے سامان فراہم کر دیتا ہے۔ دوسری طرف عمر، صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے چار پیسے حاصل کرتا ہے۔ عمر بھر حسرت سے دن پورے کرتا ہے۔ زندگی بڑی تنگی سے گزارتا ہے۔ زید بھی مر جاتا ہے، عمر بھی۔ دونوں کا معاملہ (قوانینِ طبیعی کی رُو سے) ختم ہو جاتا ہے۔ ضابطۂ اخلاق کی پابندی نے عمر کو کیا دے دیا اور اس کی شکست و ریخت نے زید کا کیا بگاڑ دیا؟ لہٰذا، ضابطۂ اخلاق سے فائدہ کیا ہے؟

مغرب کا معلّمِ اخلاق یہ جواب دیتا ہے کہ ضابطۂ اخلاق سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے۔ یعنی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں (وہی ہربرٹ اسپنسر سلیم! جس کے FIRST PRINCIPLES کے کبھی تم دلدادہ ہوا کرتے تھے)۔ ہاں اسی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں، اخلاق، خوفِ انتقام (FEAR FOR REVENGE) کی پیدا کردہ چیز ہے ـــــ یعنی میں چوری اس لئے نہیں کرتا کہ ڈرتا ہوں کہ اگر اسے معیوب نہ قرار دیا گیا تو میری بھی کوئی چیز محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ میں کسی کو فریب اس لئے نہیں دیتا کہ مجھے خوف ہے کہ اگر اس پر پابندی نہ لگائی گئی تو مجھ سے زیادہ شاطر و عیّار مجھے فریب دے جائے گا۔ لہٰذا، اخلاقیات کی ذاتی طور پر کچھ قیمت نہیں۔ یہ نظامِ سوسائٹی کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کی بنیاد خوفِ انتقام۔ اور پولیس، عدالت، جیل، سب اسی جذبۂ خوف کو برقرار رکھنے کے ذرائع۔

اس کا مطلب، سلیم! یہ ہوا کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ مجھے خوفِ انتقام نہ رہے۔ یعنی میں کسی پولیس والے کے قابو نہ آ سکوں۔ اور اگر قابو آ بھی جاؤں تو عدالت پر اثر ڈال لوں یا اتنی طاقت حاصل کر لوں کہ کسی

دوسرے کو مجھ سے یارائے انتقام ہی نہ رہے تو پھر میرے لئے اخلاق کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب یورپ میں ہو کیا رہا ہے؟ وہاں اب ذہنوں کی جنگ (BATTLE OF WITS) ہو رہی ہے۔ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میں ایسا انتظام کر لوں کہ دوسرے کو دھوکا دے جاؤں، لیکن اسے پتا نہ چلے جُرم کر جاؤں، لیکن پکڑا نہ جاؤں۔

لیکن اس صورت میں پھر جُرم کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے ذرا اور آگے بڑھو۔ اگر کوئی سوسائٹی یہ فیصلہ کر دے کہ اپنے قبیلے یا اپنی قوم میں چوری کرنا، فریب دینا جرم ہے، لیکن دوسرے قبیلہ یا دوسری قوم کے ساتھ یہ سب کچھ روا ہے، تو پھر ان افعال میں جُرم کا احساس بھی نہیں رہے گا۔ قدیم رومیوں میں یہی قانون تھا کہ غیر رومیوں کے ہاں چوری کر لینا معیوب نہیں۔ اس کی تقلید یورپ کی نیشنلزم نے کی ہے۔ ہر وہ کام جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچتی ہے، حُبّ الوطنی (PATRIOTISM) کا جوہر لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا، درخورِ ستائش۔ اب وہی جنگِ عقول (BATTLE OF WITS) جو ایک قوم کے افراد میں باہمد گر تھی، مختلف اقوامِ عالم میں سرگرمِ عمل ہے۔ اب ہر قوم، دوسری اقوام کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ کرنا اس کو فقط اتنا ہوتا ہے کہ اتنی قوت فراہم کر لے کہ اسے "خوفِ انتقام" نہ رہے۔ اسی کا نام ان کے ہاں صلاحیت ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اس قوم میں ہے جو خوفِ انتقام سے مامون ہو جائے اور پھر جو کچھ جی میں آئے کرے۔

یہ ہے سلیم! ماحصل مغرب کی مادّی (یا میکانکی) تہذیب کا اور یہ ہے مفہوم صلاحیت کا۔ یعنی گھی، بہر نوع توانائی بخش ہے، خواہ خرید کر لو، خواہ چرا کر۔ اور چوری کرو تو اس اہتمام کے ساتھ کہ تمہیں خوفِ انتقام نہ رہے۔

اگر تم نے ایسا کر لیا تو ہر روز چوری کا گھی کھاؤ۔ تم میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

یہ ایک نہجِ فکر ہے۔ دوسری طرف ایک اور اسلوبِ فکر ہے۔ جس کی دعوت اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن زندگی صرف طبیعی ہی نہیں، اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ طبیعی زندگی حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن مقامِ انسانیت سطحِ حیوانیت سے ایک درجہ آگے ہے۔ انسانی زندگی کی اس خصوصیت کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ غرض نام سے نہیں، اس حقیقت سے ہے جس کا تعارف اس نام سے کرایا جائے۔ مقامِ انسانیت کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو قوانینِ طبیعی کے تابع نہیں ہے۔ اس

لئے اس کا سلسلہ بھی سانس کی آمد و رفت تک محدود نہیں۔ تارِ نفس کے ٹوٹنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہ وہ شے ہے جسے سلیم! میں شرفِ انسانیت کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ جسے حضرت علّامہ (اقبالؒ) خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جسے (SELF) یا انسانی ذات (PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ جس طرح انسان کے جسمانی قویٰ کی پرورش اور تعمیر ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے، اسی طرح اس شئے دیگر (انسانی ذات یا خودی) کی تربیت و پختگی بھی ایک خاص ضابطہ آئین کے تابع ہوتی ہے۔ اس امتیاز کے ماتحت "گھی" اور "مسروقہ" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں۔ "گھی" اپنا نتیجہ قانونِ طبیعی کے مطابق مرتّب کرتا ہے۔ "مسروقہ" اپنا نتیجہ اس دوسرے قانون کی رُو سے متشکل کرتا ہے۔ اس قانون کو "قانونِ مکافاتِ عمل" کہتے ہیں، جو جہانِ مشیّت سے متعلق ہے۔ خدا کی ذات ان دونوں نظامہائے قوانین (قوانینِ فطرت اور قوانینِ مشیّت) کی نگران ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قانونِ فطرت یہ دیکھتا ہے کہ گھی کا نتیجہ جسمِ انسان کے لئے قوت بخش ہونا چاہیئے، وہاں اس کا قانونِ مکافات اس پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ "مسروقہ" کا نتیجہ زوالِ شرفِ انسانیت یا ضعفِ خودی ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ ضوابطِ قوانین اٹل ہیں اس لئے ان کے نتائج بھی اٹل ہیں۔ قوانینِ فطرت کے مطابق عمدہ نتائج کا ماحصل صلاحیّت ہے۔ اور قوانینِ مکافات کے مطابق عملِ خیر کا ماحصل صالحیت۔ قرآن ان دونوں ضوابطِ قوانین کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صالحیت میں صلاحیّت بھی خود بخود آ جاتی ہے لیکن فکرِ مغرب کی صلاحیّت میں صالحیت نہیں آتی۔ سمجھے سلیم!

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صالحیت سے نظامِ سوسائٹی خود بخود صحیح خطوط پر قائم رہے گا۔ لہٰذا، وہ ضابطہ اخلاق جسے معلّمینِ اخلاق نے نظامِ سوسائٹی کے قیام کی خاطر وضع (یا اختیار) کیا تھا، اس نظامِ مکافاتِ عمل کا ایک طبیعی نتیجہ (NATURAL COROLLARY) ہو گیا، مقصود بالذات نہ رہا۔ قرآن کا نظام انسانی معاشرہ کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے اور انسانی خودی کو ارتقائے شرفِ انسانیت کی منازل طے کراتا ہوا اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا، نظامِ سوسائٹی کا قیام، اس سفر میں سنگِ میل یا چراغِ راہ بن کر رہ جاتا ہے۔ منزلِ مقصود اس سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ یعنی یہ اُس "تجارتِ عظمیٰ" کا محض (BY PRODUCT) ہوتا ہے[1]۔

---

[1] اس مقام پر سلیم! ایک اور چیز کی طرف بھی غور کرتے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ قرآنی اوامر و نواہی کی حقانیت پر بحث کی

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سوسائٹی کا نظام، ہر ایسے ضابطہ کی رُو سے چل سکتا ہے جسے افرادِ سوسائٹی متفقہ طور پر تسلیم کرلیں۔ اس لئے اس نظام کو چلانے والے ضابطہ کی کوئی مستقل ذاتی قدر (INTRINSIC VALUE) نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی سوسائٹی متفقہ طور پر طے کرلے کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے لئے مناکحت کی ضرورت نہیں' یہ خالص طبیعی جذبہ ہے جس کی تسکین باہمی رضامندی سے ہر جگہ کی جاسکتی ہے۔ باقی رہے اس تسکینِ جذبات کے نتائج (یعنی اولاد) تو ان کی پرورش و تربیت کا انتظام خود سوسائٹی (حکومت) کی طرف سے ہوجائے گا' تو ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کا یہ نظام بھی چل جائے گا۔ اس صورت میں' اس سوسائٹی کے ضابطۂ اخلاق میں زنا کا لفظ تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض نظامِ سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لئے جو ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے گا اس کی ذاتی حیثیت (INRINSTC VALUE) کچھ نہیں ہوگی۔ اگر ایک وقت میں مناکحت' اخلاقِ حسنہ کا جزو قرار پائے گی تو دوسرے وقت بے باکانہ تسکینِ جذبات یہی حیثیت اختیار کرلے گی۔ مثال کے طور پر آج دنیائے اقتصادیات میں ربٰو (سود) کو نظامِ سوسائٹی نے متفقہ طور پر جائز تسلیم کرلیا ہے' لہٰذا' یہ نہ ان کے ضابطۂ اخلاق کی رُو سے معیوب ہے نہ کسی قانون کی رو سے جرم۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فکرِ مغرب کی رُو سے ربٰو (سود) فی ذاتہٖ معیوب ہے نہ مستحسن۔ اگر سوسائٹی اپنے نظام کے قیام کے لئے اسے متفقہ طور پر معیوب قرار دیدے تو یہ معیوب ہوجائے گا اور اگر متفقہ طور پر اسے اختیار کرلے تو یہ مستحسن قرار پاجائے گا۔ (جس طرح یورپ میں بائیں طرف چلنا قانونِ راہ روی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا)۔ لہٰذا' مغربی نہجِ فکر کے مطابق ضوابطِ اخلاق کے اجزا' اپنی

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) جاتی ہے تو ساری قوت اس پر صرف کی جاتی ہے کہ ان قوانین کی پابندی سے سوسائٹی کا نظام بہترین انداز سے چل سکتا ہے اور مقطع میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے بہتر نظام سوسائٹی مرتب ہی نہیں ہوسکتا۔ گویا نظامِ قرآنی سے مقصود' سوسائٹی کے نظام کو بہترین خطوط پر متشکل کرنا ہے اور بس۔ یعنی جو چیز اس نظام کی محض (BY PRODUCT) ہے' ان کے نزدیک وہ اصل مقصود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس نظام میں سوسائٹی کا نظام بہترین خطوط پر متشکل ہوجاتا ہے' لیکن اس نظام کا منتہیٰ نہیں۔ یہ نظام' انسان میں وہ صلاحیت پیدا کرتا ہے جس سے یہ شرفِ انسانیت کی بلند منازل طے ہوا' اپنے اندر اس زندگی سے اگلی زندگی کی سرفرازیوں کی استعداد پیدا کرلیتا ہے۔ یہ ہے اس نظام کا مقصود۔ اس لئے قرآنی نظام کو ہمیشہ اسی حیثیت سے دیکھنا اور اسی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے۔ اس سے تم یہ بھی سمجھ گئے ہوگے کہ ایمان بالآخرت کا مفہوم اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

مستقل حیثیت کچھ نہیں رکھتے۔ جس چیز کو معاشرہ متفقہ طور پر اختیار کرلے وہ مستحسن (اور جو اس کے خلاف کرے وہ مجرم) اور جس شے کو وہ متفقہ طور پر ردّ کرے وہ معیوب (اور اس سے اجتناب کرنے والا شریف) لیکن ضابطۂ قانونِ مکافات کی رُو سے ہر چیز اپنی ایک مستقل قدر (VALUE) رکھتی ہے۔ جس طرح عالمِ طبیعی میں اشیاء کے خواص، انسانوں کے فیصلوں کی رُو سے تبدیل نہیں ہوتے، اسی طرح عالمِ مشیت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) میں بھی "اشیاء" کے خواص انسانوں کے فیصلوں کی رُو سے نہیں بدلتے۔ مثلاً سنکھیا قاطع حیات ہے۔ اگر تمام دنیا کے انسان مل کر یہ فیصلہ کرلیں کہ آج سے ہم سنکھیا کو ممدِ حیات سمجھیں گے تو اس فیصلہ سے سنکھیا پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ وہ حق ہے (یعنی اپنی خاصیت میں اٹل) اس لئے وہ "اکثریت" کی رائے کے تابع نہیں چلتا۔ اسی طرح ربٰو (یا مثلاً جھوٹ) قاطعِ شرفِ انسانیت ہے۔ اگر ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی فیصلہ کردیں کہ آج سے ہم ربٰو (یا جھوٹ) کو ممدِ نظامِ سوسائٹی قرار دے دیں گے تو وہ اپنی تاثیر کو نہیں بدل دیگا۔ اس لئے کہ اس کا قاطعِ شرفِ انسانیت ہونا بھی حق ہے اور حق انسانوں کے فیصلوں کے تابع نہیں چلا کرتا، وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط (۲۳/۷۱) (اگر حق لوگوں کے خیالات کے تابع چلنے لگ جائے تو تمام کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہوجائے) پھر جس طرح سنکھیا کو اپنی تاثیر مرتب کرنے کے لئے ایک مستقل نظامِ طبیعی کی ضرورت ہے یعنی جسمانی نظام میں نہ معلوم کیسے کیسے عظیم اور لطیف تغیرات رونما ہوتے ہیں، تب کہیں جاکر سنکھیا کی سمیت منتج بہ ہلاکت ہوتی ہے یا گھی جسمانی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کو اپنا ہلاکت انگیز یا صداقت کو انسانیت پرور، نتیجہ مرتب کرنے کے لئے بھی ایک عظیم الشان نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہے کہ اس میں نگاہ کی خفیف سی جنبش اور دل کی ہلکی سی لرزش تک بھی بلانتیجہ نہیں رہ سکتی، فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ع (۹۹/۷-۸) اسی حقیقتِ غیر متبدلہ کا اعتراف "اللہ کا ایمان" کہلاتا ہے۔ مغرب کے علمائے فطرت، نظامِ قوانینِ طبیعی کو اٹل مانتے ہیں۔ لیکن وہ اسے بالعموم اندھی فطرت کا میکانکی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک بلند و بالا ہستی کا چلایا ہوا ہے اور اس طرح وہ خدا کی ہستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن سلیم! غور کرو کہ خدا پر اس قسم کے ایمان کا کچھ نتیجہ بھی ہوتا ہے؟ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ چاند، سورج، ستارے، زمین سب اتفاقی طور پر گردش کے سلسلۂ طبیعی میں جکڑے ہوئے ہیں اور میکانکی عمل سے رواں دواں ہیں۔

اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں، انہیں خدا نے بنایا ہے اور یہ اسی کے قائم کردہ نظام کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ کہئے کہ جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے، اوّل الذکر کے انکار سے کیا نقصان ہوتا ہے جو ثانی الذکر کے اقرار سے پورا ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ثانی الذکر نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے، لیکن وہ بات سلیم! اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس اقرارِ حقیقت سے دنیائے انسانیت میں کیا فرق پڑتا ہے؟ خدا پر حقیقی ایمان شروع ہی اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی عمل اور کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اور نہ کبھی غلط نتیجہ ہی مرتب کر سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ اگر تو ان سے پوچھے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے۔ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ یہ اقرار کریں گے کہ اللہ نے۔ یعنی وہی ایمان جو مغرب کے علمائے فطرت میں سے خدا کو ماننے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس اعتراف کے باوجود یہ اُلٹی اُلٹی راہیں چلتے ہیں۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۲۹/۶۱) یہ اس لئے کہ ان کا ایمان فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر ہوتا ہے، نظامِ مکافاتِ عمل کے خدا پر نہیں ہوتا۔

لہٰذا، مغرب کی میکانکی تہذیب میں:-

۱۔ یا تو خدا کی ہستی سے کلیتہً انکار ہوتا ہے۔

۲۔ اور اگر کہیں اقرار بھی ہوتا ہے تو فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر۔

۳۔ اس کے بعد وہ نظامِ معاشرت (سوسائٹی کے قیام کے لئے خود قاعدے مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی کو ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں جس کی حیثیت فقط اتنی ہوتی ہے کہ انسانوں نے متفقہ طور پر اس ضابطہ کو اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ جیسے یورپ میں سڑک کے بائیں طرف چلنا قانونِ راہروی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا۔

(۴) اور ان ضوابط پر پابندی کا محرک جذبۂ خوفِ انتقام یا مواخذۂ قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس خوف سے مامونیت کا انتظام کر لے تو پھر اسے اس پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔

۵۔ اس نظام کی پابندی سے جماعتی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو تسخیرِ قوائے فطرت کے ساتھ مل کر اس قوم میں طبیعی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

۶۔ اور چونکہ زندگی ان کے نزدیک فقط یہی طبیعی زندگی ہے، اس لئے جس طریق سے یہ صلاحیت حاصل ہو جائے وہی طریق مستحسن قرار پا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، اس دوسری تہذیب کی رُو سے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ۱۔

۱۔ نظامِ طبیعی کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے جسے نظامِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس نظام میں ہر عمل کا ایک نتیجہ متعین ہوتا ہے اور کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اعمال کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جس سے شرفِ انسانیّت (انسانی خودی) کی نشوونما اور بالیدگی و برومندی ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس سے اس میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ نظامِ طبیعی کی پابندیوں سے طبیعی زندگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور نظامِ مکافاتِ عمل کے اتباع سے انسانی زندگی (ذات) میں صالحیت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ "صالحیت" میں "صلاحیّت" خود بخود آجاتی ہے، لیکن صرف "صلاحیّت" میں "صالحیت" نہیں آسکتی۔

اس سے سلیم! ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ

(۱) مغرب کے میکانکی نظام میں طبیعی زندگی کی صلاحیّت مقصود ہے۔

(۲) قرآن کے نظامِ ایمان عمل میں طبیعی زندگی کی صلاحیّت کے ساتھ ماورائے حیاتِ طبیعی کی صالحیّت بھی آجاتی ہے۔ اور

(۳) "عجمی اسلام" کے نظامِ تنویم میں نہ صلاحیّت ہوتی ہے، نہ صالحیت: خَسِرَ الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ۝ (۲۲/۱۱)۔

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

کیوں سلیم! ملا جواب تمہارے سوال کا؟ سمجھ گئے فرق صلاحیّت اور صالحیت میں؟ اب آگیا تمہارے ذہن میں کہ جو وراثتِ ارضِ خدا کی طرف سے ملتی ہے، وہ مشروط بہ صالحیت ہوتی ہے۔ لیکن جو حکومت و سلطنت فقط صلاحیّت (مادّی قوت) کا نتیجہ ہوتی ہے، وہ ابلیسی نظام کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ اور جس میں نہ وہ ملتی ہے نہ یہ، وہ "عجمی اسلام" ہے جسے مذہب کہتے ہیں (اسلام دین ہے، مذہب نہیں)۔

میں نے سلیم! اس خط میں دانستہ اس بات کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ

(۱) طبیعی زندگی کے علاوہ انسانی زندگی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

(۲) قوانینِ فطرت کے علاوہ قوانینِ مکافاتِ عمل بھی ہیں۔

(۳) ان قوانین کی رُو سے اعمال کے نتائج متعین اور ان کی اقدار (VALUES) مستقل ہیں. میں ان چیزوں کو مسلّمہ حقیقت کے طور پر بیان کر گیا ہوں، علمی طور پر انہیں پیش نہیں کیا. میں نے اس وقت دانستہ اس بحث کو نہیں چھیڑا، اس لئے کہ اس سے بات تمہارے سوال سے بہت دُور نکل جاتی. تم جانتے ہو کہ میں نے ان چیزوں کو محض عقیدۃً نہیں مان رکھا، علیٰ وجہ البصیرت مانا ہے. اس لئے علیٰ وجہ البصیرت سمجھا بھی سکتا ہوں. لیکن اسے کسی دوسری فرصت پر اُٹھا رکھو. سردست اگر تم ان ہی باتوں کو اچھی طرح سمجھ لو جو اس خط میں سامنے آگئی ہیں، تو مجھے امید ہے اس سے تمہارے بہت سے الجھاؤ دُور ہو جائیں گے. اُمید اس لئے ہے کہ تمہارا قلب سلیم ہے اور سعادت و ہدایت کی راہیں اسی کے لئے کشادہ ہوتی ہیں: مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶/۸۹) جو اللہ کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے. مرحوم نے سلیم! تمہارا نام بھی کس قدر تمہاری قلبی خصوصیت کے عین مطابق رکھا تھا. تم بڑے ہی خوش بخت ہو. اچھا. خدا حافظ.

والسّلام

مئی ۱۹۴۸ء

ساتواں خط

کیا انسانی زندگی محض آب و گل کا کھیل ہے

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا سلیم! کہ تم صبر نہیں کر سکو گے اور ضرور پوچھ کر رہو گے؟ تمہاری اس "بیتابی تمنا" پر مجھے رہ رہ کر وہ ماجرا یاد آجاتا ہے جو "خدا کے ایک بندے" (جنہیں عام طور پر خواجہ خضر کہا جاتا ہے) اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان گزرا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اُس "اللہ کے بندے" سے کہا کہ میں تمہارا رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں تو اس نے کہا تھا کہ تم چلنے کو تو میرے ساتھ چلے چلو، لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ٥ (۱۸/۶۷) "تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے" اور یہ کہہ کر اس کی وجہ بھی بتا دی کہ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ٥ (۱۸/۶۸) تمہارا جی چاہے گا کہ ہر وہ بات جس کی تمہیں خبر نہیں تمہیں بتا دی جائے۔ اس خواہش کا روکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ جو نئی بات اس کے سامنے آئے اسے اس کی کنہ و حقیقت کا علم ہو جائے۔ انسان کا یہ ذوقِ تجسس ہی تو ہے جو اسے اس طرح صحراؤں اور سمندروں، میدانوں اور پہاڑوں میں لئے لئے پھرتا ہے۔ حصولِ علم کا سارا راز تسکین استعجاب STAISFACTION OF CURIOSITY) میں ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو بچوں کو ہمہ تن استفسار بنائے رکھتا ہے۔ "یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟" (یہ۔ کیوں کا مرحلہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں بڑے بوڑھے جھنجلا اٹھتے ہیں)۔ یہی تھی انسان کی، عروسِ حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کی وہ بے پناہ خواہش جس کی طرف اس "اللہ کے بندے" نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ٥ (۱۸/۶۸)۔ حضرت موسیٰؑ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (۱۸/۶۹) اگر اللہ نے چاہا تو تُو دیکھ لے گا کہ میں کس طرح خاموش رہتا ہوں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ خود اس آتشِ شوق کی غمازی کر رہا تھا جو تلاشِ حقیقت کے لئے ان کے سینے میں موجزن تھی۔ چنانچہ پہلے ہی قدم پر اپنا وعدہ بھول گئے اور بے اختیار

چلا اُٹھے کہ تو نے یہ کیا کیا۔ وہ مردِ بزرگ مسکرائے اور کہا کہ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (۱۸/۷۲) کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ تم سے نہیں رہا جائے گا۔ اِدراکِ حقیقت کی خلش نہیں بے قابو کر دے گی۔ تم سے ضبط نہیں ہو سکے گا۔ یہ کام بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بالخصوص "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کے لئے تو اس قسم کا ضبط ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔ تلاشِ حقیقت کا یہی والہانہ جذبہ تھا جسے قرآن نے دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا جب کہا کہ

وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی (۹۳/۷)

یعنی ہم نے تجھے (اے رسولؐ!) تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔ یہی تھی وہ کیفیت جسے کارلائل نے ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے۔

شروع ہی سے، چلتے پھرتے، آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز کو نصب العینِ حیات بنانا چاہیئے؟

مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔
چرخ چنبری اور اس کے درخشندہ ستارے بھی خاموش تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔
ان سوالات کا جواب ملتا تھا انسان کی اپنی ذات اور خدا کی اس وحی سے جو اُس ذات کو اپنا مہبط بنا لے[1]۔

(HEROES AND HERO WORSHIP)

اس لئے تمہارے اس استفسار پر مجھے حیرت نہیں ہوئی، البتہ ذرا سا تأمل ضرور ہوا۔ وہ اس لئے کہ سوال ہے بڑا صبر طلب اور تم ہو بیتابِ تمنا۔ لہٰذا، میری مشکل یہ ہے کہ ؎

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معراجِ انسانیت"، باب "وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی"۔

دل کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک[1]

تم پوچھتے ہو کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انسان کی زندگی، یہی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے. اور ثبوت چاہتے ہو اس قسم کا کہ تمہیں جناح ہسپتال کے اپریشن تھیٹر میں لے جا کر بتا دوں کہ وہ دیکھو! جس مریض کا سینہ چیرا گیا ہے، اس کے دل کے پاس اُس تھیلی میں وہ چیز رکھی ہے جسے لوگ رُوح کہتے ہیں اور جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے. اس قسم کا ثبوت تو میرے بس کی بات نہیں. البتہ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ تم مغربی اساتذۂ سائنس و فلسفہ کے اقوال کو سند تسلیم کر لیتے ہو، اس لئے میں اتنا تو کر سکتا ہوں کہ تمہیں یہ بتا دوں کہ اس باب میں وہ کیا کہتے ہیں. اس کے بعد تمہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں خود بخود آسانی ہو جائے گی کہ اس ضمن میں قرآن کیا کہتا ہے.

انسانی زندگی کے متعلق ایک تصور تو وہ ہے جسے عام طور پر میکانکی نظریۂ حیات (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا موجد یونانی فلاسفر دیمقریطس قرار دیا جاتا ہے. اگرچہ اس نظریہ کی تفاصیل میں، دیمقریطس کے زمانے سے لے کر آج تک بڑے بڑے اہم اختلافات پیدا ہوئے ہیں لیکن اس کا ماحصل وہی ہے جسے اقبالؒ نے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سمو دیا ہے یعنی

در نگاہش آدمی آب و گِل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

اس نظریہ کی رُو سے مانا یہ جاتا ہے کہ انسان بس اسی آب و گل کا پیکر ہے. مٹی کا گھروندا جو طبیعی حادثہ کی ایک ٹھوکر سے خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے. نہ اس کا کوئی مستقبل ہے، نہ کاروانِ زندگی کی کوئی منزل. یہی وہ تصور ہے جسے چکبست نے اپنے اس مشہور شعر میں (جسے تم کئی مرتبہ سُن چکے ہو) یوں بیان کیا ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ اُنہی اجزا کا پریشاں ہونا

یعنی مختلف عناصر PHYSICAL ELEMENTS میں کسی نہ کسی طرح، محض اتفاقی طور پر، ایک خاص ترتیب

---

[1] غالبؔ ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

پیدا ہوگئی جس سے بے جان مادّہ جاندار بن گیا. جب تک یہ ترتیب قائم رہتی ہے' انسان زندہ کہلاتا ہے.
جب کسی حادثے سے (وہ ہنگامی ہو یا بتدریج واقع ہو جائے) یہ ترتیب درہم برہم ہو جاتی ہے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے. انسان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا. وہ تھی زندگی کی نمود' یہ ہے اس کا انجام. اللہ اللہ خیر سلاّ.
اس تصوّرِ حیات کے تحت' سلیم! ان لوگوں کے نزدیک زندگی کے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور انسان بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چار دن کی زندگی ہے. کھاؤ' پیو' مزے اڑاؤ (EAT, DRINK AND BE MERRY) انسانی زندگی کے تقاضے ہیں. عیش و آرام کی زندگی ہی مقصودِ حیات ہے. اس قسم کی زندگی کے لئے دولت کی ضرورت ہے. جو شخص دولت حاصل کر لیتا ہے (خواہ کسی طریقے سے ہو) اس کے ہاں سامانِ زیست کی فراوانی ہو جاتی ہے. وہ جسم کے...... تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سب کچھ خرید سکتا ہے. اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی کہا جاتا ہے. ناکام وہ ہے جو دولت حاصل نہ کر سکے. جو عیش و عشرت کے سامان مہیا نہ کر سکے. اس انداز کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ اُن ضوابط کی پابندی ضروری ہوتی ہے جو سوسائٹی نے متعین کر رکھے ہوں. لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ سوسائٹی کی گرفت میں نہ آسکے تو اسے ان قواعدُ ضوابط کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی. تم گل نواز خاں سے واقف ہو. وہ تمہارے محلّے ہی میں تو رہتا تھا. ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ بڑے بڑے چوروں کا سربراہ ہے. اس کا گزارہ ہی "چار سو بیس" پر تھا. لیکن چونکہ وہ پولیس کو اپنے ساتھ ملائے رکھتا تھا اس لئے وہ ساری عمر ٹھاٹے سے رہا اور اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر مرا. اور ایک گل نواز خاں ہی پر کیا موقوف ہے' ہمارے معاشرے میں قدم قدم پر اس قسم کے گل نواز ملتے ہیں. کوٹھیاں ہیں. موٹریں ہیں. نوکر چاکر ہیں. وسیع و عریض دستر خوان ہے. افسروں سے یارانہ ہے. پارٹیوں اور رشوتوں کے زور پر ہر جگہ عزّت حاصل ہے. یہی زندگی کی کامیابی ہے. اس کے بعد موت آجاتی ہے (جس سے کسی کو بھی مفر نہیں). جسم کی طبعی مشینری چلتے چلتے رُک جاتی ہے. کچھ دنوں کے بعد خود جسم بھی گل سڑ جاتا ہے. قصّہ ختم ہو جاتا ہے. اس نظریہ کے ماتحت سلیم! زندگی کی کوئی اور شکل سامنے آہی نہیں سکتی. ایک شخص جھوٹ' فریب' مکر' دغابازی' بدمعاشی' چالاکی' عیاری سے دولت کماتا' عیش اڑاتا اور اس کے بعد مر جاتا ہے. دوسرا شخص عمر بھر دیانت داری کی زندگی بسر کرتا ہے. بھوکوں مرتا ہے. فاقے کاٹتا

ہے۔ تنگ حال رہتا ہے اور اسی عسرت کی حالت میں اسے موت آجاتی ہے۔ میکانکی نظریۂ حیات کے مطابق، مرنے کے بعد دونوں کا معاملہ برابر ہے۔ یعنی دونوں ختم ہوجاتے ہیں۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اس دیانندار کی اصول پرستی نے اسے کیا دے دیا جس سے وہ بدمعاش محروم رہا؟ اس کے برعکس، اس بدمعاش کی عیاریوں نے اسے یقیناً وہ کچھ دے دیا جس سے اُس دیانت دار کی اصول پرستی نے اُسے محروم رکھا یعنی دھن، دولت، عیش آرام، ناز و نعمت، ہر چیز سے محروم رکھا۔ لہٰذا، سلیم! اگر زندگی اس جسم کی زندگی ہے اور اس کے بعد یکسر خاتمہ ہے تو پھر اصول و اخلاق کے لئے دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں صرف سوسائٹی کے قوانین و ضوابط کا سوال باقی رہ جاتا ہے اور جو شخص ان قوانین سے بچ نکلنے کی تدبیر کرسکتا ہے اس کے لئے یہ ضوابط بھی کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اس لئے سلیم! تمہارا یہ سوال کہ انسانی زندگی اسی جسم تک محدود ہے یا اس سے الگ کچھ اور بھی ہے محض نظری سوال (ACADEMIC QUESTION) نہیں۔ اس کا زندگی کے مسائل سے بڑا بنیادی تعلق ہے۔

لہٰذا، سوال یہ ہے کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے یا اس کے ماورا کچھ اور بھی۔ موت، انسان کا خاتمہ کردیتی ہے یا انسان میں کچھ ایسا بھی ہے جو موت سے ختم نہیں ہوجاتا۔

تم نے سلیم! کالج میں (KATABOLISM: ANABOLISM) اور (METABOLISM) کے متعلق پڑھا تھا۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کے کثیر التعداد خلیات (CELLS) ہر وقت ضائع ہوتے رہتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ فنا دتجدید مسلسل جاری رہتا ہے تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم تمام کا تمام ایک نئے جسم میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کچھ سمجھے سلیم کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سلیم جو کالج میں پڑھتا تھا مدت کا ختم ہولیا! اور اب ایک بالکل نیا سلیم ہے جو مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھتا رہتا ہے۔ بالکل نیا سلیم۔ اس سلیم میں اُس سلیم کا ایک ذرّہ بھی باقی نہیں۔ کیسا تحیّر انگیز ہے یہ انکشاف سلیم! کہ وہ سلیم جو دس برس پہلے ہمارے ہاں آیا کرتا تھا، اس کا کہیں نام و نشان تک باقی نہیں۔ اگر سلیم! کہیں طاہرہ کو اس کا پتا چل جائے کہ تم وہ سلیم نہیں ہو جس سے اس نے شادی کی تھی، تو سوچو کہ اس کی حالت کیا ہوجائے! اور اگر تمہاری امی کو اس کا علم ہوجائے کہ جس سلیم کو اُس نے دودھ پلایا تھا، وہ سلیم کوئی اور تھا، تو اس کے دل پر کیا گزرے؟ لیکن سلیم! نہ تو طاہرہ اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگی کہ تم وہ سلیم نہیں ہو اور نہ ہی تمہاری امی۔ وہ تو ایک طرف رہیں، تم خود بھی اسے تسلیم کرنے پر کب آمادہ ہو کہ تم وہ نہیں ہو

جو دس سال پہلے تھے۔ تم نے دس سال پہلے جو قول و اقرار طاہرہ سے کئے تھے تم آج بھی اسی طرح محسوس کر رہے ہو کہ وہ تم ہی نے کئے تھے جب تم کہتے ہو کہ میں نے امّی جان سے یہ کہا تھا تو تم ایک ثانیہ کے لئے بھی محسوس نہیں کرتے کہ وہ کہنے والا کوئی اور تھا اور تم کوئی اور ہو۔ زندگی کے وہ چند لمحات جن میں کبھی جنّت کی بہاریں مسکرائی ہوں، ان کی یاد آج بھی تمہارے دل میں وہی شادابیاں پیدا کر دیتی ہے جو اُس وقت وجۂ شگفتگی ہوئی تھیں جب برسوں پہلے وہ واقعہ ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح وہ غم آلود حوادث جن سے کبھی دل میں ٹیس اُٹھی تھی، ان کا تصوّر آج بھی اسی طرح پلکوں کو نم آلود کر دیتا ہے حالانکہ طبیعیاتی طور پر (PHYSICALLY) آج نہ وہ "دل" ہے جو اس وقت تھا اور نہ ہی وہ پلکیں۔ سلیم! سوچو کہ جسم کے ایک ایک ذرّے کے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی، وہ کیا چیز ہے جو بدستور اسی طرح قائم رہتی ہے اور جس میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر انسان نام ہے فقط اس جسم کا (جو ہر آن بدلتا رہتا ہے اور جس کا کوئی حصّہ بھی کچھ عرصے کے بعد باقی نہیں رہتا اور بالکل ایک دوسرے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے) تو اس کے اندر یہ نہ بدلنے والا عنصر کیا ہے جس کے احساس سے انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیوں کر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

اور جس کے بدلنے کی بعض اوقات اس شدّت سے دعائیں مانگی جاتی ہیں کہ ؎

بدل دے اور دِل اس دِل کے بدلے
الٰہی! تُو تو ربّ العالمین ہے

اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ جب تم کہتے ہو کہ "میں" نے یہ کہا تھا، تو اس "میں" سے مراد تمہارا جسم نہیں ہوتا۔ اس سے الگ کچھ اور ہوتا ہے۔ یہی وہ میں I ہے جسے انسانی ذات (PERSONALITY) یا نفس (SELF) یا انا یا (اقبالؒ کے الفاظ میں) خودی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ انا (میں) ہے جس کے متعلق باردیو (BERDYEAV) کہتا ہے۔

(PERSONALITY IS CHANGELESSNESS INCHANGE)

تغیّر میں ثبات، یہ ہے انسانی ذات۔ یہ قول درحقیقت برگسان کے ان الفاظ کی تشریح ہے جن میں اس نے کہا ہے کہ (WE CHANGE WITHOUT CEASING)

یعنی "ہم میں تغیّر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر"۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ تغیّر (CHANGE) سے مفہوم یہ

ہے کہ جس چیز میں تغیر آتا ہے وہ باقی نہیں رہتی' معدوم ہو جاتی ہے ________ اس کے بعد اس کی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔ لیکن' برگسان کہتا ہے کہ انسانی ذات ایک ایسی شے ہے جس کی وجہ سے ہم تغیرات سے پیہم گزرنے کے باوجود معدوم نہیں ہوتے۔" میں" ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ فنا نہیں ہوتی۔ یہی وہ تغیر ناآشنا' مستقل' غیر متبدل شے ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ "کوئی فلسفہ بھی ہو اسے تشخص ذات کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ رکھنا ہی پڑے گا۔ اسی اعتبار سے' انسانی زندگی میں پیدائش سے موت تک' وحدت رہتی ہے۔" یہی وہ نہ بدلنے والی وحدت ہے جس پر اخلاقیات کی ساری عمارت قائم ہے۔ راشڈل کے الفاظ میں:-

> اخلاقی نظام کا دارو مدار ہی اس مسلّمہ پر ہے کہ "میں" اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں اس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد "میں" وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں' میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرار نہیں پاتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔[1]

اور نہ ہی کسی مجرم کو سزا دی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ جس شخص نے جرم کیا تھا اگر وہ آج باقی نہیں' تو اُس کے جُرم کی سزا اس دوسرے شخص کو کیوں دی جائے' جس کا اگرچہ نام وہی ہے لیکن جو درحقیقت مدت ہوئی' ختم ہو چکا ہے۔

اس مقام پر تم کہو گے سلیم! کہ جس چیز کا نام ہم نے انسانی ذات یا انا (میں) رکھا ہے وہ درحقیقت اس کا حافظہ (MEMORY) ہے۔ اگر کسی کا حافظہ خراب ہو جائے تو اسے ماضی کے تمام واقعات و حوادث بھول جاتے ہیں۔ اسے قطعاً یاد نہیں رہتا کہ اس نے پچھلے سال کیا کہا تھا اور گذشتہ ماہ کیا وعدہ کیا تھا۔ حتّٰی کہ ایسے حوادث (ACCIDENTS) بھی پیش آتے ہیں جن میں انسان کا حافظہ یکسر معدوم ہو جاتا ہے اور اسے اپنے ماضی (PAST) کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ وہ اپنا نام تک بھول جاتا ہے۔ مکان تک کا پتا نہیں دے سکتا۔ بیوی بچوں تک کو نہیں پہچانتا۔ اس کا وہ پرانا "میں" بالکل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئے "میں" کی

---

[1] ان تمام اقتباسات کے حوالے پرویز صاحب کی کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملیں گے۔

ابتداء ہوتی ہے۔ لہٰذا، انسانی ذات یا انا کوئی شے نہیں۔ یہ صرف انسانی حافظہ ہے اور چونکہ حافظہ مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے موت کے بعد انسان کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن بادنیٰ تعمق اس کی اصلیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی ذات (یا میں) اپنے تمام فیصلوں کو جسم کے ذریعے بروئے کار لاتی ہے۔ جب میں فیصلہ کرتا ہوں کہ کسی چیز کو اٹھاؤں تو میرا ہاتھ اس فیصلے کو بروئے کار لاتا ہے۔ جب میں ارادہ کرتا ہوں کہ اُٹھ کر باہر جاؤں تو میرے پاؤں اس ارادے کی تکمیل کرتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ فالج سے میرے ہاتھ یا پاؤں کی حرکت بند ہو جائے تو پھر اس "میں" کا کوئی فیصلہ بروئے کار نہیں آتا۔ نہ میں اس چیز کو اٹھا سکتا ہوں جسے اٹھانا چاہوں، نہ وہاں جا سکتا ہوں جہاں جانے کا ارادہ کروں۔ اس سے تم کیا سمجھو کہ سلیم! کیا یہ سمجھو گے کہ "میں" کوئی چیز نہ تھی، یہ درحقیقت ہاتھ پاؤں کی حرکت کا نام تھا؛ جب یہ حرکت بند ہو گئی تو میں بھی ختم ہو گئی۔ (اسی طرح جب سارے جسم کی حرکت بند ہو جائے گی تو "میں" کلیتہً ختم ہو جائے گی؟) میرا خیال ہے کہ تم ایسا کبھی نہیں کہو گے۔ تم یہی کہو گے کہ "میں" کے فیصلوں کے بروئے کار لانے کے جو ذرائع تھے (ہاتھ پاؤں) ان میں خرابی آ گئی ہے۔ "میں" بدستور موجود ہے۔

اب اسی مثال کو ذرا آگے بڑھاؤ۔ انسانی دماغ (BRAIN) وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے احساسات کے نقوش کو حسبِ ضرورت سطح سے اوپر لاتی ہے۔ جب دماغ پر کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، تو اس کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے اور انسانی ذات کے احساسات کے نقوش، اس شدت سے سطح پر نہیں آتے جس شدت سے پہلے آتے تھے۔ اس کا نام ہماری اصطلاح میں "حافظہ کی کمزوری" ہے۔ بعینہٖ جس طرح ہاتھ کے اعصاب کی کمزوری سے ہم اس چیز کو اٹھا نہیں سکتے جسے ہم اٹھانا چاہیں (یا جسے ہم پہلے اٹھا سکتے تھے)۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی حادثہ سے دماغ مفلوج ہو جائے تو قطعاً اس قابل نہیں رہتا کہ انسانی ذات کے کسی احساس کو بھی بروئے سطح لا سکے۔ اس کا نام ماضی کے حادثے کا گم ہو جانا ہے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا سلیم! کہ دماغ، ایک ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے بعض مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ دماغ خود انسانی ذات نہیں۔ اس لئے دماغ کے خراب ہو جانے یا موت سے بیکار ہو جانے سے یہ مطلب نہیں کہ انسانی ذات بھی ختم ہو گئی۔ تمہیں یاد ہے سلیم! گذشتہ گرمیوں میں جب تم ایک شام ریڈیو کے پروگرام سننے میں جذب تھے تو یکایک ریڈیو سے آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ تمہیں اضطراب تھا کہ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹنگ بند

ہوگیا یا تمہارے سیٹ (SET) میں کوئی خرابی آگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ سیٹ ہی میں خرابی آگئی تھی۔ اس وقت ایتھر کی لہریں بدستور تمہارے کمرے میں موجود تھیں۔ ان لہروں میں ریڈیو اسٹیشن سے نشر شدہ پروگرام بھی بدستور موجود تھا۔ لیکن تمہارے لئے ان لہروں کا اور ان کے بردوش پروگرام کا عدم اور وجود برابر تھا۔ تم محسوس تک نہیں کر سکتے تھے کہ وہ لہریں اور وہ پروگرام کہیں موجود بھی ہے۔ اب سوچو کہ اگر کوئی شخص، سیٹ کی خرابی سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ریڈیو کی لہریں معدوم ہوگئی ہیں تو اس کا خیال کس قدر غلط ہوگا۔ اسی سے یہ قیاس کر لو کہ دماغ وہ ریڈیو سیٹ ہے جس کے ذریعے انسانی ذات اپنے احساسات و تاثرات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اگر کبھی دماغ خراب ہوجائے تو انسانی ذات کے احساسات و تاثرات تو بدستور موجود ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کے اظہار کا ذریعہ بیکار ہوچکا ہوتا ہے اس لئے ہم ان تاثرات کو محسوس نہیں کر سکتے۔ حافظہ، انسانی ذات کے احساسات و تاثرات کے ریکارڈ روم کا نام ہے اور دماغ اس حافظہ کے مشہود (MANIFEST) کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے حافظہ اور دماغ الگ الگ چیزیں ہیں۔ دماغ کا تعلق طبعی جسم (PHYSICAL BODY) سے ہے اور حافظہ کا تعلق انسانی ذات I سے جو غیر طبعی ہے کیونکہ وہ تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ برگسان نے اس موضوع کو اپنی معرکہ آرا تصنیف (MATTER AND MEMORY) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ مختلف نظریات کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ

> آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہوسکتا۔ دماغ، حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قلیہ میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال (PRESENT) پر اپنا تصرف کر سکے۔ لیکن خالص حافظہ، مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا درحقیقت رُوح کی دنیا ہے۔

اوسپنسکی تو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ دماغ کے خلیات (BRAIN CELL) جسم کے دوسرے خلیات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور قابلِ فنا۔ بہرحال، اگر اوسپنسکی کے اس نظریہ سے اتفاق نہ بھی کیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ دماغ صرف حافظہ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ حافظہ دماغ کی پیداوار نہیں، حافظہ انسانی ذات پر مرتسم شدہ نقوش کا نام ہے۔ اس لئے دماغ کے خراب یا مستقل طور پر بیکار ہوجانے سے انسانی ذات فنا نہیں ہوجاتی۔ فقط اس کے اظہار کا ذریعہ معطل ہوجاتا ہے۔

جاگ رہے ہو سلیم یا سو گئے؟ مجھے تو امید نہیں کہ تم اس قدر خشک موضوع کو دلچسپی سے سُن رہے ہوگے۔

لیکن جب تم نے خود ہی ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے تو اسے صبر سے سننا ہی ہوگا۔ اگر اتنی تاب نہ تھی تو پھر تم

مکتبِ عشق میں کیا کام تھا، آیا کیوں تھا؟

بہرحال، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ انسانی ذات، دماغ سے بالکل الگ شے ہے اور دماغ کے معطل یا بیکار ہو جانے سے اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پروفیسر (ERWIN SCHRODINGER) نے ایک چھوٹی سی لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے (WHAT IS LIFE) وہ اس میں لکھتا ہے:-

"میں" کسے کہتے ہیں؟"

اگر آپ "میں" کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں، وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے اگر کوئی ماہرِ عملِ تنویم ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے، پھر بھی تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہوجائے گی۔ لہٰذا، انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی، نہ ہی کبھی ضائع ہوگی۔

عملِ تنویم (HYPNOTISM) کے متعلق میں نے سلیم! تمہیں وہ واقعہ سنایا تھا جسے ہکسلے نے اپنے ہاں لکھا ہے:

"ایک عامل نے اپنے معمول کو بے ہوش کر دیا، بالکل بیہوش۔ اس بیہوشی کے عالم میں اُس نے کہا کہ دیکھو! جب شام کے چھ بجیں تو تم اپنے کمرے کی گھڑی کو اُٹھا کر باہر پھینک دینا۔ اس کے بعد وہ معمول کو ہوش میں لے آیا (اس وقت بارہ بجے تھے)۔ معمول ساری دوپہر اور سہ پہر بالکل اچھا بھلا اپنے کام کاج میں مصروف رہا۔ اسے قطعاً یاد نہیں تھا کہ اس کی بیہوشی کے عالم میں عامل نے اسے کیا کہا تھا۔ چھ بجے کے قریب وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا، اپنے کمرے میں تاش کھیل رہا تھا۔ جوں ہی گھڑی نے چھ بجائے، وہ یک لخت اٹھا اور یہ کہہ کر اسے باہر پھینک دیا کہ اس کی ٹک ٹک نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر نہایت اطمینان سے اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور تاش کھیلنے لگ گیا۔ عملِ تنویم کا اثر انسان کے دماغ پر نہیں ہوتا، اُس کی ذات پر ہوتا ہے اور دماغ (اور دوسرے حواس، بصارت، سماعت وغیرہ) اس لئے معطل ہوجاتے ہیں کہ انسانی ذات ان سے اس وقت کام نہیں لینا چاہتی۔"

عملِ تنویم کا ذکر آ گیا، تو تمہیں ضمناً ایک اور اہم بات بھی بتا دوں۔ معمول سے عالمِ بیہوشی میں آپ جو جی میں آئے منواتے جایئے۔ وہ آپ کی ہر بات پر ہاں کرتا جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے کوئی ایسی بات کہی جو اُس کے عقیدے کے خلاف ہو، تو وہ اس کے جواب میں کبھی ہاں نہیں کرے گا۔ عقیدے کا اثر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ بیہوشی کے عالم میں بھی آپ اسے معمول کی لوحِ ذات سے مٹا نہیں سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگا لو سلیم! کہ انسان کے معتقدات کا بدلنا (خواہ وہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں) کس قدر مشکل کام ہے۔ اب تو تمہاری سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی ہو گی کہ مسلمان اپنے غلط مذہب کو چھوڑ کر کیوں قرآن کے قریب نہیں آتا، حالانکہ اس کی تعلیم اس قدر عقل و بصیرت کے مطابق اور علم و دانش کو اپیل کرتی ہے۔ اُس کے لئے انسان کو خاص طور پر کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یعنی ان غلط معتقدات کے خلاف بڑے قوی دلائل بہم پہنچانے پڑتے ہیں۔

بہرحال، یہ تم نے سمجھ لیا سلیم! کہ

۱۔ انسان، جسم ہی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو طبیعی تغیّرات سے متاثر نہیں ہوتی، اُسے انسانی ذات یا نفس یا انا یا خودی یا تشخص کہتے ہیں۔

۲۔ انسانی ذات دماغ کا نام نہیں۔ دماغ وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے نقوش کا مظاہرہ کرتی ہے۔ دماغ کے خراب ہو جانے سے انسانی ذات کے ان نقوش کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دماغ کے بیکار ہو جانے سے انسانی ذات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات اس طرح سے ختم نہیں ہوتی۔

قرآن نے انسانی ذات کے متعلق کہا ہے کہ اس کا تعلق مادی دنیا سے نہیں، جس میں ہر آن تغیّرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسے اس نے "روحِ خداوندی" یا (DIVINE ENERGY) سے تعبیر کیا ہے جو تغیّرات سے بلند و بالا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک انسان کے جسم کی طبیعی ساخت کا تعلق ہے اس میں اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ استقرارِ حمل سے ان دونوں کی ابتدا ہوتی ہے اور دونوں رحمِ مادر کے اندر مختلف پہلو بدلتے ہوئے ایک خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں نئی منزل آتی ہے اور وہ یہ کہ — نَفَخۡنَا فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِنَا اس میں الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) کا شمہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات یا نفس یا انا یا خودی ہے۔ اسی سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہوتا ہے اور اسی سے انسان کی انسانیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ "روحِ خداوندی" یا انسانی ذات ہر انسانی بچہ کے اندر موجود ہوتی ہے۔ لیکن

محض امکانی شکل (POTENTIAL FORM) میں۔ اس کی امکانی قوتیں مناسب نشوونما پانے سے (DEVELOP) ہو کر بتدریج مشہود (REALISED) ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نام تربیتِ ذات یا ربوبیت ہے۔ اسی کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ تزکیہ کے لفظی معنی نشوونما (GROWTH) کے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا جس نے اسے نشوونما دے کر (DEVELOP) کر لیا' وہ کامیاب ہو گیا۔ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی' اور قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴿۹۱/۱۰﴾ اور جس نے اسے مٹی کے تودے کے نیچے دبا دیا وہ برباد ہو گیا۔ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما (ربوبیت) کس طرح ہوتی ہے اور اس کی ربوبیت سے کس طرح بنی نوع انسان کی مضمر صلاحیتوں میں بالیدگی اور کشادگی آتی جاتی ہے (یہ موضوع الگ ہے اور اس کے لئے تمہیں ابھی کچھ وقت تک اور انتظار کرنا ہو گا)۔ جب تک انسان کی ذات (یا خودی) خام رہتی ہے وہ خارجی حوادث کے تھپیڑوں سے متزلزل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس میں پختگی آتی جاتی ہے وہ کوہِ پیکر بن جاتا ہے۔

تم نے سلیم! اوسپنسکی کو تو پڑھا ہے لیکن شاید اس کے استاد گرجیف کی کتاب (ALL AND EVERY THING) کا مطالعہ نہیں کیا۔ اوسپنسکی نے گرجیف سے پوچھا کہ کیا انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو' تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اگر اس میں اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جیے' تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی　　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے

مغرب کا فکر (جو مادیت پر مبنی ہے) اس شے کے وجود سے انکار کرتا ہے اور انسانی زندگی کو محض طبیعیاتی زندگی تک محدود سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت ردِ عمل ہے عیسائیت کی اس خانقاہیت کا جس میں دنیا کو ناثبات اور روح کو اصل کائنات قرار دے کر ترکِ دنیا کو مقصودِ زندگی بنایا گیا تھا۔ یہ تصوّر افلاطونی فلسفۂ امثال سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہی وہ تصور تھا جو ہندوستان میں ویدانت اور ایران میں تصوّف کے نام سے چمکا اور اسی راستے سے اسلام کے اندر بھی آپہنچا اور اسے یکسر اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر غور کرو سلیم! تو تم دیکھو گے کہ ایک اچھے دماغ کا انسان اگر غلط راستے پر پڑ جائے تو وہ نوعِ انسانی کے لئے کس قدر نقصانِ عظیم کا باعث بن جاتا ہے۔

افلاطون (PLATO) نہایت طباع اور ذہین مفکّر تھا، لیکن غلط راستے پر پڑ گیا۔ اس نے اس غلط روش کو اپنے منطقی دلائل کی بنا پر ایسا حقیقت بنا کر دکھایا کہ اس سے قوموں کی قومیں متاثر ہوگئیں۔ اس وقت انسانی دنیا کی شاید ہی کوئی فکر ایسی ہو جو کسی نہ کسی رنگ میں افلاطونی فکر سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ بعض مقامات پر یہ اثر ایسا گہرا ہوا کہ اس نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب غور کرو سلیم! کہ اس دو اڑھائی ہزار سال کے عرصے میں اس ایک دماغ کی غلط فکر نے انسان کو کس قدر پستیوں میں دھکیلے رکھا ہے۔ اگر وہ اس غلط فکر کو اختیار نہ کرتا تو آج کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ قرآن اس فکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس نے مادّی دنیا اور انسانی ذات کے مقام کا صحیح صحیح تعین کیا اور کھلے کھلے الفاظ میں بتایا کہ کس طرح دنیا کی تسخیر اور اس کے ماحصل کا صحیح مصرف انسانی ذات کی نشوو بالیدگی کا موجب بنتے ہیں۔ مسلمانوں نے قرآن کے اس فکر کو عملی رنگ دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ (قرآن کے الفاظ میں) ان کے تمدن کی جڑیں مادّی دنیا کے پاتال میں تھیں اور اس کی شاخیں بلند کائنات کی فضاؤں میں جھولے جھول رہی تھیں۔ یہ قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا بندۂ مومن کا ذہن تھا جو طلسمِ افلاطون سے متاثر نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد عجمی ذہن اسلام کے دائرے میں آیا جو یکسر افلاطونی قالب کا ساختہ پرداختہ تھا، تو اس نے خود اسلام ہی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ یہی عجمی اسلام ہے سلیم! جو ہزار برس سے ہمارے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ نکل گیا تو اس کے ساتھ ہی ہماری جان بھی نکل جائے گی۔ بقول مومنؔ؛ ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ "عجم" سے مراد کوئی خاص خطۂ زمین نہیں۔ اس سے مقصد ہر غیر قرآنی

تصور ہے خواہ وہ عرب سے آیا ہو یا ایران سے۔ اس کا سرچشمہ مشرق ہو یا مغرب۔

بہرحال سلیم! یہ ہے انسانی ذات جو انسانی جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ انسان کے تمام اعمالِ حیات حتّٰی کہ اس کی نگاہ کی جنبش اور دل کی لغزش سب انسانی ذات پر اپنا نقش مرتّب کرتے رہتے ہیں۔ انسان کو اس کا احساس و شعور ہو یا نہ ہو، اس کا کوئی عمل اور ارادہ اس کی ذات پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ اس کا نام ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔ یہی ہے وہ "نامۂ اعمال" جس میں سب کچھ ریکارڈ ہوتا رہتا ہے۔ یہی ہے وہ میزانِ عمل جس میں سب کچھ تلتا رہتا ہے۔ نیک اعمال وہ ہیں جن سے انسانی ذات پختگی حاصل کرتی ہے۔ برائی اسے کہتے ہیں جس سے اس میں ضعف پیدا ہوتا ہے (اس کے لئے کس قسم کے معاشرے کی ضرورت ہے اور اس معاشرہ میں کس طرح انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، اس کے متعلق کسی دوسرے خط کا انتظار کرو)۔ اس زندگی میں انسانی ذات جسم کو اپنی توانائیوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بناتی ہے۔ جسم کے انتشار کے بعد (جسے طبعی موت کہا جاتا ہے) انسانی ذات کے اعمال کے ظہور (MANIFESTATION) کے لئے کوئی اور ذریعہ مل جائیگا۔ ذرائع کے بدل جانے سے اصل شے تبدیل نہیں ہو جاتی۔ ظروف کی تبدیلی سے مظروف کا کچھ نہیں بگڑتا۔ شراب مینا میں ہو یا ساغر میں، اس کے جوہر کیف آوری (نشہ) پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ غالبؔ تو یہاں تک بھی کہہ گیا ہے کہ پیالہ نہیں تو ادک ہی سے سہی۔ شراب تو بہرکیف شراب ہی رہتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ میں انسانی جسم کی اہمیت کو کم کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ حیاتِ ارضی میں جسم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنی توانائیوں کی نمود کرتی ہے اس لئے اس ذریعہ کا مضبوط، متوازن اور درست ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر قمقمہ (BULB) پانچ بتی کی طاقت (5 CANDLE POWER) کا ہے تو بجلی کی لہر کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس میں سے نہایت مدہم روشنی نکلے گی۔ اس کے برعکس، اگر قمقمہ سو بتی کا ہے تو کمرہ جگمگا اٹھے گا۔ کرنٹ دونوں صورتوں میں ایک ہی جیسی ہے لیکن اس کی نمود، بلب کی طاقت کے مطابق ہے۔ اس لئے کرنٹ کے طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ بلب کا طاقتور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مادی کائنات کی تسخیر کو اس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انسانی ذات کی نشوونما کا پروگرام ہی یہ بتایا ہے کہ انسان مادی اشیائے کائنات کو مسخر کرتا جائے اور اپنی تسخیر کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے عام رکھے (اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں لیکن اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں)۔ جس قدر انسان

ربوبیّتِ عامہ میں زیادہ سعی و کاوش کرتا ہے، جس قدر وہ اپنی محنت کے ثمرات کو عام کئے جاتا ہے، اسی قدر اس کی ذات میں کشاد اور استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، تاآنکہ اس کا طبیعی جسم، عام قوانینِ طبیعی کے ماتحت، متحرک سے ساکن ہو جاتا ہے۔ (یعنی اسے موت آجاتی ہے) لیکن اس کی ذات، زندگی کی اس سطح سے آگے نکل کر دوسری سطح پر جا پہنچتی ہے اور اپنے سفر کی اگلی منزل طے کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ انسانی ذات کی ہستی کے اقرار اور انکار سے کس طرح زندگی کا پورا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اگر انسانی ذات کا اقرار کر لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان اور مکافاتِ عمل کے غیر متبدّل قانون پر ایمان ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ اگر انسانی ذات ہی سے انکار کر دیا جائے تو اس کے بعد نہ خدا کی ہستی پر ایمان کے کچھ معنی رہتے ہیں اور نہ قانونِ مجازات کی کچھ حقیقت۔ اس کے بعد زندگی محض حیوانی سطح — (ANIMAL LEVEL) پر اُتر آتی ہے جس کے سامنے (جسم کی پرورش کے سوا) نہ کوئی مقصد ہوتا ہے نہ مفہوم۔ نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے نہ منزل۔ قرآن کے الفاظ میں وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا جو لوگ اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کی زندگی فقط اتنی رہ جاتی ہے کہ یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ (۴۷/۱۲) وہ اسی طرح سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان، اور پھر ان ہی کی طرح کھا پی کر طبعی موت مر جاتے ہیں۔ بلکہ اس فرق کے ساتھ کہ حیوانات کو رزق کی تلاش کبھی اس طرح پریشان نہیں کرتی جس طرح انسان کو کرتی ہے اور حیوانات کو موت کا تصوّر بھی کبھی نہیں ستاتا۔ اس لئے کہ حیوانات موت کے تصوّر سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس، انسان ہر وقت موت کے تصوّر سے بدحواس رہتا ہے۔

یہ ہے سلیم! وہ بنیاد جس پر اسلامی نہجِ زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ کیا اب تم سمجھ گئے یا نہیں کہ انسانی زندگی اس جسم کا نام نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اور وہ "کچھ اور" ایسی چیز ہے جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس ایغو یا انا کو حیاتِ جاوید بطور استحقاق نہیں ملتی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس جنّت کے متعلق جس میں آدم دوبارہ داخل ہوگا کہہ دیا کہ وہ صرف تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوگی، بطورِ بخشش نہیں مل جائے گی۔ اگر میں اس تفصیل میں چلا گیا کہ جنّت کسے کہتے ہیں اور جہنّم کیا ہوتی ہے، تو بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی۔ لیکن اس تفصیل میں گئے بغیر سرِدست اتنا سمجھ لینا

کافی ہوگا کہ ہمارا ہر عمل، ہمارے ایغو (انا) میں جنت یا جہنم کی تخم ریزی کرتا رہتا ہے۔ وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ جہنم ایک خطۂ زمہریر ہے۔ اس میں داخل ہونے والے اپنا اپنا ایندھن اپنی پیٹھ پر لاد کر لاتے ہیں، تو اس استعارہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ عملِ خیر وہ ہے جس سے انسانی خودی پختگی حاصل کرلے اور عملِ شر وہ جس سے اس میں ضعف و انتشار پیدا ہو جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی ذات وہ معیار ہے جس سے خیر اور شر کا تعین ہوتا ہے۔ اگر انسانی ذات سے انکار کر دیا جائے تو دنیا میں خیر اور شر کا معیار ہی باقی نہیں رہتا۔ انسانی ذات میں جوں جوں پختگی آتی جاتی ہے، اس کی انفرادیت محکم ہوتی جاتی ہے حتّٰی کہ اس میں ایسی احدیت (UNIQUENESS) آجاتی ہے کہ یہ اپنی ذات میں یکسر منفرد ہوتی ہے۔ ایسی منفرد کہ، اقبالؒ کے الفاظ میں یہ انائے مطلق (خدا) کے حضور بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے، اس میں جذب نہیں ہو جاتی ؎

بخود محکم گزار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش

یہی فرق ہے وحدتِ وجود کے عجمی تصور اور انسانی ذات کے قرآنی تصور میں۔ وحدتِ وجود کا عقیدہ (ویدانت کے تتبع میں) انسانی ذات کا منتہیٰ یہ قرار دیتا ہے کہ وہ خدا کی ہستی میں جذب (فنا) ہو جائے۔ لیکن یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ صحیح قرآنی تصور وہ ہے جسے اقبالؒ نے پیش کیا ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ عالمگیر حیات (UNIVERSAL LIFE) کا بھی قائل نہیں۔ وہ زندگی کی انفرادیت کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک خدا بھی ایک فرد ہے۔ بے مثل و بے نظیر فرد۔ اس لئے جوں جوں انسانی ذات اپنے اندر خدا کی صفات مشہود کرتی جاتی ہے، انفرادیت حاصل کرتی جاتی ہے۔

اوہو! تم کہو گے کہ میں نے پھر خط میں فلسفیانہ گفتگو شروع کر دی۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم نے انسانی ذات کے متعلق بات چھیڑ دی، اس میں اگر فلسفہ نہیں آئے گا تو کیا داغ کے اشعار آئیں گے؟

اچھا، لو اللہ بیلی!

پرویز
اپریل ۱۹۵۳ء

آٹھواں خط

کمیونزم اور اسلام[1]

لَا و اِلَّا ساز و برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات، مرگِ اُمتاں

میں سلیم! تمہیں ایک عرصے سے کہتا چلا آرہا تھا کہ ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں اس کی مختلف تحریکوں کے پس منظر، نفسیاتی اسباب وعلل اور سیاسی محرکات و موٴیدات سے آگہی حاصل کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ لاعلمی یا سطحی معلومات کی وجہ سے تم بھی اس طوفان میں بہہ جاؤ گے جس میں ہمارے ملک کا نوجوان طبقہ عام طور پر بہے چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لیکن چونکہ تمہاری فطرت سلیم ہے اس لئے تم نے پاؤں اکھڑنے سے پہلے آواز دے دی۔ اب مجھے امید ہے کہ تم سنبھل جاؤ گے۔ ورنہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جس سے پوچھئے وہ کمیونزم کے متعلق اتنا ہی جانتا ہے کہ یہ ایک معاشی نظام کا نام ہے جس میں تمام لوگوں میں دولت کی تقسیم مساویانہ ہوتی ہے اور امیر و غریب، مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور کاشت کار کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ جس سے سب خوشحال اور مرفہ الحال ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کسی غریب کا خون نہیں چوس سکتا اور غریب محض پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنا سب کچھ اہلِ دولت کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا اور یوں یہ دنیا جو اس وقت سرمایہ داری کی لعنت سے غریبوں کے لئے جہنم بن رہی ہے، مسرت و اطمینان کی جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ معاشی نظام کا یہ منظر ایسا خوش آیند ہے کہ ہر شخص رواں دواں اس کی طرف کھنچے چلا جاتا ہے اور یہ نگاہ فریب

---

[1] یہ خطوط سنہ ۱۹۴۹ء میں لکھے گئے تھے۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے کمیونزم اور قرآن کے معاشی نظام کے متعلق مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مباحث ان کی تصنیف "نظامِ ربوبیت" میں ملیں گے۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

جاذبیتیں اسے اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ اس کی اصل وحقیقت اور اس کے گردوپیش پر ایک نظر ڈال سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت نے فی الواقعہ جمہور کو اس قدر ستا رکھا ہے کہ ان بھوکوں محتاجوں اور بے کسوں کو جہاں کہیں سے روٹی کا اشارہ ملتا ہے یہ اس کی طرف لپک کر جاتے ہیں اور اس باب میں یہ سچے بھی ہیں۔ بھوکے ہیں اس کی تاب ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تحقیق کرے کہ جو حلوہ اس کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اس میں کہیں زہر تو نہیں ملا رکھا۔ بھوک کی ایسی جانگسل شدت میں اس تمیز کا ہوش رکھنا" کار ہر دیوانہ نیست۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ عزیز کوئی اور متاع ہو۔ موجودہ معاشرہ میں ایسی متاعِ عزیز کی تلاش سعیٔ لاحاصل ہے کہ اس معاشرہ کی بنیاد ہی "روٹی" پر استوار ہے۔ اس لئے ہمارے دَور کا بھوکا، مجبور و معذور ہے کہ وہ "روٹی" کی آواز پر لبیک کہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کی کامیابی کا راز ان تحریکوں کے ذاتی جوہروں (INTRINSIC VALUES) میں نہیں بلکہ ان حالات میں ہوتا ہے جو ہمارے دَور کے ابلیسی نظام نے پیدا کر رکھے ہیں۔ اس نظام میں غربت اور فلاکت نے جس درجہ شدت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر اگر ہر غریب پیدائشی کمیونسٹ دکھائی دیتا ہے تو یہ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ نے تمہیں ایک دردمند دل عطا فرمایا ہے جو ہر مظلوم کی مصیبت میں تڑپ اٹھتا ہے۔ لہٰذا، تمہارے لئے ان غریبوں کی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہونا بھی مستبعد نہ تھا۔ بنا بریں مجھے اس کے متعلق بھی کوئی شکایت نہیں۔ وہ بدبخت شقی القلب ہے جو غریبوں اور مفلسوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو نہ بہائے اور ان کے دکھ کی دوا ڈھونڈنے میں دن اور رات کی تمیز روا رکھے۔ لیکن مجھے جس بات کا افسوس ہے وہ صرف یہ ہے کہ تم نے اس تحریک کا صحیح مطالعہ نہیں کیا اور اپنی روش کے خلاف، محض جذباتی طور پر اس کے متعلق رائے قائم کر لی کہ "کمیونزم اور اسلام ایک ہی چیز ہے اور اگر اسلام کچھ اور ہے تو ایسے اسلام کو دُور ہی سے سلام ہے"! تم نے شدتِ جذبات میں اس اصول کو بھی فراموش کر دیا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو) تمہیں چاہیئے تھا کہ پہلے اس کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کرتے اور پھر رائے قائم کرتے۔ بہرحال، جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے یہ غنیمت ہے کہ تم نے عملی اقدام سے پہلے اس کے متعلق دریافت کر لینا ضروری سمجھا۔ یہی تمہاری فطرتِ سلیم کی شہادت ہے۔

کمیونزم، معاشی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک پورا فلسفۂ زندگی ہے جس کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا، جب ہم کمیونزم کے متعلق گفتگو کریں تو ہمارے سامنے پورا فلسفۂ حیات ہونا چاہیئے۔ نہ صرف

روس کا معاشی نظام" فلسفۂ حیات" کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کو کیا سمجھتے ہیں اور وہ کون سی اقدار (VALUES) ہیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہیں. جس طرح کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ لہٰذا' یہ کہنے سے پہلے کہ کمیونزم اور اسلام ایک ہی ہیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کیا ان دونوں کا فلسفۂ حیات ایک ہی ہے ؟ اگر ایک ہی ہے تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام اور کمیونزم کے معاشی نظام میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن اتنے سے تشابہ سے یہ دونوں ازمز (ISMS) ایک تو نہیں ہو سکتے ! یہ تو ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ دو کہ ہندوستان کی حکومت نے امتناعِ شراب کا حکم دے دیا ہے لہٰذا ۔ وہاں کی حکومت اسلامی حکومت ہے یا یہ کہ مرزا ارشد کی شکل حمید ریحانی سے بہت ملتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کی سیرت بھی ایک ہی ہے۔ بعض اجزاء کے تشابہ سے کل' یا ظواہر کے تشابہ سے اصل' کی یکسانیت لازم نہیں آتی۔

مشکل یہ ہے کہ تم فلسفہ کے مبادیات تک سے بھی واقف نہیں' اس لئے تم سے فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ میں نے اسی دشواری کے پیشِ نظر تم سے کبھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو نہیں کی لیکن جس بات کا مدار ہی فلسفہ پر ہو اس کے متعلق کیا کیا جائے ؟ میں کوشش کروں گا کہ فلسفیانہ اسلوب سے بچ کر عام فہم زبان میں بات سمجھائی جا سکے۔

کمیونزم کو مارکس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مارکس ایک فلسفی تھا۔ لیکن اس کا فلسفہ متفرع تھا ہیگل کے فلسفہ پر۔ لہٰذا' مارکس تک پہنچنے کے لئے ہیگل کے فلسفہ کے متعلق دو چار باتیں جاننا نہایت ضروری ہیں۔ ہیگل (HEGEL) کے فلسفہ کو عام طور فلسفۂ اضداد (OPPOSITES) کہا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہتا ہے کہ دنیا میں ہر شے اپنی ضد سے قائم ہے' بلکہ یہ بھی کہ انسانیت نے جس قدر ترقی کی ہے وہ اضداد ہی کی جنگ و پیکار سے کی ہے لیکن ان اضداد کا دائرہ صرف تصورا در فکر (IDEAS AND THOUGHTS) کی دنیا تک محدود ہے۔ محدود ہی نہیں بلکہ وہ اصل حقیقت صرف تصور کو مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک تصور (IDEA) جب ایک خاص حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے تصادم سے ایک نئے تصور کی تخلیق ہوتی ہے جس سے پہلے تصور کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے وہ دلیل یہ لاتا ہے کہ ہر تصور محدود اور ناقص ہوتا ہے۔ اس نقص اور محدودیت کی وجہ سے وہ اپنی ضد پیدا کرتا ہے۔ یہ نیا تصور' اپنے سے پہلے تصور کے ناقص پہلوؤں کا ابطال کرتا ہے۔ لیکن ان ناقص پہلوؤں کا کچھ نہ کچھ اثر اس کے اندر باقی رہتا ہے۔ یہ تصور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور

پھر اپنی انتہا تک پہنچ کر ایک نئے تصوّر کی تخلیق کرتا ہے، جو اس کی ضد ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح سے جاری رہتا ہے۔ ہیگل اس عمل کا نام جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جدلی عمل، زندگی کی عین فطرت ہے۔ ایک مخفی قوت ہے جو انسان کو بار بار اس پر آمادہ کرتی رہتی ہے کہ وہ پرانے تصوّرات کی جگہ نئے تصوّرات پیدا کرتا رہے جو پہلے تصوّرات کی نقیض یا ضد ہوں۔ اس مخفی قوت کو ہیگل (WORLD SPIRIT) "روحِ عالم" کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ روحِ عالم ایسا کیوں کرتی ہے؟ اس کے متعلق ہیگل کہتا ہے کہ اس سے اس روح کو خود اپنی ذات کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔

تم سلیم! کہو گے کہ یہ لفظوں کا گورکھ دھندا کیا ہے؟ لیکن تم ذرا غور سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ اس لفظی گورکھ دھندے کی بنیاد پر زندگی کی پوری عمارت قائم کردی گئی ہے۔ ہیگل کے نظریہ کا ماحصل یہ ٹھہرا کہ

۱۔ دنیا میں کوئی قدر (VALUE) مستقل طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ ہر قدر میں نقص موجود ہوتا ہے۔ وہ تغیّرات کی دنیا میں چکر کاٹتی ہے اور اس کے بعد ایک نئی قدر پیدا کرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ یہ نئی قدر بھی اپنی ذات میں مکمل یا مستقل نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور قدر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

۲۔ یہ سلسلۂ تخریب و تعمیر ایک مخفی قوّت کی تحریک پر قائم ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ مخفی قوّت اپنی ذات کی تکمیل کرلے۔

۳۔ کائنات میں مادّہ کو کوئی اہمیّت حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد تصوّرات (IDEAS) پر قائم ہے۔

اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ

۱۔ خدا (مخفی قوت یا روحِ عالم) بھی اپنی ذات میں مکمل نہیں بلکہ وہ تکمیلِ ذات کے لئے تصوّرات کے تعمیری اور تخریبی چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

۲۔ دنیا میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کا کوئی وجود نہیں۔ ہر تصوّر (قدر) اپنے اندر نقائص رکھتا ہے اور ایک حد تک پہنچ کر خود معدوم ہو جاتا ہے اور ایک نئے تصوّر (قدر) کی تخلیق کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہ نئی قدر پھر اپنے اندر نقائص رکھتی ہے اور اس طرح تغیّرات کا یہ سلسلۂ حوادث جاری ہے۔ لہٰذا، دنیا میں کوئی شے ناقابلِ تغیّر و تبدّل نہیں۔

۳۔ دنیا میں جنگ و پیکار صرف تصوّرات کی ہوتی ہے، مادّیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا، یا تو مادّہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتا اور اگر وہ وجود رکھتا ہے تو روح سے یکسر الگ شے ہے۔ ان دونوں میں باہمی امتزاج ناممکن ہے۔

تم کہو گے کہ ان چیزوں کو کمیونزم سے کیا واسطہ؟ اور یہ اس لئے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، تم نے کمیونزم کو فقط روس کا معاشی نظام سمجھ رکھا ہے۔ بہرحال، ہیگل کے فلسفہ کے اصولوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھو۔

مارکس (KARAL MAR – 1818-83) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر اس نے ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ ہیگل کا سارا فلسفہ اس کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا۔ اس نے ہیگل سے اس بات میں اتفاق کیا کہ تاریخ جنگِ اضداد کی داستان ضرور ہے، لیکن یہ اضداد تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتا نظامہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتا ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے، جب وہ اپنے عروج کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ مخالف قوتیں، اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام مسلط کر دیتی ہیں جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تم نے سلیم! غور کیا کہ مارکس کی اس موافقت میں کتنے بڑے اختلاف کا پہلو نمایاں ہے۔ ہیگل نے کہا تھا کہ ایک تصور (IDEA) کی جگہ دوسرا تصور لے لیتا ہے اور یہ جنگِ اضداد تصورات (IDEAS) کی جنگ ہوتی ہے مارکس جنگِ اضداد کا تو قائل ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ جنگ تصورات کی نہیں مختلف "نظامہائے عالم" کی ہوتی ہے۔ ہیگل کے نزدیک، انقلاب انسانوں کی تصوراتی (داخلی) دنیا میں رونما ہوتا ہے۔ مارکس کے نزدیک داخلی دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمام انقلاب انسان کی خارجی دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور انسانی تصورات (IDEAS) ان ہی خارجی انقلابات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یعنی ہیگل کے نزدیک کائنات کی بنیاد تصور (IDEA) پر ہے لیکن مارکس کے نزدیک اس کی بنیاد خالص مادہ (MATTER) پر ہے۔ ہیگل کے فلسفہ کی رُو سے، انسان کا خارجی ماحول اس کے تصور و فکر کی تبدیلی سے بدلتا ہے۔ مارکس کے فلسفہ کی رُو سے، انسانی فکر و تصور اس کی مادی دنیا کے تغیرات کے مطابق بدلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر مارکس نے ہیگل کے جدلی تصور (DIALECTICAL IDEALISM) سے جدلی طریق (DIALECTIC PROCESS) کو تو لے لیا۔ لیکن اس کی تصوریت (IDEALISM) کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ خالص مادیت کو دے دی۔ اس لئے مارکس کے فلسفہ کو جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کہتے ہیں۔ ہیگل کے نزدیک اس جنگِ اضداد کی محرک، روحِ عالم یا روحِ مطلق (ABSOLUTE SPIRIT) تھی۔ اگرچہ وہ روح نامکمل تھی اور اس نے اس تمام سلسلۂ جنگ و پیکار کو اپنی تکمیلِ ذات کے لئے قائم کر رکھا تھا۔ لیکن مارکس نے کہا یہ مطلقیت (ABSOLUTISM) انسان کو حاصل ہے۔ انسان کے ماورا کوئی قوت نہیں۔

مادّہ سے توانائی ازخود پیدا ہوتی ہے اور یہی ازخود پیدا شدہ توانائی (SELF-GENERATED ENERGY) کائنات میں حرکت کا موجب ہے۔ یہ ہے مارکس کے فلسفہ کی بنیاد۔ یعنی خالص مادیّت (MATERIALISM) مادیّت کا لفظ تو تم دن میں سینکڑوں بار سنتے ہو گے لیکن مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ تم اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو یا نہیں۔ میں نے ایک دفعہ تمہیں (HAECKEL) کی کتاب (RIDDLE OF THE UNIVERSE) بھیجی تھی۔ خدا معلوم اسے تم نے پڑھ لیا تھا یا وہ بھی ناولوں کے ساتھ کباڑیوں کے ہاں چلی گئی یا باورچی نے چولہے کی نذر کر دی۔ اگر تم نے اسے پڑھا تھا تو تم نے دیکھا ہو گا کہ ہیکل کائنات میں سات معمّے بتاتا ہے۔

۱ ــــــــــ مبداءِ حیات

۲ ــــــــــ ربط اشیائے فطرت

۳ ــــــــــ مبداء فکر و لسان

۴ ــــــــــ انسانی اختیار و ارادہ

۵ ــــــــــ ماہیتِ مادّہ و توانائی

۶ ــــــــــ مبداءِ حرکت اور

۷ ــــــــــ مبداءِ شعور

ہیکل کے نزدیک یہ سات معمّے، دو بنیادی اصولوں کے ماتحت حل ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ "مادّہ اور قوت غیر متبدّل ہیں" اور دوم یہ کہ "کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے"۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ غیر شعور و غیر ذی حیات ـــ مادّہ (MATTER) سے ارتقائی طور پر زندگی (LIFE) اور "شعور" (CONSCIOUSNESS) پیدا ہو جاتا ہے۔

چلیئے! کائنات کے معمّے کا حل دریافت ہو گیا!

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ ہے سلیم! مادیّت۔ یعنی مادّہ ازخود موجود ہو گیا اور پھر عمل ارتقاء سے اس میں زندگی، حرکت، ارادہ، شعور، سب کچھ پیدا ہو گیا۔ جب تک ان اجزاء میں ربطِ باہمی قائم ہے (جس کا نتیجہ زندگی اور شعور ہے) انسان زندہ ہے اور باشعور۔ جب یہ اجزاء پریشان ہو جاتے ہیں تو زندگی اور شعور ختم ہو جاتا ہے اور انسان مٹ جاتا ہے۔

جہاں تک فلسفۂ مادیّت کا تعلق ہے، مارکس پر ایک اور فلاسفر کا بھی اثر تھا۔ اس کا نام تھا ـــ

یہ ہیگل کا شاگرد تھا اور عیسائیت کا بنیادی دشمن۔ عیسائیت کی تخریب کے لئے اس نے فلسفۂ مادیت کی عام ترویج کی۔ اس کی کتاب (ESSENCE OF CHRISTIANITY) اس کے مذہب کی "بائبل" ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ "فطرت کے ماورا کسی شے کا وجود نہیں۔ مذہب جن مافوق الفطرت ہستیوں اور طاقتوں کا ذکر کرتا ہے وہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہیں۔" لہٰذا، مارکس کے نزدیک سب سے سخت تنقید مذہب کی تنقید ہے، اس لئے کہ "مذہب انسانوں کے لئے افیون کا حکم رکھتا ہے۔" وہ کہتا ہے کہ

> مذہب، انسانی ذہن کی پیداوار ہے، انسان، مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پاکر پھر سے اسے کھو دیا ہے۔ مذہب، مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی رُوح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کے فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مارکس کے نزدیک مذہب، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات کا کوئی حقیقی وجود نہیں، تو پھر وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں جدلیاتی رنگ جاری ہے؟ ایک نظام اپنے عروج پر پہنچ کر کیوں ایک اور نظام پیدا کرتا ہے جو پہلے نظام کو مٹا کر اس جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے؟ یہ نظامِ استبدال و استخلاف کس قوتِ محرکہ کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے؟

مارکس کہتا ہے کہ تاریخ کے ہر دَور میں زندگی کی اصل و بنیاد اس دَور کا معاشی نظام ہوتا ہے جس پر مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی عمارت قائم ہوتی ہے۔ جس دَور میں جس قسم کا معاشی نظام ہوگا اس میں اسی قسم کا اخلاق و تمدن ہوگا۔ لہٰذا، اصل شے معاشی نظام ہے۔ تاریخ کے میدان میں کوئی جنگ تصورات (IDEAS) کے اختلاف سے نہیں لڑی جاتی بلکہ معاشی نظام کے اختلاف سے لڑی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کی اخلاقی اقدار (MORAL VALUES) معاشی نظام کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک معاشی نظام ایک وقت تک کارفرما رہتا ہے۔ پھر آفرینشِ دولت کے طریقے (METHOD OF PRODUCTION) بدل جانے سے اس نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک جدید نظام ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور اس جدید نظامِ معیشت (ECONOMIC SYSTEM) کے ساتھ ہی سوسائٹی کی تمام اقدار (VALUES) بدل جاتی ہیں۔ کبھی معاشی نظام کی بنیاد غلامی

(SLAVERY) پر تھی۔ اُس دَور میں "اطاعت، فرمانبرداری، فروتنی، انکساری" "ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسرا گال آگے کردینا" اخلاقی اقدار تھیں۔ پھر اس کی جگہ جاگیرداری نظام نے لی تو شجاعت، غیرت، حمیت، فخر و تکبر نے اخلاق کی جگہ لے لی۔ اب سرمایہ داری (CAPITALISM) کا دَور دَورہ ہے تو جھوٹ، فریب، مصلحت کوشی، نفع بینی، خود غرضی ہی وہ اقدار ہیں جن کا بازار میں چلن ہے۔ میکیاوَلی کی طرح مارکس بھی یہی کہتا ہے کہ نیکی وہ ہے جو پیداوار کی فراوانی میں مدد دے اور برائی وہ جو اس کی وسعتوں کی راہ میں حائل ہو۔

پھر وہ کہتا ہے کہ ایک معاشی نظام کے عروج کے وقت اس کے مختلف طبقات میں باہمی نفرت، کھلی ہوئی مبارزت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ تصادم اس نظام کی تخریب کا باعث اور ایک نظامِ جدید کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔ ساری تاریخ ان ہی طبقاتی تصادم (CLASS STRUGGLES) کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح کتے ہڈی پر لڑتے ہیں اسی طرح انسان ہمیشہ روٹی کی خاطر لڑتا رہا ہے۔ اس کو وہ (ECONOMIC INTERPRETATION OF HISTORY) "تاریخ کی اقتصادی تعبیر" قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نوعِ انسانی کی تمام تاریخ عبارت ہے، فقط روٹی کی جنگ سے۔ چنانچہ وہ اشتمالی منشور (COMMUNIST MANIFESTO) کے پہلے صفحہ پر لکھتا ہے:

> انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء و جمہور، سرمایہ دار اور مزدور ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ لڑائی صدیوں سے یوں ہی مسلسل جاری ہے۔ کبھی اس کی آگ دھیمی پڑجاتی ہے اور مخفی طور پر اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور کبھی اس کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ پھر اس کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک انقلاب پورے معاشرے کو بدل ڈالتا ہے یا پھر دونوں برسرِ پیکار طبقے مٹ جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشی نظام کی یہ جدلیت (تصادم و تزاحم) پیدا کیوں ہوتی ہے؟ کیوں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے؟ مارکس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ چیز تاریخی مقتضیات (HISTORICAL NECESSITY) میں سے ہے۔ یعنی اس تبدیلی کے لئے کوئی خاص مقصد محرک نہیں ہوتا۔ مادی کائنات کی ہر شے ایک اندھی فطرت کے تابع چل رہی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے تقاضے بھی اندھے ہیں۔ ان ہی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ ایک معاشی نظام دوسرے سے ٹکرائے اور دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے۔ چونکہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) صرف تبدیلی کا خواہاں ہے اس لئے ضروری نہیں کہ نیا نظام پہلے نظام سے بہرحال بہتر ہو۔ تاریخی وجوب صرف یہ چاہتا ہے کہ پہلا نظام بدل جائے اور اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے۔ جب یہ تبدیلی ایک بلا مقصد قانون

تاریخ کے ماتحت واقع ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس انقلاب میں حصہ لینے والے بھی کسی "کارِ خیر" میں ممد و معاون نہیں ہوتے بلکہ "ایک ہو کر رہنے والے واقعہ" کے جلد بروئے کار آجانے میں معاونت کرتے ہیں۔ اسی لئے مارکس کے نزدیک تاریخ کی بڑی بڑی ہستیوں کی عظمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انہوں نے کسی ایسے انقلاب کے وقت اس جماعت کی قیادت کی جو نظامِ کہن کی جگہ نظامِ جدید کی تخلیق میں ممد و معاون تھی، خواہ یہ نظامِ جدید کیسا ہی کیوں نہ تھا۔

سلیم! تم نے دیکھا ہے کہ اس انقلاب میں انسان کس طرح، تاریخی وجوب کے ہاتھوں، ایک بے جان آلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک بات تمہارے لئے یقیناً وجہِ ہزار استعجاب ہوگی۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ مغرب نے خدا کا انکار اس لئے کیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے سے اسے خدا کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی تھی جس سے انسانی ارادہ و اختیار سلب ہو جاتا تھا۔ لہٰذا، دہریت یا مادہ پرستی، انسانی اختیار و ارادہ کو حدود فراموش قرار دیتی ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا کے انکار سے انسانی عظمت کی بلندی ہوتی ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی دنیا کا آپ مالک و مختار قرار پاتا ہے۔ لیکن تم حیران ہو گے کہ یورپ کی مادہ پرستی انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ کی بجائے مجبورِ محض بنا دیتی ہے۔ بظاہر یہ چیز متضاد سی نظر آئے گی۔ لیکن حقیقت بالکل یہی ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رُو سے کائنات میں ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے اور انسان عملِ ارتقاء کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ انسانی عقل، شعور، فکر سب اسی حیاتیاتی ارتقاء (BIOLOGICAL EVOLUTION) کا نتیجہ ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں، اس لئے انسان ارتقائی طور پر مجبور ہے۔ یعنی انسان اسی عمل کی اگلی کڑی ہے جس کی پچھلی کڑی حیوانات کی زندگی ہے۔ لہٰذا، انسان اور حیوان میں فرق صرف درجہ (DEGREE) کا ہے، نوعیت (QUALITY) کا نہیں۔ یہ حیاتیاتی جبریت (BIOLOGICAL DETERMINISM) ہے، قدریت نہیں ہے۔ مارکس آیا تو اُس نے کہا کہ انسانی اقدار اس کے خارجی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں اور خارجی ماحول ہوتا ہے تاریخی وجوب کا نتیجہ۔ انسان کو نہ تاریخی وجوب کے بدلنے پر اختیار ہے، نہ خارجی ماحول کی تبدیلی پر قدرت۔ لہٰذا اس کے نظریہ کی رُو سے بھی انسان مجبورِ محض ہے۔ دونوں میں بھی فکری مماثلت تھی جس کی وجہ سے مارکس نے ڈارون سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی ایک کتاب کا انتساب قبول کر لے۔ ڈارون حیاتیاتی جبر (BIOLOGICAL DETERMINISIM) کا امام اور مارکس معاشی جبر (ECONOMIC DETERMINISM) کا قائل۔ اسی طرح نفسیات کی دنیا میں آیئے تو ڈاکٹر واٹسن کا نظریہ (BEHAVIOURISM) انسان کے تمام اختیار و ارادہ کو چند غدودوں کی ساخت اور عملِ تخریج (SECRETION) کا پابند بنا دیتا ہے۔

اور جنگ اور ایڈلر سے پوچھئے تو وہ اسے یکسر ماحول و وراثت کا رہینِ منت قرار دیتے ہیں. خود ان کے امام فرائڈ کو لیجئے تو وہ شعور کو غیر شعوری دُنیا کی زنجیروں سے بندھا ہوا بتاتا ہے. تم نے دیکھا سلیم! مغرب کی مادیت کس طرح انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ کی بجائے مجبورِ محض بنا دیتی ہے. چونکہ اخلاق کی ساری عمارت انسانی ارادہ پر استوار ہوتی ہے اور مغرب کی مادیت اس سے اس کا ارادہ سلب کر لیتی ہے اس لئے وہاں اخلاق کا کوئی ضابطہ باقی ہی نہیں رہ سکتا. یہی وجہ ہے کہ مارکس کے فلسفہ میں بھی اخلاق کے لئے کوئی جگہ نہیں. لہٰذا جب اشتراک کے حامل، مزدوروں کی حمایت میں علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں تو یہ کسی اخلاقی جذبۂ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتا. کیونکہ اخلاقی اقدار کا ان کے ہاں تصور ہی نہیں. بلکہ یہ انقلاب ایک تاریخی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے اور یہ لوگ اس تقاضے کا ساتھ دیتے ہیں.

سلیم! تم کسی اشتراکی سے پوچھو کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کیوں کرنی چاہیئے؟ وہ لامحالہ یہی کہے گا کہ یہ عقل کا تقاضا ہے. اس سے پوچھو کہ کس کی عقل کا؟ سرمایہ داروں کی عقل کا تقاضا تو اس کے خلاف ہے. لہٰذا یہ معاملہ عقل سے طے نہیں ہو سکتا. اور اگر وہ کہے کہ یہ انسانی فرض ہے تو پوچھو کہ انسان پر یہ فریضہ کس نے عائد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو عائد کرنے والی قوت، مزدوروں اور سرمایہ داروں، یعنی انسانوں سے ماوراء ہونی چاہیئے. اشتراکی فلسفہ کسی ایسی قوت کا قائل ہی نہیں. لے دے کے وہ یہ کہے گا کہ یہ تاریخی اقتضاء ہے. تو یہ سوائے اعترافِ عجز کے اور کچھ نہیں. یعنی جب "ایسا کیوں ہونا چاہیئے" کا کوئی جواب نہیں پاتے تو اس کے لئے کوئی مبہم سا نام رکھ لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وجہ دریافت کر لی ہے. ڈاروِن کی "اندھی فطرت" اور مارکس کا "تاریخی وجوب" سب نام ہیں. وہی نام جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَاءُكُمْ (یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں). کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سلیم! قرآن نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے.

سلیم! کہیں تم اکتا تو نہیں گئے؟ ہر چند میں نے کوشش کی ہے کہ بات فلسفیانہ نہج و اسلوب سے ہٹ کر عام انداز میں کی جائے لیکن فلسفہ کی یبوست (بوریت) اپنا اثر بہرحال قائم رکھتی ہے. بات چونکہ ذرا پھیل گئی ہے اس لئے قطع شدہ منزل پر نگہ بازگشت ڈال لینا ضروری ہے. مارکس کے فلسفہ کا ماحصل یہ ہے کہ

۱. خدا کا تصور ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ ہے. لہٰذا مذہب بہت بڑا فریب ہے.

۲۔ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاشی ہے۔

۳۔ جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو اس نظامِ کہن کی ضد ہوتا ہے۔

۴۔ ہر معاشی نظام میں طبقات کی نزاع لاینفک ہوتی ہے۔ ساری تاریخ ان ہی طبقاتی نزاعات کی داستان ہے۔

۵۔ معاشی نظام کے پیدا کردہ ماحول سے انسانی ذہن متأثر ہوتا ہے اس لئے اس کے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد سب اسی ماحول کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔

۶۔ چونکہ معاشی نظام اور اس کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول بدلنے والی چیزیں ہیں۔ اس لئے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد کی دنیا میں کوئی مستقل قدر نہیں۔ نیکی وہ جو دولت کی پیداوار میں فراوانی کا موجب ہو اور بُرائی وہ جو اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔

۷۔ یہ سب سلسلۂ تغیّر و تبدّل ایک مبہم نظریہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب کہتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک، سرمایہ داری کا حامی، خدا کے بعد حکومت کا وجود ہے۔ اس لئے کمیونزم ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق چاہتا ہے جس میں نہ خدا کا وجود ہو نہ حکومت کا۔ اسے (ANARCHY) یا فوضیت کہتے ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری دَور سے بھی گزرنا پڑتا ہے جس میں مزدوروں کی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کی حکومت ہو گی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں لینن نے انقلابِ روس کے بعد وہاں آمریت قائم کی۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مرگیا اور اس کی جگہ اب اسٹیلن[1] روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ مارکس منشورِ اشتراکیت (COMMONIST MANIFESTO) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا تھا اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسرِ اقتدار آ کر عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کرنا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی اور انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظامِ معاشرت کو سلح

---

[1] یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب اسٹیلن ہنوز زندہ تھا۔

قوّت کے ذریعے تباہ کر دیا جائے۔

لینن لکھتا ہے کہ:

سرمایہ داری کی غیر مرئی قوّتوں نے ذہنِ انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے جس سے ایک حاکمِ اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی۔ اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا سو جب تک خدا کا تخیل ذہنِ انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے، یہ لعنت کسی طرح دُور نہیں ہو سکتی۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے" اس لئے مارکس ازم کی رُو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلہ کار ہیں جن کے توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال کیا جاتا اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہٰذا نفسِ مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔

اخلاق کے متعلق لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے۔ اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوّت و سطوت کا استحکام و استبقار کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے، سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا، ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔

یہ فریب دہی اور دروغ بافی، دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عندالضرورت خود اپنی جماعت کے افراد کے خلاف بھی ان ہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (GOLLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ (DR. G. LUCKUZ) سے پوچھا گیا کہ اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب و فریب دہی سے کام لیں؟ تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت

بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

اب رہا طریقِ کار۔ سو اس کے متعلق لینن اپنی کتاب (STATE AND REVOLUTION) میں لکھتا ہے کہ

سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آ جانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ، انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لینن لکھتا ہے :-

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ، دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط قوت و استیلاء، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

ڈکٹیٹر شپ کے متعلق اسٹالن (STALIN) اپنی کتاب (LENINISM) میں خود لینن کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سُن لیں اور خوب غور سے سُن لیں کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں "قوت"، غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

میں نے سلیم! یہ اقتباسات اس لئے دے دیئے ہیں تاکہ تم دیکھ سکو کہ مارکس ازم کے ماتحت جس قسم کا نظامِ معاشرت قائم ہوگا اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہوں گے، اس کے مقاصد کیا ہوں گے اور طریقِ کار کیا۔ خدا کی نفی، ضوابطِ اخلاق کی نفی اور حکومت کی نفی۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا اِلٰہ

حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم، سرمایہ داری کے خلاف ایک شدید ردِ عمل ہے جس کے پیشِ نظر صرف تخریب ہی تخریب ہے، تعمیر کا پہلو اس میں کہیں نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم محض تخریبی فلسفۂ حیات سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندگی کا تقاضا مثبت فلسفہ ہے۔ اگر تخریب کسی تعمیر کا پیش خیمہ نہیں تو اس تخریب سے کچھ فائدہ نہیں۔

لا و الّا ساز و برگِ اُمتاں　　　نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں کمیونزم یعنی وہ فلسفۂ زندگی جو ہیگل کے فلسفۂ اضداد سے شروع ہوا، پھر مارکس نے اس کی بنیاد خالص مادیت پر رکھی اور روس میں لینن اور سٹالن کے ہاتھوں اس نے ایک عملی نظام کی صورت اختیار کی۔ اب اس کے اجزائے ترکیبی یوں قرار پائے کہ

(۱) خدا کا تصور سرمایہ داری قوتوں کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ذہنِ انسان کو اس ڈر سے نجات دلانی چاہیئے۔

(۲) ضوابطِ اخلاق، نظامِ سرمایہ داری کے قائم کردہ ہیں اس لئے انہیں توڑنا ضروری ہے۔

(۳) انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاش کا ہے۔ افکار و تصورات اور اخلاق و شرائع سب اس کے تابع رہنے چاہئیں۔

(۴) جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔

(۵) یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، تاریخی اقتضاء کے تحت از خود رونما ہوتا رہتا ہے۔

(۶) جماعتی نزاع ہر معاشی نظام میں لاینفک ہوتی ہے اور حکومت ان افراد پر مشتمل جن کے ذاتی مفاد نظامِ سرمایہ داری سے منسلک ہوتے ہیں۔

(۷) لہٰذا نظامِ جدید میں جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے گا اور خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ حکومت کے وجود کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔

یہ تو ہے کمیونزم۔ اب اس فلسفۂ زندگی کے مقابلہ میں اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کمیونزم اور اسلام میں کیا فرق ہے، اسلام کے فلسفۂ زندگی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر سمجھ لو سلیم! کہ میں اس وقت صرف فلسفۂ زندگی سے بحث کر رہا ہوں، اسلام کے احکام و ارکان سے بحث نہیں کر رہا۔ اس فلسفۂ زندگی کے متعلق میں بہت کچھ تمہیں لکھ چکا ہوں لیکن معلوم نہیں کہ وہ مربوط طریق سے تمہارے ذہن میں مستحضر ہے یا نہیں۔ اس لئے مختصر الفاظ میں اس فلسفۂ زندگی کی اہم شقوں کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ذرا غور سے سنو کہ یہ باتیں بڑی اہم ہیں اور جب تک تم انہیں سینے کی آنکھوں سے نہیں پڑھو گے اور دل کے کانوں سے نہیں سنو گے، اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(۱) کائنات کی پیدا کرنے والی اور اسے چلانے والی ایک اعلیٰ ہستی ہے جسے ہم خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔

(۲) کسی شے کو مخلوق اس وقت کہتے ہیں جب وہ محسوس و مشہود پیکر میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کا تعلق عالمِ امر سے ہوتا ہے۔

(۳) مادہ میں ہر آن تغیّرات رونما ہوتے رہتے ہیں، لیکن عالمِ امر تغیّرات سے ماوراء ہے۔

(۴) عالمِ امر سے جو کچھ متعلق ہو گا وہی مستقل ہو گا۔ مستقل کو حق کہتے ہیں۔ یعنی جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ خدا حق ہے اور اس کا امر بھی حق۔

(۵) خدا نے کائنات کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے، لہٰذا کائنات کے تغیّرات و حوادث یونہی اتفاقی اور ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتے بلکہ ایک ہدایت (DIRECTION) کے تحت ہوتے ہیں۔

(۶) یہ ہدایت، عالمِ امر ہی سے مل سکتی ہے، کیونکہ وہی تغیّرات سے ماوراء ہے۔ اس ہدایت کے تحت سلسلۂ کائنات اپنے مقصدِ متعیّنہ کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کائنات کی "تخلیق بالحق" ہوئی ہے۔

(۷) کائنات کی ہر شے، بلا چون و چرا، اس ہدایت کے مطابق سرگرمِ عمل ہے، لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔

(۸) یہ اختیار و ارادہ مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں کیونکہ مادہ مجبور ہے اور جو خود مجبور ہو وہ اختیار پیدا نہیں کر سکتا۔

(۹) یہ اختیار و ارادہ اور حیات و شعور، شئونِ الٰہیہ کی ایک شان (ASPECT) ہے، جسے انسان کے مادی پیکر میں پھونک دیا گیا ہے۔ یہ انسانی انا (SELF) ہے۔ یاد رکھئے! انسانی انا یا ذات، خدا کی عطا کردہ ہے۔ نہ یہ مادہ کی پیدا کردہ ہے اور نہ ہی خود خدا ہے۔

(۱۰) یہ انا تمام انسانوں میں قدرِ مشترک ہے۔ اسی اشتراک سے انسانی اشتراک کی بنیاد پڑتی ہے۔ یعنی مساواتِ انسانی۔

(۱۱) انسان کو بھی اسی عالمِ امر سے ہدایت (DIRECTION) ملتی ہے جہاں سے کائنات کی دیگر اشیاء کو ہدایت مل رہی ہے۔ اس ہدایت کو "وحی" کہا جاتا ہے۔

(۱۲) وحی مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) متعین کرتی ہے اور ان ہی اقدار کا نام اصولِ دین ہے۔

(۱۳) انسان سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر گوشے میں، ان مستقل اقدار کے مطابق کام کرے۔

(۱۴) انسانی فکر اور عمل جس قدر ان مستقل اقدار سے ہم آہنگی اختیار کرتا جائے گا، اسی قدر اس کے انا میں "شانِ استحکام" پیدا ہوتا جائے گا (اسے تعمیرِ سیرت یا استحکامِ خودی کہا جاتا ہے)۔

(۱۵) کائنات کی کوئی شے انفرادی طور پر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف عوامل میں باہمی تعاون و تناصر ہو۔ اسی ربطِ باہمی سے تمام سلسلۂ کائنات قائم ہے۔

(۱۶) یہی اصول انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اس لئے اس مقصدِ عظیم کے لیے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانوں کو باہمی تعاون و تناصر سے کام لینا ہوگا (اسے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کہا گیا ہے)۔ اس ربطِ باہمی سے سوسائٹی (جماعت) کا وجود قائم ہوتا ہے۔ ایک ربط صرف (CO-OPERATIVE SYS) کا ہوتا ہے۔ یہ اتحاد ہے۔ اسلام اس سے آگے لے جاتا ہے اور اتحاد کی بجائے ائتلاف کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی ایسا ربط جیسے درخت کے بیج، مٹی، پانی اور ہوا کا ربط ہوتا ہے کہ ان سب کے ائتلاف سے ہر ایک کے جوہرِ پوشیدہ کی نشوونما ہوتی ہے اور ان کا نتیجہ ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔

(۱۷) اس جماعت کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی زندگی کو مستقل اقدار کے تابع رکھے اور پھر ان مستقل اقدار کو عالمگیر حیثیت سے تمام نوعِ انسانی تک پھیلائے۔ (اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں)۔

(۱۸) چونکہ دنیا میں ایسے لوگ (جماعتیں اور قومیں) موجود ہیں جو "مستقل اقدار" کے نفاذ پذیر ہو جانے میں اپنے ان ذاتی منافع و مصالح کا نقصان محسوس کرتے ہیں جو انہوں نے غاصبانہ طور پر حاصل کر رکھے ہیں۔ اس لئے وہ اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۱۹) اس مخالفت کی روک تھام قوت کے بغیر ناممکن ہے، لہٰذا، اس جماعت کے لئے جس کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، قوت کا ہونا لاینفک ہے۔ اس نظام یا قوت کو "نظامِ حکومت" کہتے ہیں۔

(۲۰) اس نظام اور انسانی خود غرضیوں پر مبنی غاصبانہ نظامہائے معاشرت میں تصادم ضروری ہے۔ اسی کا نام خیر و شر کی جنگ ہے۔ حق و باطل کی لڑائی ہے۔ تاریخ اسی تصادم کی داستان کا نام ہے۔ نمرود و ابراہیمؑ، فرعون و موسیٰؑ، بولہب و محمدؐ اسی تصادم کے مظاہر ہیں۔

(۲۱) مستقل اقدار کے تابع قائم شدہ نظامِ زندگی کا فطری نتیجہ ربوبیت اور عدل ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں آغاز سے اختتام تک کی تمام منازل میں سامانِ پرورش کی فراہمی۔ اور عدل سے مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کی فطری صلاحیتوں کے مکمل طور پر ابھرنے اور نشوونما حاصل کر لینے کے یکساں مواقع مہیا کرنا۔

(۲۲) اس معاشرہ میں عدل کے ساتھ احسان بھی ہوتا ہے۔ احسان، حسن سے ہے اور حسن کے متعلق تم جانتے

ہی ہو کہ یہ توازن (PROPORTION) کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا احسان سے مفہوم ہے معاشرہ میں توازن کا قیام۔ اگر کسی ایک فرد یا گروہ میں ہنگامی حوادث سے کسی چیز یا کسی صلاحیت میں کمی آگئی ہے تو باہمی ترتیب (ADJUSTMENT) سے اس کمی کا اس طرح پورا کرنا کہ نظامِ معاشرہ میں توازن قائم ہو جائے۔ توازن کے بگڑنے کا نام فساد ہے اور قرآن، فساد کو طاغوتی نظام کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رُو سے دنیا میں جو اصلح (THE FITTEST) نہیں اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ لیکن اس نظامِ عدل و احسان میں جو (THE FITTEST) نہیں اسے (THE FITTEST) بنایا جائے گا۔ اسی لئے اس نظام کا اصول "بَقَاءُ لِلْاَنْفَعْ" ہے۔ یعنی باقی وہ رہے گا جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو (سورۃ رعد)۔

(۲۳) اور اس نظام میں یہ کچھ یوں ہی "تاریخی وجوب" کے مبہم مفروضہ کے تحت میکانکی طور پر رونما نہیں ہوتا، بلکہ ہر فرد کے دل کے ارادوں، ذہن کی کاوشوں اور بازو کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس فرد کا ایمان ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہتی اور ظہورِ نتائج سانس کی آمد و رفت ہی کا پابند نہیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے، جو موجودہ مادی اجزاء کے پریشاں ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا ہر وہ عمل جو مستقل اقدار کے مطابق ہے (اسے مثبت سے ہم آہنگی اور رضائے الٰہی کا حصول کہئے) اس کے شرفِ انسانیت کی تکمیل کا موجب ہے (اور یہ جنت کا مقام ہے) اور ہر وہ کام جو ان اقدار کے خلاف ہے اس سے مقامِ انسانیت چھین لینے کا باعث (یہ جہنم کی زندگی ہے)۔

میں نے سلیم! کوشش کی ہے کہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں اسلام کا فلسفۂ حیات تمہیں سمجھا سکوں۔ خدا کرے کہ تم نے اس سلسلۃ المذہب کی ہر ایک کڑی کو اچھی طرح ذہن نشین ہی نہیں بلکہ دلنشین بھی کر لیا ہو۔ اگر کسی شق میں کوئی اشتباہ یا الجھاؤ محسوس کرو تو مجھ سے پھر پوچھ لینا۔ بہرحال، یہ ہے اسلام کی رو سے فلسفۂ زندگی۔ اب اس فلسفۂ زندگی کو اور اس فلسفۂ حیات کو جو کمیونزم پیش کرتی ہے، آمنے سامنے رکھو اور پھر خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟ تم واضح طور پر دیکھ لوگے کہ نہ صرف یہ کہ یہ دونوں ایک نہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کمیونزم کا بھی قائل ہو اور اسلامی فلسفۂ زندگی کا بھی۔

میں نے تمہارے خط کے اس حصہ کو بڑے غور سے پڑھا ہے جس میں تم نے لکھا ہے کہ

جب آپ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتلاتے ہیں تو اس سے موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو بڑی تقویت مل جاتی ہے اور مفاد پرست گروہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ کمیونزم اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا ان کی

روشِ زندگی، اسلام کے مطابق۔

میں اس خطرہ سے آگاہ ہوں۔ اس لئے اس حقیقت کو بھی واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام کا فلسفۂ زندگی اور نظامِ حیات کمیونزم کے خلاف ہے اسی طرح وہ مفاد پرستانہ اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے بھی خلاف ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور عجمی تصورات کی یادگار ہے۔ جہاں تک سرمایہ داری نظام کا تعلق ہے اسلامی نظام اس کا کمیونزم سے کم دشمن نہیں۔ اسلامی نظام کیا ہے؟

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اور جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

میرے لئے سلیم! اس وقت یہ ممکن نہیں کہ میں اسلام کے معاشی نظام کو وضاحت سے تمہارے سامنے رکھ دوں۔ اس وقت میں صرف اتنا بتا سکوں گا کہ اسلام نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اپنے نظام کے اندر آنے والے ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل۔ سرمایہ داری کی لعنت کی ابتدا زمینداری سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص دس ہزار ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ غریب کاشتکار سال بھر محنت کرتا ہے اور اس کی محنت کا ماحصل زمیندار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ جہاں تک سلیم! میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ قرآن زمین پر انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ زمین کو وہ ملّتِ اسلامیہ (نظامِ حکومتِ قرآنیہ) کی تحویل میں رکھتا ہے جو اس کی پیداوار کو افرادِ معاشرہ کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرتی رہتی ہے۔ زمین ہی نہیں بلکہ رزق کے جس قدر سرچشمے قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں دیکھو جہاں ارشاد ہے کہ

اللہ نے زمین کی سطح پر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں (ایسی چیزیں پیدا کیں جو موجبِ) برکات ہیں اور اس میں چار فصلوں میں خوراک کے سامان کا اندازہ متعین کیا۔ (ان سب کے دروازے

نواں خط

کمیونزم اور اسلام

(۲)

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے سلیم! میں نے کمیونزم کے متعلق تمہیں گزشتہ جولائی میں لکھا تھا تم نے ۹ ماہ کے بعد اس کے متعلق پھر ذکر کیا۔ لیکن مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات سمجھنے کے لئے اب انداز ٹھیک اختیار کیا ہے۔ اگر بات کو قرینے سے سلجھا لیا جائے تو اس کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔

تم کہتے ہو کہ کمیونزم کے دو اجزاء ہیں۔ ایک تو وہ فلسفہ جس کی ابتداء ہیگل نے کی اور اس کی بنیادوں پر مارکس نے عمارت بلند کی اور دوسرا جزو وہ معاشی نظام ہے جسے لینن نے ڈھالا اور اسٹالن اور اس کے رفقائے کار نے روس میں نافذ کیا۔ تم کہتے ہو کہ بحث صرف اس معاشی نظام تک محدود رکھنی چاہیئے جس کا تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ اس فلسفہ کو الگ رکھ دینا چاہیئے جس پر وہ نظام متفرع ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح بات زیادہ واضح ہو سکے گی تو یوں ہی سہی۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ تم کسی کمیونسٹ سے بات کرو، تو وہ مارکس کے فلسفے اور روس کے معاشی نظام، دونوں کے مجموعے کا نام، کمیونزم قرار دے گا۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ کمیونزم جس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اس فلسفہ زندگی کے بغیر، جس کی وہ پیداوار ہے، باقی رہ ہی نہیں سکتی۔ دوسری طرف اسلام کا معاشی نظام بھی اس فلسفہ زندگی سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسلام کا نظام ایسا کُل ہے جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ایک جسم نامی کی طرح ایک دوسرے میں یوں سموئے ہوئے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو باقیوں سے الگ کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کُل کے متعلق کچھ سمجھ میں نہیں آ سکتا بلکہ اس ایک جزو کو بھی صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

بایں ہمہ، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اگر تم معاشی نظام کو اس کے فلسفہ سے الگ کر کے ہی سمجھنا چاہتے ہو تو یوں ہی سمجھنے کی کوشش کرو۔ بالخصوص اس لئے کہ تمہاری یہ بات مجھے خوش آئی کہ "یہ کیا دلیل ہوئی کہ چونکہ روس

کمیونسٹ خدا کا قائل نہیں، اس لئے وہاں اشتمالی طریقِ زراعت قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔" معلوم نہیں تمہارے سامنے یہ دلیل کس نے پیش کر دی۔ لیکن تمہارے طنز کی شوخی اس کی حقدار ہے کہ تمہاری تسکینِ خاطر کا سامان اسی انداز سے بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتے۔

تم کہتے ہو کہ "اسلامی نظامِ معاش اور اشتراکی نظام میں فرق صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام ذاتی ملکیت ضروری قرار دیتا ہے اور اشتراکی نظام میں اس کی نفی ہوتی ہے۔ اس فرق کے سوا ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں"۔ قطع نظر اس کے کہ ان ہر دو نظامہائے معیشت میں "صرف یہی فرق" ہے یا کچھ اور بھی، میں پوچھتا ہوں کہ جس فرق کو تم نے "صرف یہ فرق" کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا ہے کہ اس طرح اسلامی نظام، اشتراکی نظام کے بہت قریب آ جاتا ہے، کیا وہ فرق تمہارے نزدیک ایسا ہی معمولی فرق ہے کہ اسے اس طرح نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے؟ سلیم میاں! تم اچھی وزن دار باتیں کیا کرتے تھے، تم نے سوچا ہی نہیں کہ یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ عزیزم! "یہ ذاتی ملکیت" ہی تو ہے جو دنیا میں نظامِ سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ تم اگر غور سے دیکھو، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سرمایہ داری اور اشتراکی نظامِ معاش میں بنیادی فرق ہی "ذاتی ملکیت" کا ہے۔ جب تم ذاتی ملکیت کا اصول مان لو، تو اس ملکیت کی تحدید (حد بندی) تو کی نہیں جا سکتی۔ اور ذاتی ملکیت "بلا تحدید" کا دوسرا نام سرمایہ داری ہے اور جب سرمایہ داری، ذاتی ملکیت ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا دوسرا نام ہے، تو ذاتی ملکیت اور اشتراکی نظام ایک دوسرے کے نقیض ٹھہرے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ ذاتی ملکیت کو ضروری قرار دینے والے نظام اور اشتراکی نظام میں فرق صرف "ذاتی ملکیت" ہی کا ہے، باقی ہر طرح سے وہ دونوں ایک ہیں، بہت بڑی جہالت یا خود فریبی کا ثبوت دینا ہے۔ تم سے تو مجھے اس کی توقع نہ تھی!

یہی دلیل ہے سلیم! جو آجکل عام طور پر اسلام اور اشتراکیت کے تقابل میں پیش کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اسلام میں ذاتی ملکیت ضروری ہے اور اشتراکیت اس کی نفی کرتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ذاتی ملکیت کو فی الواقع ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ بات سمجھ لینے سے باقی تمام باتیں خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔

اسلام میں سلیم! ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب تم پھر کہہ دو گے کہ میں نے ایک اور دنیا و جہان سے نرالی بات کہہ دی۔ لیکن قرآن کی ہر بات آج نرالی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مسلمان کے سامنے اور سب کچھ ہے بجز قرآن کے۔ لہٰذا، اس کے سامنے جب کبھی کوئی بات قرآن کی آئے گی تو وہ اسے نامانوس نظر آئے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ یہ تو کچھ نرالی سی بات ہے۔ لیکن اس میں قرآن کا تو قصور نہیں۔ قصور تو اس ذہنیت

کا ہے جو ہر غیر قرآنی تصور کو اسلامی سمجھے چلی آرہی ہے اور ہر قرآنی تصور ان کے نزدیک غیر اسلامی ہے۔

سلیم! اگر غور سے دیکھو تو معاشی نظام کا مسئلہ درحقیقت صرف اس قدر ہے کہ فرد اور جماعت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان کے حقوق و واجبات کے دوائر کیا ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس تمام مسئلہ کو ایک آیت میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر اس آیت کا صحیح مفہوم قرآن سے متعین کر لیا جائے تو وہ تمام اُلجھاؤ خود بخود دور ہو جاتے ہیں، جنہوں نے اس وقت مختلف قلوب و اذہان کو اس طرح پریشان کر رکھا ہے۔ قرآن نے ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کی بنیاد اس آیتِ مقدسہ پر رکھی ہے جس میں فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ نے مومنین کی جان اور مال خرید لئے ہیں اور اس کے بدلے میں انہیں جنّت عطا کرنے کا ذمّہ لے لیا ہے۔

یہ آیت اس معاہدہ (AGREEMENT) کی اصل ہے جس پر اسلامی نظامِ اجتماعیہ کی فلک بوس اور آفاق گیر عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاہدہ میں دو فریق ہیں۔ ایک فریق اللہ اور دوسرا فریق مومن اور دو چیزیں ہیں۔ ایک چیز جو بیچی جاتی ہے اور دوسری چیز اس کی قیمتِ فروخت ہے۔ مسلمانوں نے جب سے اللہ کو "عرش" پر بٹھا رکھا ہے اور جنّت کو صرف اگلے جہان سے متعلق کر رکھا، اس وقت سے، قرآن کے دیگر محکمات کو بیّنات کی طرح اس معاہدہ کا مفہوم و منطوق بھی چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن سلیم! غور کرو۔ اگر اللہ کو صرف ایک عقیدے کے طور پر مانا جائے اور اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ متعین نہ ہو سکے اور جنّت کے متعلق بھی اسی طرح صرف ایک عقیدہ ہی رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس عظیم القدر معاہدہ میں ایک فریق (یعنی فروخت کرنیوالا مومن) اور ایک شے (فروخت کردہ چیز — اموال و نفوس) تو محسوس و مشہود ہوں گے اور فریق ثانی (یعنی خریدار — اللہ) اور قیمتِ فروخت (جنّت) محض تصوّراتی۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا معاہدہ یا بیع و شریٰ کا معاملہ بھی سننے میں آیا ہے ؟ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک مسئلۂ زیرِ نظر کا تعلق ہے، پہلے آیت زیرِ بحث میں اللہ اور جنّت کا مفہوم متعین کر لیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق سلیم! انسان کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ معاملہ انسانی شعور و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اگر حقیقت یہ ہے تو پھر ہمارا اور اللہ کا تعلق کیا ہے ؟"

یہ بحث بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے لئے تمہیں کچھ عرصہ اور انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت اس وسیع و ہمہ گیر موضوع کے صرف ایک گوشہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ جہاں تک ہماری موجودہ زندگی اور اس کے معاملات کا تعلق ہے، ہمارا واسطہ اللہ کے قانون سے ہے۔ اس ضمن میں اگر سلیم! تم ایک اہم نکتہ کو سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اگر تم "اللہ کا قانون" کہہ لیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مثلاً "اَللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ" کا ترجمہ ہے۔ "اللہ ہی مارتا ہے اور وہی جلاتا ہے۔" اسے سمجھنے کے لئے تم یہ کہہ لیا کرو کہ "اللہ کا قانون مارتا ہے اور وہی زندہ رکھتا ہے۔" یعنی زندگی اور موت قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل و متعین ہوتی ہے یا "اللہ رزق دیتا ہے۔" یعنی رزق اللہ کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ "اللہ ہی بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے۔" یعنی بیماری اور شفا، اللہ کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ "ہر کام کا اجر اللہ دیتا ہے۔" یعنی ہر کام کا نتیجہ اللہ کے قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ "رنج و راحت سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں۔" یعنی مصیبت اور راحت سب قانونِ خداوندی کے مطابق ملتے ہیں: یا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ "یعنی اللہ کا قانون ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔" وقس علی ھذا۔

اب سلیم! ایک قدم اور آگے بڑھو۔ "اللہ کا قانون" ایک تو وہ ہے جو آفاقی کائنات میں ہر شے کو محیط ہے اور جس کے مطابق یہ تمام نگارخانۂ ہست و بود اس حسن و رعنائی سے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے اور اس قانون کا دوسرا حصہ وہ ہے جو قرآن کی دفتین میں نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے محفوظ ہے۔ آفاقی قانونِ خداوندی، از خود، ہر جگہ نافذ العمل ہے، کیونکہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ لیکن دنیائے انسانیت میں خدا کا قانون انسانوں کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوگا، کیونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے لئے ایک ہیئتِ اجتماعیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کا نام ہے ملتِ اسلامیہ، جس کا فریضۂ حیات، قانونِ خداوندی کا نفاذ ہے۔ لہٰذا جب انسانی دنیا سے متعلق، قانونِ خداوندی کا ذکر ہوگا تو وہاں "اللہ" سے مراد ہوگا ملت کا وہ اجتماعی نظام جو اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد قرآن کے اور بہت سے گوشوں کا مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ كُونُوا أَنْصَارَ اللّٰهِ "تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔" اب ظاہر ہے کہ اللہ تو انسانوں کی مدد کا محتاج نہیں۔ اس لئے اس کے معنی واضح ہیں کہ افرادِ جماعت کو چاہیئے کہ وہ اپنے نظامِ اجتماعیہ کی مدد کریں جو خدا کا قانون عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یا مثلاً وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا "اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔" سو اللہ تو کسی کے

قرض کی احتیاج نہیں رکھتا، لہٰذا اس کا مفہوم واضح ہے کہ افرادِ جماعت پر لازم ہے کہ وہ اپنا مال قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے والے نظامِ اجتماعیہ کے سپرد کریں تاکہ وہ ملّت کے کمزور گوشوں کی کمی پوری کر کے اس میں توازن قائم رکھ سکے (حَسَنًا سے یہی مفہوم ہے)۔

ان تصریحات سے سلیم! تم یہ سمجھ گئے ہوگے کہ" اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ اللّٰهَ لَهُمُ الْجَنَّةَ " کے معاہدہ میں فریقِ اوّل یعنی" اللہ" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد ہے ملّت کا وہ نظامِ اجتماعیہ جو دنیا میں قانونِ خداوندی نافذ کرنے کا ذمّہ دار ہے۔ یعنی یہ آیتِ جلیلہ درحقیقت ملّت اور افراد کے باہمی تعلق کا منشور ہے۔ اس معاہدہ میں فریقین کا تعین ہو گیا۔ اس مقام پر اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب میں کہتا ہوں کہ اس آیت (یا اس قسم کی دیگر آیات) میں' اللہ' سے مراد وہ نظامِ معاشرہ ہے جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذمّہ دار ہے' تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ خدا اور نظامِ معاشرہ ایک ہی چیز ہے۔ بالکل نہیں۔ خدا کی ذات اپنے آپ میں محکم' اٹل اور قائم و دائم ہے۔ وہ کائنات کی فاطر' نظامہائے زندگی کی خالق اور اپنے غیر متبدل قوانین کو نافذ کرنے والے اقتدار کی واحد اور کلّی مالک ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جہاں اللہ نے اپنے اس قانون کا ذکر کیا ہے جو اس نے انسانوں کی دنیا کے لئے متعین کیا ہے تو اس سے عملی مفہوم وہ نظام ہے جو اس قانون کو نافذ العمل کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ امید ہے کہ اس سے بات واضح ہو گئی ہو گی۔

بہرحال' یہ واضح ہو گیا کہ جس معاہدہ کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے اس میں ایک فریق وہ نظامِ معاشرہ ہے جو قوانینِ خداوندی کو عمل میں لانے کے لئے متشکّل ہوتا ہے اور دوسرا فریق افرادِ معاشرہ ہیں۔

اب بیع و شریٰ کی اشیاء کی طرف آیئے۔ اس معاہدہ کی رُو سے افراد یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ اپنا مال (یعنی ماحصلِ اکتساب) اور جان (یعنی عطایائے خداوندی) نظامِ خداوندی کے حوالے کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں نظام ان کے لئے جنّت کا ذمّہ دار بنتا ہے۔

جس طرح ہم نے اس معاہدہ میں اللہ کے صحیح مفہوم کا تعین کیا ہے' اسی طرح جنّت کا مفہوم متعین کرنا بھی ضروری ہے۔

جس طرح ہم نے غلط نگہی سے اللہ کو" عرش" پر بٹھا رکھا ہے اسی طرح جنّت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں اور ان کا سلسلہ

آخرت تک مسلسل چلا جاتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس خط میں، اس اہم موضوع کے متعلق بھی میں تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ جنت، دوزخ، قیامت، الساعت، بعثت، میزانؒ سب اسی اہم موضوع کے غور طلب گوشے ہیں۔ جب سلیم! قرآن کی روشنی میں ان گوشوں سے پردے اٹھیں گے تو تمہارے سامنے ایک نئی دنیا آجائے گی اور اس وقت تم قرآن کی عظمت اور رفعتِ حقائق پر وجد کرو گے۔ اس وقت اتنا سمجھ لو کہ جب نظامِ زندگی، قانونِ خداوندی کے مطابق استوار ہو کر، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں توازن قائم کر دے تو اس سے "انسانیت کا قیام" ظہور میں آجاتا ہے اور اس سے صفحۂ ارض پر جنت کی بساط بچھ جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کی جنت ہے۔ اور چونکہ سلسلۂ حیات غیر منقطع طور پر آگے بڑھتا ہے اس لئے اس جنت کی وسعتیں طبعی موت کے بعد کی زندگی کو بھی محیط ہو جاتی ہیں۔ اس جنتِ ارضی کی تفاصیل قرآن کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے، موضوعِ زیرِ نظر کے اعتبار سے اس کی اہم شقیں یہ ہیں کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں کسی کو بھوک، پیاس، لباس اور مکان کی تکلیف نہ ہوگی۔ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) نہ اس میں مشقت اور صعوبت ہوگی، نہ افسردگی اور پژمردگی، خوف اور حزن بھی نہیں (۳۵/۳۴)۔ ہر طرح سے سلامتی ہی سلامتی ہوگی (۵۶/۲۶)۔ لہٰذا، ارضی جنت اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات بغیر کسی ذہنی واماندگی اور کبیدگیٔ خاطر کے میسر آتی رہیں۔ اپنی حفاظت کی طرف سے کامل اطمینان ہو اور ہر شخص کے فطری جوہروں کی نمود و ارتقاء کے سامان مہیا ہوں۔ یہ ہے اس دنیا کی جنت سے مفہوم۔

اب سلیم! تم اس قرآنی معاہدہ پر غور کرو۔ افرادِ ملت، اپنی اکتسابی اور وہبی استعدادوں کے ماحصل کو قرآنی نظامِ اجتماعیہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور نظامِ اجتماعیہ ان کے خورد و نوش، مکان، لباس، حفاظت اور نشوو ارتقاء کے دیگر ضروری اسباب و ذرائع کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ان افراد کی اپنی ضروریات کی بھی اور ان کے بچوں کی بھی۔ کیونکہ "جنت" میں ان کے ساتھ ان کی ذریت بھی شامل ہوتی ہے: وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (۵۲/۲۱)۔ اب اس نظام کی ترتیب یوں ٹھہری کہ اس میں شامل ہونے والے تمام افراد کی جملہ ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ نشوو ارتقاء کی ذمہ داری اس نظام نے لے لی اور مختلف افرادِ ملت کے سپرد ان کے استعداد کے مطابق مختلف کام کر دیئے۔ کسی کے سپرد زمین کا ٹکڑا کر دیا کہ وہ ہل جوتے۔ کسی کو صنعت و حرفت کے کسی شعبے میں لگا دیا۔ کسی کی تحویل میں

ؒ ان تمام موضوعات کی تفصیل پرویز صاحب کی کتاب "جہانِ فردا" میں ملے گی — طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔

مبادلہ اشیائے ضروریہ دے دیا۔ کسی کو تعلیم و تربیت کا مقرر کر دیا۔ کسی کے ذمہ نظم و نسق ہیئتِ اجتماعیہ (کاروبارِ حکومت) لگا دیا۔ اربابِ فکر و نظر کو مصالحِ ملی اور انسانیت کے مستقبل کی تدابیر سونپ دیں۔ وقس علیٰ ھٰذا۔
اب یوں سمجھو کہ مثلاً ایک شخص نے ایک دن میں پانچ روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے دس روپے درکار ہیں۔ تو نظامِ اجتماعیہ جس نے اس کی "جنت" کا ذمہ لے رکھا ہے، اسے پانچ روپے اور دیگا اور اس امداد کے لئے یہ شخص کسی طرح بھی زیر بارِ منت نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اس معاہدہ کی رُو سے جو اس نے اس نظام سے کر رکھا ہے اس کمی کے پورا کئے جانے کا حق دار ہے۔ اس کے برعکس، اگر کسی شخص نے دن بھر میں دس روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریات کے لئے پانچ ہی روپے کفایت کرتے ہیں تو بقایا پانچ روپے (جسے قرآن نے "اَلْعَفْو" کہا ہے) نظامِ اجتماعیہ کی ملکیت ہیں کیونکہ اس فردِ کاسب نے اپنا تمام مال اس نظام کے ہاتھوں بیچ رکھا ہے۔ اب اگر ضروریاتِ اجتماعی کا تقاضا ہے کہ اس فاضلہ رقم کو نظامِ اجتماعیہ اسی وقت اپنی تحویل میں لے لے، تو وہ رقم فوراً ان کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس کی فوری ضرورت نہیں تو یہ بطور امانت اس شخص کی تحویل میں رہے گی۔ اب ظاہر ہے کہ امانت کو کسی صورت میں بھی ملکیت نہیں کہا جا سکتا۔
کہو سلیم! اس نظام میں ذاتی ملکیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اَلْعَفْو (ضروریات سے فاضل) بطور امانت فردِ متعلقہ کی تحویل میں رہ سکتا ہے۔ اب یہ چیز اس نظام کے اختیار میں ہے کہ اس تحویل کے لئے جس قسم کے قواعد و ضوابط چاہے متعین کر دے۔
اس کے لئے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآنی نظام میں انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ عام روزمرہ کے استعمال کی اشیاء بھی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتیں۔ یہ ظاہر ہے کہ گھر کے اندر بہت سی استعمال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کے انتخاب میں انفرادی ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ لباس، برتن، فرنیچر، مویشی اور سواری کے جانور، دیگر اشیائے ضروریہ، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب "انفرادی ملکیت" میں رہیں گی۔ لیکن اس ملکیت اور نظامِ سرمایہ داری کی ملکیت میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔
اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن میں اس عبوری دور سے متعلق احکام بھی آئے ہیں جس میں ہنوز قرآنی نظام متشکل نہ ہوا ہو (اس کی تفصیل آگے آتی ہے)۔
یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں انفاق فی سبیل اللہ (خیرات وغیرہ) کے لئے ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے۔ اگر افرادِ ملت، اپنے معاہدہ کی رُو سے، اپنے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کے پاس

فروخت کر چکے ہوں اور ان کی ضرورت سے زائد مال ان کی تحویل میں بطور امانت رکھا جانا مقصود ہو تو اس امانت کے واپس دینے کے لئے ترغیب و تحریص کی کیا ضرورت ہے؟ نظامِ اجتماعیہ جب جی چاہے اس امانت کو واپس لے لے. ترغیب و تحریص سے تو ظاہر ہے کہ یہ مال افرادِ متعلقہ کی ملکیت ہے اور نظامِ اجتماعیہ اسے ان کی مرضی کے خلاف ان سے نہیں لے سکتا.

یہ اعتراض واقعی ایک شبہ پیدا کرتا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے. پہلے تو یہ دیکھو کہ اس معاہدہ کی رو سے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، افرادِ ملت صرف اپنا مال ہی ملت کے ہاتھوں نہیں بیچتے، بلکہ اپنی جانیں بھی بیچ دیتے ہیں. جس سے لامحالہ یہی مفہوم ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت یہ تمام افراد سپاہیانہ حیثیت سے فوج کی صفوں میں آ جاتے ہیں. اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اسلامی نظامِ اجتماعیہ میں تمام مسلمان (اپنے اس معاہدہ کی رُو سے) فوج کے سپاہی ہوتے ہیں. اس میں انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا. لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت کے لئے بھی آیاتِ ترغیب و تحریص کی کمی نہیں. جس طرح انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ترغیب دلائی گئی ہے، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھی تحریص و تشویق کی صورت اختیار کی گئی ہے. لہٰذا، اگر تحریص و ترغیب کی آیات سے یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ معاملہ افرادِ ملت کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے تو مومنین کے لئے فوجی خدمت بھی اختیاری رہ جائے گی. حالانکہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ فوجی خدمت ہر مردِ مومن پر لازم ہوتی ہے. ہر مومن خدا کا سپاہی ہوتا ہے اور ہر وقت جہاد کے لئے تیار. لہٰذا، اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ محض آیاتِ ترغیب و تحریص کی موجودگی سے یہ لازم نہیں آتا کہ نظامِ اجتماعیہ مومنین کے جان و مال میں تصرّف کا حق نہیں رکھتا کیونکہ یہ افراد کی ملکیت ہوتے ہیں.

آیاتِ ترغیب و تحریص سے سلیم! دو باتیں مقصود ہیں. ایک تو یہ کہ قرآن ان حالات کو بھی سامنے رکھتا ہے جن میں ہنوز نظامِ اجتماعیہ اپنی مکمل شکل میں قائم نہ ہوا ہو. ان حالات میں اموال و نفوس افراد کی ملکیت میں رہیں گے اور انہیں اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ان کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکے گا. اس کے لئے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہو گی. یعنی انہیں یہ بتانے کی کہ اگرچہ سرِدست انہیں ان کے اموال و نفوس کی قربانی کے بدلے میں کوئی مشہود معاوضہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر وہ ان دیکھے نتائج پر یقین رکھیں (جسے ایمان بالغیب کہتے ہیں) تو ان کا انفاق و جہاد فی سبیل اللہ، اس نظامِ اجتماعیہ کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا جس کا فطری نتیجہ "الجنّۃ" ہوگا. ہو سکتا ہے کہ یہ جنتِ ارضی ان کی اپنی زندگی میں سامنے آ جائے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

یہ درخت اُن کے بعد ثمر بار ہو اور ان کی نسلیں (یعنی آنے والی انسانیت) اس جنّت کی زندگی سے متمتع ہو سکیں۔ لہٰذا، ترغیب و تحریص کی آیات، اسی عبوری دَور سے متعلق ہیں۔ ورنہ جب افرادِ ملّت اور نظامِ اجتماعیہ میں بیع و شریٰ کا وہ معاہدہ مکمل ہو جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، تو جب تک وہ معاہدہ قائم رہے گا، فریقین پر اس کی پابندی لازم آئے گی۔

یہ تو رہا سلیم! اس مسئلہ کا خارجی پہلو۔ لیکن اگر اس کے نفسیاتی پہلو کو دیکھا جائے تو معاہدہ کے باوجود، اس ترغیب و تحریص کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس ضرورت کو سمجھنے کے لئے اس کے چند ایک مبادیات کو سامنے لانا ضروری ہے۔ میں سلیم! جانتا ہوں کہ تم خشک موضوعات سے جلد گھبرا جایا کرتے ہو اور نفسیات تمہارے لئے ہمیشہ "عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا" کا حکم رکھتا ہے (خدا کرے کہ تم اس کے "تر و تازہ" گوشے سے بہرہ یاب ہونے کی صلاحیت پا سکو)۔ اس لئے میں کوشش کروں گا کہ اس کے اصطلاحی پہلوؤں سے درگزر کرتے ہوئے تمہاری زبان میں ہی بات سمجھا سکوں۔ اگرچہ اس اسلوب کا نباہنا مشکل ہوا کرتا ہے۔ بہرحال، ذرا غور سے سمجھنے کی کوشش کرو۔

حیوانات میں کسی ایک نوع کو لو۔ تم دیکھو گے کہ اس نوع کے افراد میں "کمانے" کی استعداد میں بہت کم فرق ہوگا۔ (حیوانات میں "کمانے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس سے مقصود ان کی اپنی طبیعی ضروریات کے پورا کرنے کی صلاحیت ہے)۔ مثلاً جنگل کے ہرنوں کو دیکھو (بیمار وغیرہ کو چھوڑ کر) تمام ہرن پیٹ بھرنے کے لئے گھاس چرنے کی صلاحیت یکساں طور پر رکھیں گے۔ لیکن اس کے برعکس، انسانوں کو دیکھو۔ مختلف افراد کی اکتسابی صلاحیتوں کا تفاوت ایک حقیقتِ باہرہ ہے۔ قرآن اسی استعدادی فرق کو "فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" کے جامع الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی انسانوں کی اکتسابی استعداد میں فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا، جب کسبِ معاش کی استعداد میں تفاوت ہے تو اس استعداد کے ماحصل یعنی کمائی میں بھی فرق ہوگا۔ یعنی ایک زیادہ کما سکے گا، دوسرا کم اور یہ واقعہ ہے۔

اب آگے بڑھو۔ جب ایک ہرن اپنا پیٹ بھر لے گا تو وہ درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ جائیگا اور سکھ کی نیند سو ئے گا۔ اسے اس کی قطعاً فکر نہ ہوگی کہ جنگل کی گھاس کو دوسرے ہرن کھائے جا رہے ہیں اور اگر انہوں نے اسے ختم کر دیا تو وہ شام کو بھوکا رہ جائے گا۔ تم نے سلیم! اپنی گائے کو نہیں دیکھا؟ جب وہ پیٹ بھر کر جگالی کرنے بیٹھ جاتی ہے، تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی کہ باقی ماندہ چارہ کون لے جا رہا ہے۔ اسے

چارہ کا خیال پھر اس وقت آتا ہے جب اسے دوبارہ بھوک لگتی ہے۔ یعنی سیر ہو جانے کی صورت میں وہ سیر چشم بھی ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں انسان کو دیکھو۔ اس کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی۔ صبح کے کھانے سے ہنوز فارغ نہیں ہوتا کہ شام کی فکر ستانے لگ جاتی ہے اور پھر کل کی اور پرسوں کی۔ پھر بڑھاپے کی اور پھر اپنی اولاد کی۔ اور اولاد در اولاد کی۔ یہ سلسلہ دراز اسے عمر بھر ستاتا رہتا ہے۔ یعنی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے نیت نہیں بھرتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان مآل اندیش واقع ہوا ہے اور مآل اندیشی کا تقاضا ہے کہ انسان دور اندیشی اور کل کی فکر بھی کرے۔ لیکن یہ کل کی فکر "پیٹ کی بھوک" کے لئے ہی نہیں کرتا بلکہ بیشتر نیت کی بھوک کی خاطر کرتا ہے۔ سلیم! تم نے ایسے لوگ دیکھے ہوں گے کہ ان کے پاس اتنا روپیہ جمع ہے کہ ان کی پُشت ہا پُشت تک کو بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بایں ہمہ وہ ہر وقت هَلْ مِنْ مَّزِيْد کی حرص میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اس "نیت کی بھوک" یعنی بے صبری کی تعبیر کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۲۰) یعنی بہت بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بڑا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ اسی کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد (۱۰۰/۸)۔ یہ سب کچھ سمیٹ لینے کی ہوس بھوک کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ ایک اور جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے جسے قرآن نے تکاثر اور تفاخر کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ، منافست اور مسابقت کی خواہش۔ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ (۵۷/۲۰) اور یہ جذبہ قبر تک انسان کے ساتھ جاتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)۔ وہ جذبہ جس کے تحت اس کا مقصودِ حیات جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲)۔ مال جمع کر کے اسے گنتے رہنے کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ حیوانات میں باہمی مسابقت و منافست کا جذبہ کہیں کارفرما نہیں ہوتا۔ کوئی بکری یہ دیکھ کر نہیں کڑھتی کہ ہرن اس برق رفتاری سے کیوں دوڑ رہا ہے۔ یہ انسان ہی کی "خصوصیت" ہے اور اس کی وجہ بھی "بے صبرا پن"۔

اب سلیم! دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں۔

اوّل یہ کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد و صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے ایک فرد دوسرے سے زیادہ کمائی کر سکتا ہے۔

اور

دوسرے یہ کہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوجانے کے باوجود وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔

لہٰذا،

جس کی کمائی اس کی ضروریات سے زائد ہو گی وہ اس فاضلہ مال کو سمیٹ کر رکھنے کی فکر کرے گا۔ کسی دوسرے کو نہیں دے گا اور پھر ہر وقت اس میں مزید اضافہ کرتا رہے گا۔

یہ ہیں سلیم! وہ حقائق نفس الامری جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی موجودگی میں دنیائے انسانیت میں فساد رونما ہونا یقینی ہے۔ نہ آپ اکتسابی استعداد کے تفاوت کو مٹا کر تمام انسانوں کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ہی جتنا کمائیں اور نہ ہی ان کے اس جذبہ سے چشم پوشی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص سمیٹنے کی فکر کرے۔ انسانوں کے خودساختہ مذہب (تصوف) نے اس " فتنہ " کا علاج یہ سوچا کہ انسانوں کو دنیا ترک کر دینے کی تعلیم دو۔ نہ دنیا کی آرزو رہے نہ ان آرزوؤں سے پیداشدہ فساد کا امکان۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ترکِ لذات۔ ترکِ خواہشات، ترکِ مقاصد، ترکِ دنیا (حتٰی کہ صوفیاء کی اصطلاح میں "ترک ترک") یہ سوچا گیا اس کا علاج۔ نفس کشی یا فنائے ذات" روحانیت" کا کمال تصور کر لیا گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ طریقِ علاج ہمارا بتایا ہوا نہیں تھا بلکہ انسانوں کا اپنا وضع کردہ تھا۔ اور چونکہ قانونِ کائنات کے خلاف تھا اس لئے اس کا نباہنا بھی ممکن نہ تھا وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (۵۷/۲۷)۔ اس طریقِ علاج (رہبانیت) کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا طلبی کا جذبہ" شر" (EVIL) کی حیثیت رکھتا ہے اور شر کا استیصال روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اس جذبے کے فنا کر دینے میں "نجات" پوشیدہ ہے۔ یہ مفروضہ یکسر باطل اور ایک بہت بڑے فساد کا باعث ہے۔ اگر سلیم! اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ "انسانی فطرت" میں بعض جذبات "شر" (EVIL) کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں تو اس سے خالقِ فطرت کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس تصور کا سرچشمہ (یا کم از کم قریبی چشمہ) عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ درحقیقت شر اس سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوتوں کے غلط استعمال سے اپنے نظام کا توازن بگاڑ دیتا ہے (اسی کو فساد کہتے ہیں)۔ یہی قوتیں جب توازن قائم کرنے میں صرف کی جائیں تو ان کا ماحصل خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ اصول

یکسر غلط نگہی پر مبنی ہے کہ انسانی قویٰ اور جذبات میں سے بعض شر انگیز ہوتے ہیں، اس لئے ان کی فنا میں انسان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ ان ہی دو چیزوں کو لو جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی اکتسابی صلاحیتوں میں تفاوت اور باہمی تکاثر و تفاخر۔ اگر ان خصوصیات اور جذبات کو مٹا دیا جائے تو سوچو کہ انسانوں کی دنیا کیا بن کر رہ جائے۔ یہ دنیا پتھروں کی دنیا بن جائے یا جنگل کے حیوانات کی دنیا۔ جو لوگ ترکِ آرزو سے دنیا چھوڑ کر زاویوں اور خانقاہوں میں جا چھپتے ہیں' جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے' ان میں اور پتھروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ بجز اس کے کہ پتھر زمین کی چھاتی پر بوجھ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندہ پتھر دوسرے انسانوں کی چھاتی پر بوجھ۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن اس باب میں کیا کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان قویٰ و جذبات کو بے محابا چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ فساد ہی ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور انہیں فنا کر دیا جائے تو دنیائے انسانیت کی تمام ترقیاں یک قلم رک جاتی ہیں۔ قرآن اس باب میں ایک عجیب راہ اختیار کرتا ہے۔ (اور وہ کون سا باب ہے سلیم! جس میں وہ عجیب راہ اختیار نہیں کرتا!)۔ قرآن ان جذبات کو نہ بے زمام چھوڑتا ہے اور نہ انہیں فنا کرتا ہے۔ وہ اُن کا رُخ بدل دیتا ہے اور رُخ بدل جانے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔

سلیم! یہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ جہاں تک انسان اس اندیشہ کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے کہ وہ وقت بے وقت اس کے کام آئے یا اگر اس کی موت بے وقت ہو جائے تو اس کی اولاد کس مپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے۔ تو یہ اندیشہ اس نظام کے تحت خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے کیونکہ اس نظام کی عطا کردہ جنت میں خوف و حزن کا نام نہیں۔ اب رہا ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ۔ یعنی عزت کا خیال اور فخر کا جذبہ۔ قرآن اس باب میں فخر اور عزت کا معیار بدل دیتا ہے اور اس طرح مسابقت اور منافست کے نئے میدان عطا کر دیتا ہے۔ ذرا سورۃ حدید کی ان آیات پر غور کرو' سلیم! جن کا ایک ٹکڑا اوپر دیا جا چکا ہے۔ فرمایا:۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ط یعنی اس حقیقت کو سمجھ رکھو کہ قریبی مفاد (دنیاوی) کی زندگی کھیل تماشا اور ظاہری زیبائش' باہمی تفاخر اور مال اور اولاد کے لئے تکاثر (ایک دوسرے پر کثرت رکھنے) کی زندگی ہے۔ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ

فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ بارش کی طرح جس کا کھیتی کو اگانا کسانوں کو خوش آتا ہے. پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو وہ اُسے ریزہ ریزہ شدہ دیکھتا ہے؛ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ اور ان کے لئے مستقبل میں شدید سزا ہے: وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ اس کے برعکس اللہ کے ہاں مغفرت اور رضوان ہے؛ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (۵۷/۲۰) مفادِ عاجلہ کی زندگی دھوکے کا سامان ہے. یعنی مفادِ عاجلہ کے پیشِ نظر، باہمی تکاثر و تفاخر کا جذبہ اپنے اندر بظاہر بڑی کشش و جاذبیت رکھتا ہے. لیکن یہ خوشگواری محض وقتی ہوتی ہے. انسانی زندگی جو ابدیت درکنار ہے، اس سے اپنے اندر نمود و ارتقاء کا سامان نہیں پاتی.

اب اس کے بعد قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ جذباتِ مسابقت و مفاخرت اس قابل ہیں کہ انہیں فنا کر دیا جائے. بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسابقت کے جذبات کی تسکین کے لئے ایک اور میدان ہے. آؤ اور اس میدان میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنا حوصلہ نکالو. یہ میدان کون سا ہے. فرمایا؛ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہو تو اپنے نشو و نما دینے والے سے مانع نشو و نما اسباب و علل سے پناہ جوئی اور حفاظت طلب کرنے میں اور اس جنت کے حصول میں جو پستیوں اور بلندیوں پر چھائی ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے تیار کی جاتی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، سبقت لے جانے کی کوشش کرو؛ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (۵۷/۲۱) حقیقی فضیلت وہی ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور اللہ بہت بڑی فضیلتیں عطا کرنے والا ہے.

غور کیا سلیم! تم نے کہ قرآن نے کس طرح جذباتِ مسابقت کا رُخ ایک بلند و بالا سمت کی طرف پھیر دیا ہے. وہ کہتا ہے کہ تم ایک دوسرے پر مسابقت، عزت کے حصول کے لئے چاہتے ہو. یہ تمہاری بھول ہے. اس لئے کہ عزت مال اور دیگر اضافی چیزوں کی کثرت کا نام نہیں. حقیقی عزت یہ ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ. تم میں سے جو شخص سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا، وہی سب سے زیادہ عزت کا مستحق ہوگا. آؤ! اور عزت و تکریم کے اس میدان میں ایک دوسرے سے بڑھو. اس میدان میں بڑھنے سے وہ نظام قائم ہو جائے گا جس کا عملی نتیجہ جنتِ ارضی کا قیام ہوگا.

سورۂ فاطر میں دیکھو جہاں وارثینِ کتابِ خداوندی کے تین طبقات کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ (اپنے آپ پر زیادتی کرنے والے ہیں)۔ دوسرے وہ جو مُقْتَصِدٌ (بین بین چلنے والے ہیں) اور دوسرے وہ جو سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (خوشگوار حالات پیدا کرنے میں آگے بڑھنے والے) ہیں (۳۵/۳۲)۔ یہ وہ مسابقت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۳۵/۳۲) یہ وہ برتری ہے جس میں کبریائی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وہ اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ہیں جن کے متعلق سورۂ واقعہ میں فرمایا کہ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۵۶/۱۲-۱۱)۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ انسان ذخائر وانبار بالآخر چاہتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی عقل کا تقاضا تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔ ہر فرد کی عقل اس کی اپنی ہوتی ہے اس لئے ہر فرد اپنی عقل کی رُو سے اپنے آپ کا تحفظ چاہتا ہے۔ اگر غور کرو تو تکاثر و تفاخر بھی اسی تحفظِ خویش ہی کی شق میں آجاتے ہیں۔ عقل کا یہ تقاضا کوئی مذموم تقاضا نہیں۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔ وہ بنی ہی اس لئے ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کی حفاظت کرے۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے)، چونکہ ہر فرد کی عقل الگ الگ ہوتی ہے، اس لئے عقل صرف اپنے فرد کی حفاظت ہی کی فکر کرسکتی ہے۔ وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کی تمام کوششوں کے باوجود، انسان کا جسم فنا آمادہ ہورہا ہے، تو وہ اسے یہ کہہ کر تسلی دے دیتی ہے کہ اب تیری بقا تیری اولاد کے ذریعے ہوگی۔ وہ بیٹے کو باپ کا عکس بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ تیرے گھر کا چراغ اور تیرا نام روشن کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے تیرا ذکر آگے بڑھے گا اور تیرا سلسلہ آگے چلے گا۔ تم نے "ابلیس و آدم" میں پڑھا ہوگا کہ "ابلیس" نے آدم کو جس "ملك لا یبلیٰ" (جس پر زوال نہ آئے) کی طرف دعوت دی تھی وہ اولاد کے ذریعے حصولِ بقا ہی کا تصور تھا۔ لیکن اس سے نہ تحفظِ خویش ہوتا ہے نہ حیاتِ جاوید ملتی ہے۔ قرآن اسی عقل کو ایک بلند سطح پر لے جاتا ہے اور اس کے سامنے ایک ایسی حقیقت لے آتا ہے جس سے فی الواقعہ حیاتِ جاوید نصیب ہوجائے۔ وہ کہتا ہے کہ الگ الگ رہنے سے افراد کی ربوبیت نہیں ہوسکتی۔ اصل تحفظ انسانیت کا ہونا چاہیئے۔ درخت کی سلامتی میں اس کی شاخوں اور پتوں کی سلامتی ہے۔ جسم کی صحت میں جسم کے خلیات (CELLS) کی صحت کا راز مضمر ہے۔ اس لئے وہ عقل کو یہ سمجھاتا ہے کہ وہ فرد کے تحفظ کے لئے انسانیت کے فکر کی تحفظ کرے۔ اور انسانیت کا تحفظ اسی صورت ممکن ہے کہ ایک متوازن نظامِ زندگی قائم ہوجائے جس میں کم اکتسابی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی کمیوں

کو زیادہ استعداد رکھنے والوں کے نتائج سعی و عمل سے پورا کر دیا جائے۔ ان کمیوں کے پورا کر دینے سے نظام اجتماعیہ میں حسن (توازن) پیدا ہو جائے گا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس نظام سے وابستہ ہر فرد اپنی جان و مال کو اس نظام کے سپرد کر دے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ اور وہ نظام ان تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشو و نما کا کفیل ہو جائے؛ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

سلیم! انسان کے بے صبرا (هَلُوْعًا) ہونے کی کیفیت کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینے کا جذبہ اپنے خاندان (اولاد) کے مفاد کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔ یعنی ایک خاندان کا سرپرست اپنے اموال و مقبوضات کو اپنی ذات تک مخصوص نہیں رکھتا بلکہ افرادِ خاندان کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن افراد سے انسان اپنا تعلق سمجھے انہیں وہ اپنے مال میں شریک کر لیتا ہے اور اس باب میں اس کا جذبہ "ہلوعیت" یا حب الخیر مانع نہیں ہوتا۔ قرآن انسان کی نگاہوں میں کشادہ پیدا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ حقیقی رشتہ سلسلۂ تولید سے منسلک نہیں، بلکہ انسانیت کا رشتہ اصلی اور حقیقی رشتہ ہے یعنی وہ رشتہ داری کی حدود کو عالمگیر بنا دیتا ہے اور خون کے رشتہ کو انسانیت کے رشتہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جذبات وہی ہیں۔ بس ان کی تسکین کے لئے میدان دوسرا دے دیا جاتا ہے۔ ترغیب و تحریص کی آیات میں یہ مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایک شخص اس لئے مال جمع کرتا ہے کہ اس کی اولاد کسمپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تیری نگاہ کی بھول ہے جو تم نے فقط اپنی اولاد ہی کو اولاد سمجھ لیا ہے۔ وہ یتیم بچہ، جو کسمپرسی کی حالت میں رہ گیا ہے، فرد نوعِ انسان ہونے کی وجہ سے، تمہاری ہی اولاد ہے، اس لئے تمہاری کمائی میں اس کا بھی حصہ ہے۔ ان آیاتِ ترغیب و تحریص کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ انفرادی صدقات و خیرات کی طرف مائل کرنے کے لئے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اسلامی نظام میں تمام ضرورت مندوں کی ضروریات کی کفالت خود نظام کے ذمہ ہوتی ہے۔ جب وہ صدقات و خیرات کی تلقین کرتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مختلف افراد، اپنی فاضلہ کمائی بطیبِ خاطر نظام کے سپرد کر دیں، تاکہ وہ اس سے ان تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے۔ بالفاظِ دیگر، ترغیبات و تحریصات درحقیقت اس معاہدہ کی بطیبِ خاطر استواری کی غرض سے ہوتی ہیں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ قرآن، ان لوگوں سے جنہیں زیادہ استعداد ملی ہے، یہ کہتا ہے کہ تم اپنی محنت کے معاوضہ ہی کے حقدار ہو۔ استعداد کی زیادتی جس علم و ہنر کی پیداوار ہے وہ تمہیں وہبی طور پر بطور بخشش ملی ہے۔ لہٰذا

استعداد کی زیادتی کی وجہ سے جتنا کچھ تمہیں ملا ہے اگر تم گہرائی میں جاکر دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ درحقیقت اس پر تمہارا کوئی حق نہیں بلکہ ان کا حق ہے جنہیں کم استعداد ملی ہے یا جن کی استعداد ہنگامی حادثہ کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔

یہ ہے وہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت جس سے قرآن اپنا نظامِ معاشی قائم کرتا ہے۔ اس لئے جہاں اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے) اس سے آگے وہ کہتا ہے کہ۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝ (۲۵-۲۲/۷۰) یعنی انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے لیکن جو لوگ صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں ان پر "بے صبرے پن" کا یہ جذبہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یعنی اس جذبہ کی تسکین "نظامِ صلوٰۃ" میں ہوتی ہے جو حقیقی مساوات سکھاتا ہے اور افراد کو انسانیت کا جزو بنا کر دکھاتا ہے۔ اس نظامِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے قائم کرنے والے، اس حقیقت کو، واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی کمائی میں ضرورتمند اور محروم الوسائل افرادِ انسانیت کا معلوم و مشہود حق ہے۔

دیکھا سلیم! تم نے کہ قرآن، انسان کو کہاں لے جاتا ہے؟ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد کس اصول پر قائم ہے اور اس نظام میں ذاتی ملکیت کا کہیں سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو انسان کے خود ساختہ مذہب کی دنیا ہے جو یہ آواز بلند کرتی رہتی ہے کہ مال ہر ایک کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ غریب و نادار کہیں یہ مطالبہ نہ کر بیٹھیں، کہ انبار و ذخائر کے مالکوں سے فاضلہ مال لے کر ہماری بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کی جائیں۔ لیکن رسولوں کی طرف سے لایا ہوا نظام، مذہب کا عنکبوتی جال نہیں ہوتا، دین کا نظام ہوتا ہے، جو اس معاہدہ کی رُو سے، جس کا ذکر اوپر ہوتا چلا آرہا ہے، افراد کے اموال میں صرف تصرف ہی جائز نہیں قرار دیتا بلکہ ہر ایک کے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کی ملک قرار دیتا ہے تاکہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ میں توازن قائم رہ سکے۔ تم نے سلیم! قرآن میں حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ میں پڑھا ہو گا کہ آپ کی اسی دعوتِ انقلابِ معاشی کو دیکھ کر، مفادِ عاجلہ کے علمبردار پکار اُٹھے تھے کہ يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ...... اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷) اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا حکم دے رہی ہے کہ ہم اپنے اموال کو جس طرح ہمارا جی چاہے صرف میں نہ لائیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کا معاملہ پوجا پاٹ کا معاملہ ہے۔ اسے بھلا ہماری جاگیرداریوں اور زمینداریوں سے

کیا تعلق؟ ہم اپنے مال کے خود مالک ہیں جس طرح جی چاہے خرچ کریں۔ یہ دین کا نظام ہے جو یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ افراد کو سامنے رکھنے کے بجائے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کو سامنے رکھو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کے قانون و ضوابط کے مطابق صرف کرو کیونکہ یہ مال تمہاری ملکیت نہیں، تمہارے پاس بطورِ امانت رکھا ہے۔ سلیم! انسانی طبائع کی اس بوالعجبی پر غور کرو۔ جس طرح حضرت شعیبؑ کے زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ دین میں ذاتی ملکیت کیوں جائز نہیں ہوسکتی اور اس قسم کی آواز بلند کرنے والے کو وہ گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتے تھے، آج بھی جو شخص یہ کہے کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا، قومِ شعیب کی اسی پرانی آواز کی صدائے بازگشت اس کے خلاف ہر گوشے سے اٹھتی چلی آتی ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

یہ اس لئے کہ ہمارا آج کا اسلام ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور نظامِ سرمایہ داری کی یادگار ہے۔ کیا تم نے قرآن میں نہیں دیکھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ مترفین کی طرف سے ہوتی تھی؟ یہ گروہ دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں کا گروہ ہوتا ہے جسے آج کی اصطلاح میں (VESTED INTERESTS) والوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (۳۴/۳۴)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہم نے جس بستی میں بھی کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے سرمایہ دار گروہ نے ہمیشہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم تمہاری دعوت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۴/۳۵)

وہ یہ کہتے کہ ہمارے پاس مال اور اولاد کی کثرت ہے اور اس وجہ سے ہمارا اقتدار اتنا بڑا ہے کہ ہمیں کوئی پوچھ تک نہیں سکتا۔ ہم دیکھیں گے کہ کون ہمارا بال بھی بیکا کرے گا؟ قرآن میں سلیم! نویں پارہ کی ابتداء قَالَ الْمَلَاُ سے ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ ٹکڑا ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کے ضمن میں آتا ہے۔ یعنی ان کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی تھی جن کے گھر سامانِ زیست سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی قوم کا خوشحال اور مالدار طبقہ۔ اب ظاہر ہے سلیم! کہ اگر خدائی دعوتِ انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کی مؤید ہوتی

تو ان سرمایہ داروں کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں ہوتی! ان مترفین کی مخالفت کے علی الرغم، رسول اپنا انقلابی نظام قائم کر جاتا۔ لیکن اس کے بعد مترفین پھر قوت پکڑ کر اسے الٹ دیتے (دیکھو ۱۷/۱۶)۔ یہی سابقہ انبیاء کرامؑ کے قائم کردہ نظام کے ساتھ ہوا اور یہی نبی اکرمؐ کے متمکن فرمودہ دین (نظامِ خداوندی) کے ساتھ۔ کچھ وقت کے لئے یہ نظام قائم رہا اور پھر مترفین نے اسے ملوکیت اور سرمایہ داری میں بدل دیا۔ ہمارا موجودہ مذہب' دین کی اسی تبدیل شدہ صورت کا نام ہے۔

سلیم! اب یہ حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہوگی کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! اور شاید یہ بھی تم سمجھ گئے ہوگے کہ کسی معاشی نظام کو اس فلسفۂ زندگی سے کیوں الگ نہیں کیا جا سکتا جس پر وہ نظام متفرع ہوتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس یہی زندگی ہے۔ موت کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس عقیدہ کے بعد تم اس سے کہتے ہو کہ تم محنت اور مشقت سے جو کچھ کماؤ' اس میں سے صرف اتنا اپنے پاس رکھو' جو تمہاری ضروریات کے لئے کافی ہو' باقی دوسروں کو دے دو۔ سلیم! ذرا غور کر کے بتاؤ کہ وہ کس دلیل یا کون سے جذبۂ محرکہ کے تحت ایسا کرنے پر راضی ہو جائے گا؟ زیادہ سے زیادہ تم اس کے جذبۂ ہمدردی کو ابھارنے کی کوشش کرو۔ لیکن اس طرح کے جذبۂ ہمدردی کا نفسیاتی تجزیہ کرو تو وہ اعصابی کمزوری پر مبنی ہوتا ہے۔ کمزور اعصاب والا انسان دوسروں کی داستانِ مصائب سے متأثر ہو جائے گا اور بھیک کا ٹکڑا ان کی طرف پھینک دے گا۔ یا اس سے آگے بڑھو، تو تم اس سے کہو گے کہ دیکھو بھائی! آج تم بہت خوشحال ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کل تم کسی حادثہ کے شکار ہو جاؤ اور تمہاری بھی یہی حالت ہو جائے جو اس بیکس و نادار کی ہے۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ کل تمہاری بھی کوئی مدد کرے، تو تم آج اس کی مدد کرو۔ سلیم! دنیا کا ضابطۂ اخلاق اسی دلیل پر قائم ہے۔ یعنی انتقام کا خوف (اگر تم ایسا نہ کرو گے تو کل تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا)۔ کہو کہ یہ بنیاد کوئی ایسی محکم بنیاد ہے جس پر کوئی پائندہ نظام قائم کیا جا سکے؟ اب تیسری شکل یہی باقی رہ جاتی ہے کہ تم بزورِ شمشیر کوئی ایسا نظام قائم کر دو۔ لیکن سلیم! استبداد سے قائم کردہ نظام انسانوں سے میکانکی طور پر تو کچھ کرا سکتا ہے' بطیبِ خاطر نہیں کرا سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد' استبداد ہی ہے خواہ اس کے ذریعے آپ کتنا ہی عمدہ نظام کیوں نہ قائم کرنا چاہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ لوگ (مفسدین) ایسے ہوں گے جن سے یہ نظام جبراً منوایا جائے گا اور مترفین کا جو طبقہ اس نظام کے قیام میں مزاحم ہوگا ان سے انسانیت کے

غصب کردہ حقوق بجبر واپس لئے جائیں گے۔ لیکن اس نظام کے قائم کرنے والے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کی صداقت پر ایمان رکھیں گے۔ اس کے برعکس، جو لوگ نہ وحدتِ انسانیت کے قائل ہیں، نہ تسلسلِ حیات کے، ان سے معاشی توازن کا نظام قائم کرانا یا تو ہنگامی جذبات کے تحت ہو سکتا ہے یا استبداداً۔ دونوں صورتوں میں نہ ارتقائے انسانیت ممکن ہے، نہ اس نظام کا استحکام۔

اس کے برعکس، سلیم! قرآن کو دیکھو۔ وہ سب سے پہلے یہ اصول بطورِ فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے کہ

۱۔ زندگی صرف جسمانی زندگی کا نام نہیں۔ انسان عبارت ہے اس کے جسم اور ایک اور شے سے، جسے اس کی ذات (PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔

۲۔ زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے جو ایک انسانی معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔

۳۔ جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے۔ لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔

۴۔ اس مقصد کے لئے ہر فردِ معاشرہ اپنی ضروریات سے فاضلہ سامانِ زیست دوسرے افراد کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے گی۔

۵۔ انسانی ذات کی نشوونما سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے، اُسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔

اب سوچو سلیم! کہ جو جماعت اس فلسفہ کی بنیادوں پر معاشی نظام کو استوار کرے، اس میں ہر شخص یہ یقینِ محکم رکھے گا کہ جسے "دوسرے کو دینا" کہتے ہیں وہ درحقیقت "اپنے آپ کو دینا" ہے۔ جو کچھ میرے پاس فاضلہ ہے، وہ میرا ہے ہی نہیں۔ وہ ان کا ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ میں تو صرف اس کا امین ہوں۔ جس وقت انہیں ضرورت ہو، ان کا مال انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس عظیم الشان حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے! ارشاد ہوتا ہے: وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ اللہ نے تمہیں معاشی اکتساب کی استعداد میں ایک دوسرے پر برتری عطا کی ہے۔ یہ تفاوتِ استعداد تمہارے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں۔ یہ تمہیں بلا محنت و مشقت اور بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶/۷۱)

سو جب یہ استعدادی افضلیت عطائے خداوندی ہے، تو اس کا ماحصل بھی عطائے خداوندی سمجھنا چاہیئے لیکن

جنہیں یہ استعدادی افضلیت مل جاتی ہے، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس استعداد کے ماحصل میں سے فاضلہ رزق کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں، بایں خوف کہ وہ اس میں ان کے برابر ہو جائیں گے۔ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ اللہ کی عطا فرمودہ نعمت سے عملاً انکار کرتے ہیں۔

سلیم! اس آیت جلیلہ میں دیگر نکات کے علاوہ "راد" کے لفظ پر غور کرو۔ اس کے معنی ہیں "واپس کر دینا"، جس کی چیز ہے اسے واپس دے دینا۔ یعنی قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ تمہارا نہیں، ان کا ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا، انہیں ان کا سامانِ زندگی "واپس لوٹا دو"۔ غور کرو! معاشی توازن کے قیام کے لئے اس گہرائی تک پہنچنا، قرآن کے سوا، اور کہاں مل سکتا ہے؟ یہ ہے وہ فلسفۂ زندگی جس پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، یہ معاشی نظام، قرآن کے ہمہ گیر نظامِ حیات کی ایک شاخ ہے۔ اس سے الگ نظام نہیں۔ فلہٰذا جب تک قرآن کا نظامِ حیات نہ سمجھ لیا جائے اس کے معاشی نظام کی کنہ و ماہیت اور اصل و غایت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اگر انسان یہ سمجھ لے (جیسا کہ مادی نظریہ حیات نے اسے سمجھا رکھا ہے) کہ زندگی مادی اجزاء کی ترتیب کا نام ہے اور جب ان اجزاء میں انتشار واقع ہو جاتا ہے، تو زندگی ختم ہو جاتی ہے، تو اس کے سامنے زندگی کا سارا مسئلہ معاشی رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے اس کا تصور جا ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ سلیم! محض معاشی مسئلہ، حیوانیت کی سطح (ANIMAL LEVEL) کا مسئلہ ہے۔ ان کا مسئلہ زیست فقط معاشی ہے۔ مثلاً ایک گائے جس قدر کوئی استعداد لے کر پیدا ہوتی ہے، مرتے وقت تک اس استعداد میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ لہٰذا، اس کی زندگی کا سوال فقط زندہ رہنا ہے جس کا حل معاش میں مل جاتا ہے۔ یعنی اگر اسے کھانے پینے کو ملتا جائے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے انسان کی موجودہ زندگی کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری اور مکمل کڑی سمجھ لیا ہے۔ وہ اس کی مزید ارتقائی منازل کا قائل ہی نہیں۔ اس لئے اس کے نزدیک اس کی زندگی کا مسئلہ بھی محض معاشی ہے، جس طرح اور حیوانات کا مسئلہ معاشی ہے۔ حالانکہ وہ اگر ایک فرد کی دنیاوی زندگی ہی کو دیکھے تو وہ جس ذہنی سطح پر بچپن میں ہوتا ہے، عمر کے اگلے حصہ میں وہ سطح کہیں بلند ہو چکی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سلسلۂ ارتقاء اسی زندگی تک نہیں رہتا بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اپنی ذات میں مکمل نہیں ہو چکا۔ اسے ابھی کچھ اور بننا ہے۔ وہ (BEING) نہیں بلکہ ہنوز (BECOMING) ہے۔ اس کا مسئلہ فقط معاشی مسئلہ نہیں۔ معاشی مسئلہ تو اس کی طبیعی

زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن معاشی مسئلہ کو بھی خاص اہمیت دیتا ہے، کیونکہ اگرچہ طبیعی زندگی مقصود بالذات نہیں لیکن ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تو ہے۔ اس لئے حصولِ مقصد کے لئے ذریعہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ذریعہ ہی مقصد بن کر رہ جائے تو انسان حیوانیت کی سطح پر چلا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم انسان کو مادیت کی اس حیوانی سطح سے بہت اوپر لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ رَبِّ ذِی الْمَعَارِجْ (بلندیوں کی طرف لے جانے والے خدا) کی صفات کے علی حدِ بشریت ہم رنگ ہو کر طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (منزل بہ منزل) بلند ہوتا چلا جائے۔

کیا سلیم! اب بھی بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟ اچھا خدا حافظ۔

والسلام
مارچ ۱۹۵۰ء

دسواں خط

قرآنی نظامِ ربوبیّت

غنیمت ہے سلیم! تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ قرآنی نظامِ ربوبیّت اشتراکی نظام سے بہتر ہی نہیں بلکہ انسان کو کہیں آگے لے جاتا ہے. لیکن اس کی دلیل صرف وہی نہیں جو تم نے لکھی ہے کہ

اشتراکی نظام صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اور قرآنی نظامِ ربوبیّت' روٹی کے مسئلہ کے حل کے بعد ہر ابنِ آدم کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے.

اس میں شک نہیں کہ عملی نتیجہ کے لحاظ سے' ان دونوں نظاموں میں یہ فرق بھی اہم ہے' یعنی قرآنی نظامِ ربوبیّت وہ سب کچھ بھی دیتا ہے جس کا دعویٰ اشتراکی نظام کرتا ہے اور اس کے بعد انسانی معاشرہ کو اس سے کہیں آگے لے جاتا ہے. لیکن ان دونوں نظاموں میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ اشتراکی نظام کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں اور قرآنی نظامِ ربوبیّت ایسی محکم بنیادوں پر قائم ہے جو کبھی منہدم نہیں ہو سکتیں.

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اسے آج پھر دہراتا ہوں کہ مارکس یا مارکسسٹ اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا کہ غریبوں کی مدد کیوں کی جائے؟ کیوں تمام انسانوں میں مساوات قائم کی جاتے؟ وہ شخص جو بہت زیادہ کماتا ہے' اپنی محنت کا ماحصل اس شخص کو کیوں دے دے جو کمانے کے قابل نہیں؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا تھا کہ کمزوروں کی مدد کرنا انسان کا "اخلاقی فریضہ" ہے. لیکن جس نظریۂ زندگی میں اخلاق (MORALS) کا تصور ہی نہ ہو' اس میں ان امور کا جواب کیا مل سکتا ہے؟

میں' اس سے پہلے' ایک خط میں لکھ چکا ہوں کہ "کیوں" کا جواب صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا ہو اور یہ مانتا ہو کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ اس کے

بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اخلاقیات کی ساری عمارت ان ہی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور جو فلسفہ ان بنیادوں ہی سے انکار کر دے اس میں اس سوال کا جواب کیسے مل سکتا ہے ؟

یہ اس سوال کا ایک پہلو تھا۔ اب دوسرا پہلو دیکھو۔

پہلے یہ سمجھ لو سلیم! کہ اخلاق کہتے کسے ہیں ؟ ہم کہتے ہیں کہ "دیانتدار رہنا بہرحال اچھا ہے" یعنی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، دیانتدار رہنا بہر حیث و بہر کیف اچھا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ دیانت کی قیمت حالات کے اعتبار سے اضافی (RELATIVE) نہیں۔ بلکہ اس کی قیمت اس کی ذات کے اندر (INTRINSIC) ہے جو ہر حالت میں قائم رہتی ہے۔ اسے مستقل قدر (PERMANENET VALUE) کہتے ہیں۔ اس تصور کا نام اخلاقیات ہے۔ اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ دیانت اور بددیانتی اپنی ذاتی قیمت کچھ نہیں رکھتے۔ ہر شے حالات کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ ان میں دیانتدار رہنا فائدہ مند ہے تو دیانت سے کام لینا چاہیئے۔ اگر حالات بدل جائیں اور دیانتداری میں نقصان ہو تو بددیانتی کرنی چاہیئے۔ یہ دوسرا تصورِ حیات ہے جس میں کوئی شے مستقل قدر نہیں رکھتی۔

مارکس (MARX) کے نزدیک دنیا میں کوئی نظریہ، کوئی تصورِ حیات مستقل قدر نہیں رکھتا۔ وہ بھی افلاطون اور ہیگل کے تتبع میں یہی مانتا ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لیکن یہ تغیر ایک خاص تسلسل کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نظام قائم ہوتا ہے اس کے بعد زمانے کی رَو اس نظام کو اُلٹ کر اس کی جگہ ایک دوسرا نظام مسلط کر دیتی ہے، جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں زمانے کی اس رَو کا نام تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔ یعنی تاریخ کی اندھی قوت جو ہمیشہ اس نظام کو اُلٹ دیتی ہے جو موجود (PRESENT) ہو، اور اس کی جگہ اس کی ضد، دوسرا نظام لے آتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت مارکس نے کہا کہ یورپ کا موجودہ سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخی وجوب اس نظام کو الٹ کر اس کی جگہ ایک ایسا نظام مسلط کر دے گا جو اس کی ضد ہو گا، یعنی محنت کشوں کا اشتراکی نظام۔ اس میں نہ کسی جذبے کا دخل ہے نہ عقیدے کا۔ نہ ہی اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ وجہ جواز تلاش کرنے کی حاجت۔ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔ انسان کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے ماتحت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ موجودہ سرمایہ داری نظام اچھا ہے یا بُرا۔ اسے علیٰ حالہٖ رکھنا چاہیئے یا بدلنا چاہیئے۔ نہ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کے برعکس،

محنت کشوں (مزدوروں اور کسانوں) کے اشتراکی نظام میں کیا خوبیاں ہیں۔ وہ نوعِ انسانی کے لئے اچھا ہے یا بُرا۔ اس کے نظریے کے ماتحت ہر موجودہ نظام اُلٹ کر رہے گا' خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا اور اس کی جگہ دوسرا نظام آئے گا (جو پہلے نظام کی ضد ہوگا) خواہ وہ نظام نوعِ انسانی کے لئے اچھا ہو یا بُرا۔ اس کے بعد یہ آنے والا نظام بھی ایک دن اسی طرح الٹ جائے گا جس طرح موجودہ نظام اُلٹ رہا ہے' خواہ وہ نظام نوعِ انسانی کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو؟ تاریخی وجوب کے نزدیک "اچھا اور بُرا" سب یکساں ہیں۔ پھر جس طرح آج انسانوں کی کوئی قوت اس پر قادر نہیں کہ آنے والے انقلاب کو روک کر' موجودہ نظام کو برقرار رکھ سکے' اسی طرح جب (اپنے وقت پر) اشتراکی نظام کے لٹنے کا وقت آئے گا تو انسان کی کوئی قوت اس انقلاب کو بھی نہیں روک سکے گی۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق زمانے کی رَو کے مقابلے میں انسان بے بس و مجبور ہے۔ اس نظریہ کو "تاریخی جبر" (HISTORICAL DETERMINISM) کہتے ہیں۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے مطابق' کسی نظام کے اچھے یا بُرے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی اخلاقی قدر کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کائنات کے اسٹیج پر تاریخی وجوب کا ایک ڈرامہ کھیل رہا ہے' جسے انسان' ایک مجبور تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس ڈرامے کا موجودہ سین یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بساط اُلٹ کر (اس کی ضد) اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا جائے۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو بھی چُپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سین آئے گا جس میں تاریخی وجوب کا عفریت' اشتراکی نظام کو اُلٹ کر' اس کی جگہ (اس کی ضد) سرمایہ دارانہ نظام' پھر سے لے آئے گا۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوگا۔ اس لئے مارکس کے نظریے کے مطابق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر ہے یا نہیں۔ جب صورتحال یہ ہے تو پھر اشتراکی نظام کے حق میں اخلاقی جواز تلاش کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصرِ حاضر کا مشہور اشتراکی (L. LAURAT) اپنی کتاب (MARXISM AND DEMOCRACY) میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

> مارکس اور انجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد' تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انہوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت' تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آ گئی ہوگی کہ مارکس یا مارکسسٹ کیوں اس سوال کا جواب نہیں دے

سکتا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام کیوں قائم کرنا چاہیئے ؟" کیوں" کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں یا تو انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہو اور وہ اپنے فیصلہ یا عمل کے لئے دلیل پیش کرے۔ یا وہ تغیرات کسی ایسی ہستی کے فیصلوں کے مطابق رونما ہوتے ہوں جس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوں۔ لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ تاریخی وجوب کی ایک اندھی قوت سب کچھ کر رہی ہو اور انسان اسے مجبور تماشائی کی طرح دیکھ رہا ہو، وہاں "کیوں" کا کیا سوال ؟

مسٹر (LAURAT) کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس سے ایک تو یہ امر واضح ہو گیا کہ مارکس اور انجلز نے اپنے معاشی نظریہ کی بنیاد اخلاقیات پر نہیں رکھی بلکہ اسے "تاریخی وجوب" کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اقتباس اس سے الگ ایک اور اہم حقیقت کی بھی غمازی کر رہا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے (اور یاد رکھو کہ کہنے والا ایک ممتاز اشتراکی ہے) کہ مارکس اور انجلز کے دل میں اشتراکی نظام کی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہو جائے۔ لیکن انہیں اس نظام کے جواز (JUSTIFICATION) کے لئے اخلاقی بنیادیں نہیں ملتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس کی بنیاد "تاریخی وجوب" کے نظریہ پر رکھ دی۔

میرا بھی یہی خیال ہے سلیم! کہ مارکس اپنے سینہ میں ایک دردمند دل رکھتا تھا، جو غریبوں کی مصیبت پر کڑھتا اور کمزوروں کی حالت کو دیکھ کر دُکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں اور غریبوں کی جو حالت کر رکھی تھی اس کے پیشِ نظر اس قسم کے دلِ دردمند میں جوشِ انتقام کا موجزن ہو جانا مستبعد نہیں تھا۔ (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا اثر پرائیویٹ کارخانہ داروں پر بہت بُرا پڑے گا، اس لئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (MANDEVILLEE) نے اپنی مشہور کتاب (FABLE OF THE BEES) شائع کی جس کا ملخص یہ تھا کہ

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف

---

[1] دیکھو (E. H. CARR) کی کتاب (THE NEW SOCIETY)

سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے. سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور غریب رہے۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر میں، برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہاتی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں. اس باب میں (WILLIAM TOWNSEND) نے ۱۷۸۵ء میں اپنی کتاب (DISSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر دیتا ہے. اس سے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے. اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے. یعنی بھوک. بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں.

یہ تھی وہ فضا جس میں مارکس نے آنکھ کھولی. ایسے حالات میں غریبوں اور مزدوروں کی امداد کے لئے عام طور پر لوگوں کے اخلاقی جذبات ہی کو اپیل کیا جاتا ہے. لیکن جب مارکس نے صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ غریبوں اور کمزوروں کی اس حالت کا ذمہ دار ہی وہ ضابطۂ اخلاق ہے جو یورپ میں رائج تھا. اس ضابطۂ اخلاق کی عمارت عیسائیت کی ان بنیادوں پر استوار تھی جن کی رُو سے دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے تھی اور غریبوں کے حصے میں "آسمان کی بادشاہت" آتی تھی. اس ضابطۂ اخلاق میں غریبوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ اگر کوئی زبردست ہاتھ ان کا کوٹ اتار لے، تو انہیں چاہیئے کہ اپنی واسکٹ خود اتار کر اسے دے دیں. ان سے کہا جاتا تھا کہ اگر چور اُن کا اتنا زیادہ مال باندھ لے جو اُس سے اُٹھ نہ سکے تو چاہیئے کہ وہ خود گٹھڑی اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئیں. لہٰذا، اس ضابطۂ اخلاق کی رُو سے امیروں اور بالادستوں سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ غریبوں کو موقع دیں کہ وہ اُبھر کر امیروں کی سطح پر آجائیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ (BRIFFAULT) نے لکھا ہے، گذشتہ دو ہزار سال میں غریبوں اور مظلوموں پر جس قدر انسانیت سوز مظالم ہوتے ہیں ان کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے. یہی وجہ تھی کہ نیٹشے کو اس عیسائیت کے "خون سے اپنے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا." یہی وہ تعلیم تھی جس نے یورپ میں مذہب کے خلاف جذباتِ منافرت و انتقام کو مشتعل کر دیا اور پھر اس آگ کے شعلے ساری دنیا میں پھیل گئے. اگر مارکس ایسے مذہب کو "غریبوں کے لئے افیون" نہ کہتا تو کیا کرتا؟ اور ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے سلیم! ساری دنیا کے

مذاہب جو (اپنی موجودہ شکل میں) انسانی ذہن کے وضع کردہ ہیں، لیکن ان کی نسبت آسمانی کتابوں اور خدا فرستادوں کی طرف کردی گئی ہے، اسی ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ اسی زمرے میں ہمارا موجودہ مذہب بھی شامل ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ وہ دین نہیں جس کا سرچشمہ قرآن ہے۔

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، مارکس کے لئے (مشکل ہی نہیں بلکہ) ناممکن تھا کہ وہ اپنی "اشتراکی آرزوؤں" کی عمارت کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرتا۔ اس مشکل کے پیشِ نظر اُسے اخلاقیات کو چھوڑ کر، دوسرے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ چونکہ اس کی ذہنی افتاد فلسفیانہ اور مؤرخانہ تھی، اس لئے اس نے اس کے لئے فلسفہ اور تاریخ کو سہارا بنایا اور تاریخ کا ایک نیا فلسفہ وضع کیا اور اس کا نام "تاریخی وجوب" رکھا۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) یہ سہارا بڑا کمزور ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ سہارا سہارا ہی نہیں۔

اشتراکیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عائد کیا جاتا ہے کہ جب تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر پر لے لے اور اس طرح افرادِ معاشرہ اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تو وہ کون سا جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) ہوگا، جس کی رُو سے یہ افراد کام کرنے پر آمادہ کئے جا سکیں گے۔ نہ صرف کام کرنے پر، بلکہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور معاشرہ کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کرنے پر آمادہ اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی بہبود میں صرف کرنے کے لئے تیار (اور بہ طیبِ خاطر تیار) کئے جا سکیں گے۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب مارکس یا مارکسزم کے پاس کچھ نہیں۔ نہ ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اور یہی ہے وہ بنیادی فرق جو قرآنی نظامِ ربوبیت کو اشتراکی نظام سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ (PROF. HAWTERY) کے الفاظ ہیں:-

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (QUOTED BY CARR)

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ مارکس کے نظریہ "تاریخی وجوب" کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی تصوّر، کوئی نظریہ، کوئی نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ ہر نظریہ تغیر پذیر اور ہر نظام فنا آمادہ ہے اور یہ سلسلۂ تغیّرات مسلسل چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس، قرآن یہ تصور پیش کرتا ہے کہ بعض نظریاتِ زندگی ایسے ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض ایسے جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی استعداد اور جوہر رکھتے ہیں (یَمْحُو اللّٰہُ

مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ) اور یہ تغیّر وثبات (فنا اور بقاء) ایک خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کی اصل وبنیاد اس تغیر پذیر مادی کائنات سے ماوراء ہے (وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ ۱۳/۳۸)۔ اس قانون "محو وثبات" (فنا و بقاء) کی تفصیل تو طول وطویل ہے لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو ایک بنیادی نقطہ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقاء اس نظریہ یا نظام کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کیلئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے وہ بنیادی قانون جس کے مطابق نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات کی فنا اور بقاء کے فیصلے ہوتے ہیں۔ باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ جو ایسا نہ ہو مٹ جاتا ہے۔

"مَا یَنْفَعُ النَّاسَ" کے الفاظ پر غور کرو سلیم! بس اس میں سارے مسئلہ کا حل پوشیدہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنے اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔ یہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جو اُسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس میں اسے اپنا فائدہ دکھائی نہ دے۔

ہر شخص کا اپنا فائدہ ———— یہ ہے عام اصول

لیکن قرآن نے کہا ہے کہ بقاء اُس نظریہ یا نظام کے لئے ہے جس میں "نوعِ انسانی کا فائدہ" ہو۔ اس لئے قرآنی قانون کی رُو سے

۱۔ وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر اپنا ذاتی فائدہ ہو' باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس

۲۔ وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر "نوعِ انسانی کا فائدہ" (مَا یَنْفَعُ النَّاسَ) ہو' باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسری قسم کے نظام میں بھی "ہر فرد کا ذاتی فائدہ" موجود ہوتا ہے لیکن یہ فائدہ فوراً براہِ راست (IMMEDIATELY) سامنے نہیں آتا بلکہ بالواسطہ (INDIRECTLY) ذرا آگے چل کر (IN THE LONG RUN) سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس پہلی قسم کے نظام میں ہر شخص اپنا ذاتی فائدہ فوراً دیکھ لیتا ہے۔ اسے مفادِ عاجلہ (فوراً سامنے آجانے والا نفع) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفع پیش پا افتادہ (قریب تر) ہوتا ہے' اس لئے اس کے لئے قرآن نے مَتَاعُ الدُّنْیَا (قریبی منافع) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے برعکس جو فائدہ پوری

نوعِ انسانی کے اندر گردش کرتا ہوا افراد تک پہنچتا ہے' اسے مآلِ کار' آخرالامر یا مستقبل کا فائدہ کہا گیا ہے جس کے لئے قرآن میں (اٰخرۃ) (مستقبل) کی اصطلاح آئی ہے. بالفاظِ دیگر' ذاتی منفعت' سودِ خویشں یا انفرادی زندگی کو "حَیٰوۃُ الدُّنْیَا" اور کُلی منفعت' سودِ ہمہ یا نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی کے لئے (جس میں موت کے بعد کی زندگی کا تصور بھی شامل ہے) "حَیٰوۃُ الْاٰخِرَۃِ" کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے. قرآن کے نزدیک ذاتی منفعت کی انفرادی زندگی کا نظریہ غلط ہے اور کُلی مفاد کی اجتماعی زندگی کا نظریہ صحیح. اس حقیقت کو قرآن ایک "اندھے عقیدے" کے طور پر نہیں منواتا (اور کسی دعوے کو بھی اندھے عقیدے کے طور پر پیش نہیں کرتا. ہر دعوے کے لئے دلیل لاتا ہے) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری زندگی حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) پر ہوتی تو پھر یہ تصور درست تھا کہ ہر فرد اپنا اپنا منافع دیکھتا. کسی کو کسی دوسرے سے کچھ واسطہ نہ ہوتا جس طرح ایک حیوان کو کسی دوسرے حیوان سے کوئی غرض نہیں ہوتی. وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲). لیکن زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) میں زندگی کے تقاضے حیوانی سطح سے مختلف ہو جاتے ہیں. اس میں زندگی صرف طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) نہیں ہوتی' بلکہ اس سے آگے بڑھ جاتی ہے. طبیعی زندگی کا تعلق انسانی جسم سے ہے' جو قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) کے مطابق ہر آن تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے. برعکس اس کے انسان میں "کچھ اور" بھی ہے جو ان تمام تغیرات میں غیر متغیر رہتا ہے. اس کا نام انسانی ذات (PERSONALITY) یا خودی (SELF) یا انا (I-AM-NESS) یا ایغو (EGO) ہے. قرآن میں اس کے لئے "روحِ خداوندی" کی اصطلاح آئی ہے. یعنی انائے مطلق (ABSOLUTE (EGO)) کی عطا کردہ توانائی. وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ اس ذات یا انا کی تربیت (DEVELOPMENT) نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی طبیعی زندگی کا نام نہیں. طبیعی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے. لیکن انسانی زندگی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے. اس زندگی کا نام بھی حَیٰوۃُ الْاٰخِرَۃِ ہے. یعنی مستقبل کی زندگی. اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی رُو سے جہاں آج کے مقابلہ میں کل اور موجودہ نسل کے مقابلہ میں آنے والی نسل مستقبل (اٰخرۃ) سے تعبیر کی جاسکتی ہے وہاں اس دنیا کی زندگی کے بعد اگلی زندگی بھی حیاتِ آخرت ہے.

اب آگے بڑھو. جیسا کہ میں پچھلے خط میں بھی لکھ چکا ہوں' انسانی جسم کی پرورش مفادِ عاجلہ (متاع الدنیا) کی انفرادی زندگی سے ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشو و نما کا رشتہ نوعِ انسانی کی نشو و نما کے ساتھ

وابستہ ہے۔ اس لئے اس کے لئے پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسمانی پرورش (حیوانی سطحِ زندگی) "لینے" سے ہوتی ہے (کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کو کچھ نہیں دیتا)۔ اس کے برعکس انسانی زندگی کی پرورش "دینے" (TO GIVE) سے ہوتی ہے۔ جس خلاّق کائنات نے جسمانی زندگی کے لئے وہ قاعدہ مقرر کیا ہے اسی نے انسانی زندگی کے لئے یہ آئین مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں زندگیاں بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے متمیز ہیں اور ان کے نتائج بالکل واضح۔ دیکھو سورۂ واللّیل میں اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جب فرمایا کہ اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی (۹۲/۴) تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی جس نے "دینا" سیکھا اور اس طرح اپنے آپ کو تباہیوں سے محفوظ رکھا۔ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی اور معاشرے میں توازن پیدا کر کے اس حقیقت کو سچ کر دکھایا فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی تو اس کے لئے نشوونما کی راہیں آسان ہوگئیں۔ اس کے برعکس وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ جس نے صرف "لینا" سیکھا اور سب کچھ اپنے ذاتی مفاد کے لئے سمیٹ لیا؛ وَ اسْتَغْنٰی اور سمجھ لیا کہ یہی کچھ میری پرورش کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ معاشرہ کی اور نہ دیگر افرادِ انسانیہ کی: وَ کَذَّبَ بِالْحُسْنٰی اور اس طرح معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا: فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی تو اس کے لئے نشوونما کی راہیں مسدود ہوگئیں اور وہ مشکلات میں پھنس گیا۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے۔ اس نے سمجھا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کی نشوونما کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔ اس کے سامنے یہ حقیقت اس وقت نمایاں ہوگی جب اس کی اس غلط روش کے خلاف معاشرہ میں انقلاب برپا ہو جائے گا اور اس وقت وہ دیکھے گا کہ اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہیں آیا؛ وَ مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗٓ اِذَا تَرَدّٰی اس نے یہ روش اس لئے اختیار کی تھی کہ اس نے سمجھا تھا کہ وہ زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ انسانی زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر نہیں کئے جا سکتے۔ ان قواعد و قوانین کا سرچشمہ وہی ہے جو زندگی کا سرچشمہ ہے؛ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی۔ اس لئے کہ عقلِ انسانی کے پیشِ نظر فقط فردِ متعلقہ کے مفاد (یعنی مفادِ عاجلہ) کی نگہداشت ہوتی ہے اور قانونِ خداوندی کے سامنے مفادِ عاجلہ اور مستقبل کے مفاد دونوں ہوتے ہیں۔ وہ انسان کی طبیعی زندگی کی پرورش کو بھی سامنے رکھتا ہے اور انسانی ذات کی نشوونما کو بھی۔ اس سے ان کی یہ دنیا بھی خوشگوار ہو جاتی ہے اور اگلی زندگی بھی تابناک؛ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ

وَ الْاُوْلٰی. خدا کا قانون، انسان کو اندازِ زندگی کی ہلاکت سامانیوں سے متنبّہ کرتا ہے جو انسانی زندگی کی بڑھمندگی کو جھلسا دیتی ہیں فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى. اس تباہی اور ہلاکت کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو الف ادنیٰ زندگی کو نصب العینِ حیات بنا لیتے (لَا یَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى) یعنی وہ لوگ جو معاشرہ کے توازن کو بگاڑ کر اپنے دعوائے انسانیت کی عملی تکذیب کرتے ہیں اور اس طرح صحیح راہِ حیات سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں؛ الَّذِیْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى. اس ہلاکت سے وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی زندگی میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى. یعنی وہ لوگ جو "دینا" سیکھتے ہیں اور اس طرح اپنی اور تمام نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں؛ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (۴-۱۸/۹۲)۔

ان آیاتِ کبریٰ سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کی نشوونما کا راز "دینے" میں ہے (EINSTEIN) کے الفاظ میں:-

انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کس قدر "دیتا" ہے. نہ یہ کہ اس میں "لینے" کی استعداد کس قدر ہے. (OUT OF MY LATER DAYS)

"دنیا" اور "آخرت" کا یہ مفہوم اس سے پہلے بھی سامنے آچکا ہے. میں نے اسے دہرایا اس لئے ہے کہ یہ حقیقت بڑی لطیف لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور جب تک اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے قرآن کے متعلقہ مباحث سمجھ میں نہیں آ سکتے. اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر سورۂ حدید کی ان آیات کو دیکھو جن کے سمجھنے میں تمہیں دشواری پیش آرہی ہے. حالانکہ میں ان آیات کو اس سے پہلے (ایک خط میں) لکھ چکا ہوں. قرآن کہتا ہے کہ اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (۵۷/۲۰) یہ نظریۂ حیات کہ زندگی فقط طبیعی زندگی کے مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے کیا ہے؟ یہ لعب ہے. لعب کے عام معنی تو کھیل تماشے کے ہیں لیکن اس کا اطلاق ایسی کوشش پر ہوتا ہے جس میں حرکت (MOVEMENT) تو ہو لیکن وہ حرکت انسان کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچائے. اسی لئے کہتے ہیں کہ لَعِبَ بِنَا الْمَوْجِ. دریا کی لہریں ہم سے کھیلتی رہیں. یعنی انہوں نے ہماری کشتی کو حرکت میں تو رکھا لیکن ساحلِ مقصود کی طرف بڑھنے نہ دیا. اور لَهْو کہتے ہیں ہر اس جاذبیت کو جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور اس طرح اسے اس کام سے غافل کر دے جو اس کے پیشِ نظر تھا (جس طرح تمہارے چھوٹے نوکر عبدو کی حالت ہے اسے دہی لینے کے

لئے بھیجو تو راستے میں بندریا کا تماشا دیکھنے میں ایسا محو ہوتا ہے کہ دہی لانا تو ایک طرف کٹورہ بھی گم کر دیتا ہے)۔ لہٰذا صرف طبیعی زندگی اور ذاتی مفاد کا نظریہ حیات ایسا ہے جس میں حرکت اور کوشش تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے منزلِ مقصود کی طرف نہیں لے جانے دیتی۔ کیونکہ منزلِ مقصود تھی انسانی زندگی کی نشو و نما اور یہ صرف جسمانی پرورش میں اُلجھ کر رہ گیا۔ مفادِ عاجلہ (یعنی منفعتِ خویش کا نظریہ) اپنے اندر ایسی کشش و جذب (لَهْوٌ وَ زِيْنَةٌ) رکھتا ہے کہ انسان کی نگاہوں سے اس کی زندگی کا نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے (لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ)۔ اس منفعتِ خویش کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وَ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ۔ یعنی باہمی تفاخر۔ فخر، گائے یا بکری کے ایسے باکھ (UDDER) کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں بڑا نظر آئے لیکن اس میں دودھ بہت کم ہو۔ لہٰذا محض انسانی زندگی میں باہمی تفاخر کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی حیاتِ خارجی (جسمانی پرورش) کے ساز و سامان تو بہت بڑے دکھائی دیں لیکن حیاتِ داخلی (جوہرِ انسانیت) بہت کم ہو۔ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ۔ اس زندگی کا مقصد فقط اس قدر ہوتا ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ دولت اور قوت دوسروں سے بڑھ جائے۔

یہ ہے مفادِ عاجلہ کی زندگی کی حقیقت۔ اس کی مثال اس بارش کی سی ہے كَمَثَلِ غَيْثٍ جو اس قسم کی سبزی پیدا کرے جو ایک ہی چھینٹے سے اُگ آتی ہے۔ اس قسم کی نباتات کی جڑیں اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں نیچے نہیں جاتیں۔ اس سے کسان خوش تو ہو جاتا ہے اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ۔ لیکن ذرا دھوپ پڑی اور وہ خشک ہوئی اور زرد پڑ گئی اور دو ہی دن میں چور چور ہو کر بکھر گئی۔ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا۔ اس قسم کی کھیتی کی زندگی دو چار دن کی ہوتی ہے اور اس لئے اس کی خوشی بھی ایسی ہی ناپائیدار۔ آخر کار اس کا نتیجہ افسردگی اور پژمردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا؛ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔ اس مایوسی اور افسردگی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرے اور اس طرح اس نظام کی محافظت میں آجائے جو اس قانون کی رُو سے متشکل ہوتا ہے؛ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ۔

مذکورہ بالا مثال سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مفادِ عاجلہ کی زندگی متاعِ فریب کے سوا کچھ نہیں وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ باہمی منافست کا جذبہ انسان کے اندر موجود ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے البتہ اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ تم مسابقت کرنا چاہتے ہو تو مسابقت کرو

اس نظام کے قیام میں جو خدا کے قانونِ ربوبیت کی رُو سے عمل میں آتا ہے اور جس میں انسانی زندگی ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رہتی ہے جو مفادِ عاجلہ کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ ہے (سَابِقُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ). اس نظام کا نتیجہ خوشگواریوں کی ایسی جنت ہوتا ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے اور ساری کائنات کو محیط ہوتی ہے: وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے اس نصب العینِ حیات کا جسے انسان وحیِ خداوندی کے مطابق متعین کرتا ہے: اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ. اس قسم کی خوشگواریاں اور کامرانیاں کسی خاص گروہ یا افراد تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ ہر اس جماعت کے حصہ میں آسکتی ہیں جو انہیں حاصل کرنا چاہے. یعنی اپنے اندر ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۱-۲۰/۵۷).

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ معاشی خوشحالیاں اسے مل سکتی ہیں جس میں ان کے حاصل کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو. اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص میں کسی داخلی یا خارجی حادثہ کی وجہ سے اس استعداد میں کمی واقع ہوجائے یا وہ بالکل ہی سلب ہوجائے (مثلاً بعض پیدائشی کمزوریاں یا بعض بیماریوں کے عواقب یا خارجی حادثات) تو کیا ایسی صورت میں وہ شخص ان خوشحالیوں سے محروم رہ جائے گا؟ بالکل نہیں. خدا کے قانونِ ربوبیت میں اس قسم کے حوادث کے لئے پہلے ہی سے (PROVISION) کردی گئی ہے. اس لئے کہ ایسے معاشرہ میں (جس میں ہر فرد کا نصب العینِ حیات دوسروں کی ربوبیت (نشوونما) ہو) اس قسم کی (PROVISION) از خود موجود ہوتی ہے: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۵۷/۲۲).

اس معاشرہ میں اس قسم کے حوادث انسان کو نشوونما سے محروم نہیں رکھتے. اس لئے کہ اس میں جن افراد کو زیادہ استعداد میسر ہوتی ہے وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کے ماحصل کو اپنے ہی تک محدود نہیں رکھتے. لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اس قسم کی دشواریاں تو اس معاشرہ میں پیش آتی ہیں جہاں ہر شخص دوسرے کی گھات میں اس طرح رہتا ہے جس طرح شکاری چپکے چپکے دبے پاؤں شکار کی طرف جاتا ہے اور اسے پکڑ کر بہت خوش ہوتا ہے وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۙ اس قسم کے "شکاری" معاشرہ میں اربابِ حل و عقد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے

سمیٹنے کی فکر کرتے رہتے ہیں اور اس خیال سے کہ لوگ ان کی اس روش پر گرفت نہ کر سکیں، ایسے قوانین وضع کر دیتے ہیں جن سے اس قسم کی مفاد پرستیاں "قانوناً" جائز قرار پا جائیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ط یہ لوگ قانونِ ربوبیت سے علانیہ سرکشی کی جرأت تو نہیں کر پاتے البتہ اس قسم کی قانون سازیوں سے اپنے لئے گریز کی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ ان گریز کی راہیں نکالنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے خدا کا قانون ذرا بھی اثر پذیر نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز رہے اور یہی اس کے قابلِ ستائش ہونے کی دلیل ہے۔ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ○ (۲۴-۲۳/۵۷)۔

اس قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ خدا کے رسول اس نظام کے اصول و ضوابط لے کر آئیں جن کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

لیکن اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ انفرادی مفاد کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے والے گروہ محض وعظ و نصیحت سے ایسا معاشرہ قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اس لئے اس نے نوعِ انسانی کی نفع بخشی کے لئے ضوابطِ قانون کے ساتھ شمشیرِ خارا شگاف بھی نازل کی۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲۵/۵۷)۔

لیکن اس نظام کے قیام کے لئے سب سے مقدم ضرورت اس جماعت کی ہے جو مفادِ عاجلہ کی جاذبیتوں سے صرفِ نظر کر کے اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھے اور اسے اس کا یقینِ محکم ہو کہ یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے جس سے یہ مخالفتوں کی تمام قوتوں پر غالب آ کر رہے گا۔ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ط اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (۲۵/۵۷)۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ دونوں معاشرے کس طرح نکھر کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک معاشرہ وہ جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا ہو کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کی منفعت (ربوبیتِ عامہ) کے لئے ہے اور دوسرا وہ جو "بُخل" کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ بُخل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ یا قوم سب کچھ اپنے مفاد کے لئے سمیٹ لے اور سامانِ زیست کو دوسرے کی منفعت کے لئے عام نہ ہونے دے۔ ایسے (ARRESTED INTERESTS) کا معاشرہ کہیئے۔ اس سے بُخل کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے مختلف مقامات پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو نظام اس نظریہ پر قائم ہوگا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی جگہ ایسا نظام لے لے گا جو اس کے مختلف نظریہ پر

قائم ہوگا۔ یعنی نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے۔ اس کے لئے بخل کے مقابلہ میں انفاق کی اصطلاح آتی ہے۔ اسے (OPEN INTERESTS) کا معاشرہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سے انفاق کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ یعنی وہ میانی جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے کہ تمہارا نصب العین حیات یہ ہونا چاہیئے کہ تم اپنی محنتوں کا ماحصل نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرو هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۴۷/۳۸)۔ لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم اس کے برعکس سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹنے لگ جاتے ہو فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ۔ تم برعمِ خویش یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح دوسرے انسانوں کو سامانِ نشو ونما سے محروم کر دو گے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اس اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس سے خود ہی محروم رہ جاؤ گے۔ اس سے تمہاری ذات کی نشو ونما رک جاتی ہے؛ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ جو معاشرہ قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ تم اپنی نشو ونما کے لئے اس کے محتاج ہوتے ہو — وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ اب یہ دونوں راہیں تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم بخل والا معاشرہ قائم کرو گے تو اسے بقاء نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تم اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤ گے۔ تمہاری جگہ ایک ایسی قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی ذہنیت نہیں رکھے گی اور اس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوجائے گا جو نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوگا؛ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) یعنی خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ بقاء اسی نظام کے حصہ میں آسکتی ہے جس کا مطمحِ نگاہ نوعِ انسانی کی منفعت ہو۔ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔

میں نے تمہیں اپنے سابقہ خط میں بتایا تھا کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق قائم ہو اسے صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ قرآن اس ضابطہ کا نام ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس ضابطہ کی ابتداء ہی اس محکم اصول سے ہوتی ہے جس پر اس معاشرہ کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ بنیادی اصول ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحق تعریف وستائش ہوگا جو ربّ العالمینی (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔ اس نظام کو قائم کرنے والوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اس سے ان پر کچھ تنگی ہی کیوں نہ آجائے؛ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسانی ذات کی نشوو ارتقاء کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے: وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹). شُحَّ کے لفظ پر غور کرو انفرادی مفاد پر مبنی معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔

ذرا سامنے لاؤ اس منظر کو کہ گرمی کی شدت ہے۔ کسی ایک جگہ تھوڑا سا پانی ہے اور اس کے ارد گرد پیاسوں کا ہجوم۔ ایسے میں ہر پیاسے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی پی لے۔ اس قسم کے منظر کو کہتے ہیں تشا محا الما۔۔ شُحِّ نفس اسی قسم کی ذہنیت کا نام ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ میں اس معاشرے کی پوری ذہنیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے جس میں ہر فرد اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو شُحّ (مفادِ خویش) کی ذہنیت پر استوار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا معاشرہ وہ ہے جو انفاق (مفادِ کُلّی) کے تصور پر قائم ہوتا ہے جس میں ہر پیاسے کی خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی پہلے پانی پی لے۔ تم نے پروفیسر (HAWTREY) کا یہ قول اُوپر دیکھا ہے کہ معاشی نظاموں میں وجہِ تفریق صرف یہ ہوتی ہے کہ ان میں لوگوں کے کام کرنے کے لئے جذبہ محرکہ کیا ہوتا ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ جس معاشرہ میں افراد کی ذہنیت میں اس انداز کی تبدیلی پیدا ہو جائے جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے اس کی محکمیت اور افضلیت میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

قرآن اس ذہنیت کو بھی یونہی اندھے عقیدے کی بنا پر پیدا نہیں کرتا۔ وہ اس کے لئے دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف افرادِ معاشرہ میں اکتسابی صلاحیتیں (EARNING CAPACITIES) مختلف ہوتی ہیں۔ جس شخص میں اکتسابی استعداد زیادہ ہوتی ہے (اور وہ اس استعداد کو کام میں بھی لاتا ہے) وہ زیادہ کماتا ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔ اس لئے میں اس کمائی کا واحد مالک ہوں۔ میں اسے کسی دوسرے کو کیوں دے دوں؟

قرآن میں قارون کو مفاد پرستانہ ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا جاتا کہ وہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں، وہ روش کیوں نہیں اختیار کرتا جس سے انسانی مساوات کا نظام قائم ہو جاتے وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۲۸/۷۷). تو وہ اس کے جواب میں کہتا کہ جو کچھ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے اسے دوسروں کو کیوں دے دوں: قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ (۲۸/۷۸). یہ ذہنیت

کسی خاص "قارون" کی نہیں، ہر دور کا "قارون" (سرمایہ دار) اپنی روش کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتا ہے (۳۹/۴۹)۔

قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ جس چیز کو تم اپنی "ہنرمندی" (عِلْمٍ عِنْدِیْ) قرار دیتے ہو اس میں خود تمہارا حصہ کتنا ہے اور کتنا حصہ تمہیں "مفت" ملا ہے۔ استعداد کا اختلاف پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے! اس کے بعد اس پر بچے کا ابتدائی ماحول، تربیت اور تعلیم اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر مواقع (OPPORTUNITIES) کا سوال سامنے آتا ہے۔ اب سوچو کہ ان تمام مراحل میں خود ذاتی "ہنرمندی" کا کس قدر دخل ہوتا ہے اور ان عناصر کا کس قدر، جو تمہارے اپنے پیدا کردہ نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سامنے آجائے گی کہ تمہاری استعداد و صلاحیت کی بنیادیں ان عوامل (FACTORS) پر قائم ہوتی ہیں جن میں یا تو تمہارا دخل ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔

اس کے بعد اس مرحلے میں آجاؤ جس میں تم اپنی استعداد کو عمل میں لاکر (یعنی محنت کر کے) دولت کماتے ہو اس میں بھی دیکھو کہ تمہاری ہنرمندی کا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور کتنا حصہ آفاقی قوتوں (NATURAL FORCES) کا ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے سلیم! کہ وہ مجرد حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو محسوس مثالوں (CONCRETE EXAMPLES) کے ذریعے ذہن نشین کراتا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کھیتی کی مثال پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان عوامل و عناصر کو بھی سامنے لاتا ہے جن پر ہماری روزمرہ کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غور کرو کہ اس غلے کی پیدائش میں جسے تم آخرالامر اپنی ملکیت سمجھ کر سمیٹ بیٹھتے ہو، تمہاری "ہنرمندی" کا کتنا حصہ ہے اور کتنا حصہ "ہمارا" ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۵۶/۶۳﴾ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ غلہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیز ہر روز تمہارے سامنے آتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا تمہیں علم نہ ہو یا جس کا علم حاصل کرنے کے لئے تمہیں کہیں دور دراز جانا پڑے۔ یہ تو تمہارے ہر روز کے مشاہدے کی چیز ہے۔ دیکھو کہ غلے کی پیداوار میں تمہارا کس قدر حصہ ہوتا ہے؟ پہلے تو یہ دیکھو کہ خود زمین جس سے کھیتی اگتی ہے وہ تمہاری پیدا کردہ نہیں۔ لہٰذا اس کاروبار میں راس المال (PRINCIPAL INVESTMENT) بھی تمہارا نہیں۔ اب آگے بڑھو، اس زمین میں تم اتنا ہی کرتے ہو کہ ہل جوت کر بیج ڈال دیتے ہو (مَّا تَحْرُثُوْنَ)۔ اب سوچو کہ مٹی میں ملے ہوئے بیج سے کونپل کون پیدا کرتا ہے؟ "حرث" کو "زراعت" میں کون تبدیل کرتا ہے۔ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا خدا کا آفاقی قانون کرتا ہے، ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۵﴾ اگر

اس میں ہمارا (یعنی خدا کا) قانون کارفرما نہ ہو تو کھیتی اُگنا تو ایک طرف، تمہارے بیج کے دانے بھی مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں اور اس طرح تمہاری محنت بھی رائیگاں جائے اور ساتھ مُفت کی چٹی بھی پڑ جائے: لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ۔

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ یہ صاف اور شفاف پانی جس پر کھیتی کا دارومدار اور خود تمہاری زندگی کا انحصار ہے، تمہاری "ہنرمندی" سے پیدا ہوتا ہے؟ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ؕ وہ کون ہے جو پانی کو سمندر سے اٹھا کر بادلوں کے مشکیزے میں بھرتا ہے اور اسے تمہاری ضرورتوں کے مطابق جگہ جگہ تقسیم کرتا ہے۔ زائد پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے حوضوں (RESERVOIRS) میں جمع کر دیتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ ندی نالوں میں بہاتا ہوا تمہارے کھیتوں اور مکانوں تک لے آتا ہے: ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ○ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچو کہ یہ کس کا انتظام ہے کہ سمندر کے پانی کے تمام نمک (جس سے وہ پانی نہ پینے کے قابل رہتا ہے نہ زراعت کے کام آسکتا ہے) وہیں رہ جاتے ہیں اور کشید کردہ مقطر پانی تمہاری صراحیوں اور کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے: لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ○

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ تمازت اور حرارت جس پر نشو ونما اور ہست و بود کا انحصار ہے، کس کے قانون سے تپش آمادہ رہتی ہے؟ کیا اس کی حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے؟ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ؕ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ○ غور کرو اور بتاؤ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — یہ زمیں کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

ظاہر ہے کہ یہ کاروبار تمہارا اور "تمہارا" مشترکہ تھا۔ اس میں دیکھو کہ تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور ہمارا حصّہ کس قدر؟ جس نسبت سے تمہارا اور ہمارا حصّہ ہے اسی نسبت سے اس کاروبار کا ماحصل (یعنی پیداوار) تقسیم کر لو۔ تم اپنا حصّہ آپ لے لو اور ہمارا حصّہ وہاں پہنچا دو جہاں ہم کہتے ہیں۔ یہ حصّہ ان ضرورتمندوں کا ہے جن میں اکتسابی استعداد بہت کم ہے یا وہ معاشرے کے دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں یا جن کی استعداد کسی

وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔ ہم نے اس حصہ کو ان ہی کے لئے مختص کر رکھا ہے (نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ) مُقْوِيْنَ کے معنی ہیں بھوکے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ربوبیتِ عظمیٰ کا انتظام ہو سکے گا۔ پس تمہیں چاہیئے کہ اس نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کوشاں رہو (فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ٥ (۷۴ — ۶۳/۵۶)۔

سلیم! تم نے دیکھا کہ قرآن کس بلیغ انداز سے اس حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے کہ جس ماحصل کو انسان اپنی ہنرمندی اور کاریگری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اس میں خود انسان کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور کس قدر حصہ ان عناصر و عوامل کا جن کے پیدا کرنے یا بروئے کار لانے میں اسے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ عناصر یا تو اس معاشرے کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس میں وہ فرد پرورش پاتا ہے (مثلاً صحت اور غذا کا انتظام، تعلیم و تربیت کے ادارے، سازگار ماحول اور مساعد فضا وغیرہ وغیرہ) یا کائنات میں بکھری ہوئی نعمتیں جو بلا محنت و مشقت حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا، روشنی، گرمی، وغیرہ۔ اسی لئے قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ جو چیز تمہاری استعداد اور صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ ہے اس پر تمہیں حقِ ملکیت حاصل ہے۔ (جیسا کہ میں نے سابقہ خط میں لکھا تھا) سورۂ نحل میں ہے کہ تم میں سے بعض افراد کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ اکتسابی قوتیں حاصل ہیں لیکن یہ استعداد تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ قانونِ خداوندی کی عطا فرمودہ ہے؛ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ (۱۶/۷۱)۔ لہٰذا جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس استعداد کا ماحصل تمہاری ذاتی ملکیت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس ماحصل کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ کم استعداد کے لوگ جو چھوٹے چھوٹے کاموں پر مامور ہیں اس سے ان کی ضروریاتِ زندگی کا سامان مہیا کیا جائے؛ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ۔ قرآن کہتا ہے کہ تم اس تقسیم کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے زیادہ اور کم استعداد والے لوگ سب برابر ہو جائیں گے (فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ) وہ کہتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تمہیں جو قوت اور استعداد خدا کی طرف سے بطور بخشائش ملی ہے تم اسے اپنی ملکیت تصور کرتے ہو اور اس کے عطیۂ خداوندی ہونے سے انکار کرتے ہو؛ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ بالکل غلط ہے کہ عطایائے خداوندی کو سمیٹ کر اپنی ہی ذات کے لئے مختص کر لو۔ جب ہم نے اپنے عطیات (سامانِ پرورش) میں حد بندیاں نہیں کیں تو کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ انہیں محدود اور مقیّد کر کے رکھ لے۔ وَ مَا

كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (۱۷/۲۰)۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کریم کس طرح اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مفاد پرستانہ گروہ (یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت) کی یہ دلیل کہ جس دولت کو ہم اپنی ہنرمندیوں سے پیدا کرتے ہیں' اسے دوسروں کو کیوں دے دیا جائے' کس قدر نگاہ کا فریب اور حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جس چیز کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا ہے اس میں اس کا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ فطرت کے عطایا ہوتے ہیں اور فطرت نے ان قوتوں اور نعمتوں کو عطا اس لئے کیا ہے کہ اس طریق سے نوعِ انسانی کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچ سکے۔ قرآن اسی حقیقت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں راستے تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ تم سوچو کہ ان میں سے کون سی راہ علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی راہ ہے۔ اگر تم اس دعوے سے متفق ہو جاؤ کہ صحیح علم و بصیرت کی راہ وہی ہے' جس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی منفعت ہے' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اس راستے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اب سوچو کہ جو قوم اس حقیقت کو اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنے سفرِ حیات کی منزلِ مقصود قرار دے لے کیا اُس کے افراد کے دلوں میں کبھی یہ خیال تک بھی آئے گا کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم دن رات محنت کرتے رہیں اور اس محنت کا ماحصل دوسروں کی پرورش اور تربیت کے لئے صرف کر دیا جائے؟ ان کا تو دعویٰ یہ ہو گا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر بنیں' اس لئے ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرے گی (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)۔ قرآن نے اس جماعت کا نام ربانیوں کی جماعت رکھا ہے۔ اس کی تعلیم کا مقصد ہی اس قسم کی جماعت پیدا کرنا تھا۔

اب تم خود سوچو سلیم! کہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس تعلیم کی رُو سے' یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زرِ فاضلہ کس کے پاس رہے اور ذرائع پیداوار کس کی ملکیت ہیں۔ اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ قدرتی پیداوار اور انسانوں کی محنت کا ماحصل سب کے سب نوعِ انسانی کی پرورش (ربوبیت) کے لئے صرف ہوں اور ہر فرد اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دے۔ لہٰذا جب منتہائے نگاہ پوری انسانیت کی پرورش و تربیت ٹھہرے تو اُس ذاتی ملکیت کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس میں ماحصلِ پیدائش و محنت' کسی ایک فرد یا چند افراد کی ذات کے لئے محدود و مختص ہو کر رہ جائیں۔

قرآن کی غایت اس قسم کا نظام قائم کرنا ہے جس میں پوری کی پوری انسانیت کی پرورش (ربوبیت) ہو سکے

اور تمام افرادِ انسانیہ خدا کی معاشی سہولتوں سے یکساں طور پر ممتع ہوسکیں. یہی اسلام کا منتہیٰ ہے. ع

اگر با او نرسیدی تمام بُولہبی است

مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے سلیم! کہ قرآنی نظامِ ربُوبیت (QURANIC SOCIAL ORDER) کے متعلق اس طرح منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک جامع کتاب میں تفصیلی طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی رہے. تمہارے خط ملنے پر میں نے اسے کتابی شکل میں ترتیب دینا شروع کر دیا ہے. مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جلد ہی تم تک پہنچ جائے گی[1]. تمہارا تقاضا ٹالا نہیں جا سکتا.

اچھا. خدا حافظ

دسمبر ۱۹۵۲ء

---

[1] یہ کتاب "نظامِ ربوبیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے. (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

گیارہواں خط

صلوٰۃ و زکوٰۃ کا مفہوم

سلیم! میری بیماری کے دوران تمہارے کئی ایک خطوط جمع ہو گئے۔ تم اپنی جگہ پریشان ہو گے کہ خط کا جواب کیوں نہیں ملتا۔ میں اپنی جگہ پریشان تھا کہ میری خاموشی تمہارے لئے وجہ تشویش ہو گی۔ اور اس لئے بھی کہ تمہارے استفسارات کا جواب جلدی ملنا چاہیئے" تاکہ تمہاری کاوش تحقیق" تذبذب میں نہ بدل جائے کہ پھانس کا زیادہ دیر تک چبھے رہنا' بعض اوقات ناسور کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ لیکن میں معذور تھا۔ اب بھی اگرچہ نسبتاً بہتر ہوں' لیکن پوری طرح کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ یہ خط بھی املا کرا رہا ہوں' خود نہیں لکھ رہا۔

تمہاری حیرت بجا ہے کہ جو باتیں بظاہر مسلمات سی دکھائی دیتی ہیں' جب انہیں ذرا کریدا جائے تو وہ بھی حقیقت سے بعید نظر آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اُن چیزوں کو بھی جو بظاہر مسلمات کی حیثیت سے اُن تک وراثتاً پہنچی ہوں' فکری تنقید سے نہ پرکھے۔ وائٹ ہیڈ کو تم جانتے ہو۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے:۔ (IT REQUIRES A VERY UNUSUAL MIND TO UNDERTAKE ANALYSIS OF WHAT IS OBVIOUS)

> اس بات کے لئے ایک بڑے غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو باتیں عام طور پر مسلمات میں سے مانی جاتی ہیں ان کا تجزیہ کرے۔

اس حقیقت پر غور کرو سلیم! بظاہر یہ چیز بڑی سطحی سی نظر آئے گی۔ لیکن جوں جوں اس پر غور کرو گے یہ تمہیں ایک بہت بلند معیار کی طرف لے جائے گی۔ کتنی باتیں ہیں جنہیں ہم بطور مسلمات مانتے چلے جاتے ہیں اور اسکی

کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ کہیں رُک کر یہ دیکھیں کہ وہ فی الواقعہ ایسی ہیں کہ انہیں بطور مسلّمات مانا جائے۔ کتنے فریب ہیں جو محض اسی طرح رفتہ رفتہ حقائق بن جاتے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ذرا اس مسلّمہ کا تجزیہ تو کرو کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔" اور تجزیہ کر لینے کے بعد تم نے خود دیکھا تھا کہ یہ مسلّمہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ بات میں نے مثالاً دہرائی ہے۔ ورنہ تم اگر غور کرو تو دیکھو گے کہ کتنی باتیں ہیں جو ہم صبح سے شام تک بطور مسلّمات دہراتے چلے جاتے ہیں اور اس پر غور کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ وہ مسلّمات ہیں بھی یا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر وہ بات، جسے ہم بطور مسلّمہ مانتے ہیں، تجزیہ کے بعد ضرور غیر حقیقی ثابت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مبنی علی الحقیقت ہی ہو۔ لیکن جو چیز اس طرح فکری تنقید کے بعد بطور مسلّمہ مانی جائے گی وہی ایمانِ محکم کا درجہ رکھے گی۔ فکری تنقید میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہارے پاس اس کے مبنی علی الحقیقت ہونے کے لئے خدا کی طرف سے سند مل جائے اور یہ سند ایک مسلمان کے لئے قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے سب سے مقدم ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان تمام باتوں جنہیں ہم بطور مسلّمات مانتے چلے آرہے ہیں فکری تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں اور اس کے بعد صرف انہی مسلّمات کو تسلیم کریں جو قرآن کے معیار پر پوری اتریں۔ قرآن نے تقلیدی روش کی جو اس قدر مخالفت کی ہے تو اس لئے کہ جن چیزوں کو ہم تقلیداً مانتے ہیں اُن کا ہم کبھی فکری تجزیہ نہیں کرتے۔ نہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تائید میں خدا کی طرف سے بھی کوئی سند ہے یا نہیں۔ تقلیدی روش کے مسلّمات ہی کو وائٹ ہیڈ نے (WHAT IS OBVIOUS) کہہ کر پکارا ہے۔ قرآن ہر مسلمان (بلکہ ہر انسان) کو تاکید کرتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! سماعت، بصارت اور فؤاد (MIND) ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے فلاں بات کی تائید کی تھی؟ میں اس خط میں اس عظیم الشان حقیقت کی وضاحت کی گنجائش نہیں پاتا جو اس آیت میں قرآنِ کریم نے علم کی تعریف (DEFINITION) کے طور پر بیان کی ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہو جائے گی اور اس میں افلاطون کے نظریۂ علم سے لے کر آج تک کے نظریات کو سامنے لانا ضروری ہوگا۔ اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ قرآن نے علم کی جو تعریف کی ہے اس میں کس طرح اس ثنویت (DUALISM) کو مٹایا ہے جو تصوراتی (IDEALISM) اور حواسی (PERCEPTUALISM) نظریات نے پیدا کر دی ہے۔ اس وقت مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام مسلّمات کو اس علم کی کسوٹی پر پرکھیں جس میں سمع، بصر

اور فؤاد (MIND) سب کی شہادات موجود ہوں۔

ممکن ہے یہاں پہنچ کر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ایک طرف قرآن ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ.... (۲-۳/۲) اور دوسری طرف وہ ایمان کو علیٰ وجہ البصیرت قرار دیتا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اور باتوں کی طرح ایمان بالغیب کا مسئلہ بھی محتاجِ تجزیہ ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ دنیا میں ایک نظام قائم ہے۔ وہ اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے۔ اس کے خلاف پکار اٹھتی ہے کہ یہ نظام انسانیت کو تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ یہ پکارنے والا ایک دوسرا نظام پیش کرتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ یہ نظام، انسانیت کی نشو و نما اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا نظام ابھی محض لفظوں میں ہے اور اپنے نتائج پیدا کر نہیں سکتا تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے۔ اور اس کا عملی نفاذ ناممکن ہے تاوقتیکہ کچھ ایسے انسان موجود نہ ہوں جو اسے نافذ کریں اور نافذ وہی انسان کر سکتے ہیں جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی انہیں یقین ہو کہ نیا نظام وہ نتائج پیدا کر کے رہے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مطالبہ کریں کہ ہم اس نظام کی صداقت کے قائل اسی صورت میں ہوں گے کہ اس کے نتائج ہمارے سامنے آجائیں، تو یہ ایسا ہی مطالبہ ہوگا جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں پانی میں اس وقت اتروں گا جب مجھے پہلے تیرنا آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ تیرنے کے لئے پہلے پانی میں اترنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس نئے نظام کے نتائج دیکھنے کے لئے اس نظام کو عملاً نافذ کرنا ضروری ہے۔ اس جماعت کے لئے جو اس نظام کی تنفیذ میں پہل کرے گی (جسے قرآن نے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہہ کر پکارا ہے) یہ ضروری ہے کہ وہ اس نظام پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کر کے اس کا اطمینان کر لے کہ یہ وہ نتائج پیدا کر سکتا ہے جس کا یہ دعویٰ کرتا ہے۔ وہ نتائج ہنوز محسوس شکل میں سامنے تو نہیں آئے لیکن غور و تدبر نے ان کے امکان کی شہادت بہم پہنچا دی ہے۔ اسے کہیں گے اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھنا (اس "بن دیکھے ایمان" کو ایمان بالغیب کہتے ہیں)۔ یہی جماعت جب بن دیکھے نتائج پر ایمان لا کر اس نظام کو عملاً نافذ کر دے گی تو وہی بن دیکھے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے اور بعد کے لوگ جو ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لائیں گے، ان کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہوگا۔

اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ ایمان بالغیب سے صحیح مفہوم کیا ہے اور ایمان علیٰ وجہ البصیرت کسے کہتے ہیں؛ قرآن کا علمی معیار بہرحال ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ فقط اس کے دلائل اور شواہد کی نوعیت میں

ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ آج ہمارے پاس خدا کی کتاب بطورِ محکم سند کے موجود ہے۔ ہمارے لئے کوئی شے مسلّمہ کی حیثیت نہیں رکھ سکتی جب تک ہم اسے اس معیار پر پرکھ کر نہ دیکھیں۔ قرآن علم اور عقل کے لئے اسی طرح رہنمائی کا کام دیتا ہے جس طرح انسانی آنکھ کے لئے سورج کی روشنی۔ ہم ہر اس شے کو جو ہمارے سامنے بطورِ مسلّمہ کے پیش کی جاتی ہے، قرآن کی روشنی میں علم اور عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تقلیدی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ منزل بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر رسول کی دعوت کی تکذیب ان لوگوں کی طرف سے ہوئی جو ان مزعومات کو جو انہیں وراثتاً ملے تھے، مسلّمات مانتے چلے آرہے تھے اور اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ ان مسلّمات کو جو ان کے نزدیک (OBVIOUS) تھے علم وعقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ ہمارے ہاں جن چیزوں کو مسلّمات کی حیثیت حاصل ہے ان میں سے بھی بیشتر کی یہی کیفیت ہے۔ تم اگر ان مسلّمات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھو تو تم حیران رہ جاؤ گے کہ کس قدر غیر حقیقی نظریات میں جو یکسر حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مجوسی قوتیں جب کھلے بندوں اسلام کے دین کی حریف نہ ہو سکیں تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منظم سازش کی۔ جس طرح سینٹ پال جب دورِ اوّل کے عیسائیوں کو اذیتوں اور تکلیفوں کی بناء پر شکست نہ دے سکا تو اس نے خود عیسائیت کا نقاب اوڑھ لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آوردہ دین کی جگہ اپنا بنایا ہوا مذہب ہر طرف پھیلا دیا۔ چنانچہ آج دینِ عیسوی کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ہر عیسائی مذہبِ پولوس کا پرستار ہے (اور بزعمِ خویش) سمجھتا اسے عیسائیت ہے۔ اسی طرح اسلام سے شکست خوردہ یہودی، نصرانی اور مجوسی قوتوں نے مسلمانوں کا نقاب اوڑھا اور دینِ خداوندی کی جگہ آہستہ آہستہ اپنے نظریات و معتقدات کو مذہبِ اسلام کی شکل میں پھیلا دیا۔ آج ہمارے مروجہ مذہب میں بہت کم حصہ ایسا ہے جو اس دین پر مشتمل ہے جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا۔ باقی سب انہی سازشوں کی اختراعات پر مبنی ہے۔ نصاریٰ کی خانقاہیت (OTHER WORDLINESS) یہودیوں کی رسوم پرستی (RITUALISM) اور پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور ایرانی مجوسیوں کی اسلاف پرستی (ANCESTORAL WORSHIP) یہ ہیں عناصر موجودہ مذہبِ اسلام کے۔ میں اس کو "مذہب" کہا کرتا ہوں اور قرآن کے نظامِ زندگی کو دین۔ اس لئے کہ قرآن نے دین ہی کو پیش کیا ہے، مذہب کو نہیں۔ مذہب کا تو لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔

آج جس چیز کا نام احیائے دین اور شریعت کا نفاذ رکھا جاتا ہے اور ہر طرف سے مسلمانوں کو اس کی

طرف آنے کی دعوت دی جاتی ہے وہ درحقیقت ان ہی عناصرِ ثلاثہ کی طرف مراجعت کی دعوت ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کے مرتّب کردہ نظریات بطورِ مسلّمات (OBVIOUS) ہمارے ہاں متوارث چلے آرہے ہیں۔ اور یہی وہ مسلّمات ہیں جن کے تنقیدی تجزیہ کے بغیر ہم اصل دین تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ عیسائیت اگر آج چاہے بھی تو مذہبِ پولوس سے چھٹکارا حاصل کرکے دینِ عیسوی تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے کہ اُن کے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ لیکن ہمیں یہ خصوصیت (PRIVILEGE) حاصل ہے کہ ہمارے پاس ضابطۂ خداوندی (قرآن) محفوظ شکل میں موجود ہے۔ یہ دَور سلیم! ہماری تاریخ میں (ہماری تاریخ ہی نہیں، بلکہ انسانیت کی تاریخ میں) بڑا نازک دَور ہے۔ پاکستان کی سرزمین دے کر قدرت نے ہمیں ایک امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کرسکیں جو انسانی فلاح و بہبود کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے اسے اس کی اصلی شکل میں قائم کردیا تو نہ صرف یہ کہ ہم اپنے آپ ہی کو اونچا لے جاسکیں گے بلکہ فکر و نظر کی پریشانی میں اُلجھی ہوئی انسانیت کی امامت بھی کرسکیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور عجمی اثرات کا پیدا کردہ مذہب قانونی قوت کی حیثیت سے مسلط ہوگیا تو تم دیکھو گے کہ چند دنوں کے بعد ہم بھی اسی سطح پر جا ئیں گے جس سطح پر مسلمانوں کے دیگر ممالک ہیں[1]۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے غلط عقیدتمندی کی ہزار مقدّس آرزوئیں بھی جھٹلا نہیں سکیں گی، اس لئے کہ خدا کا قانون مقدّس آرزوؤں کی رعایت سے اپنے نتائج روک نہیں لیا کرتا۔

میرا جرم یہی ہے کہ میں اپنے ہاں کے بدیہی مسلّمات (OBVIOUS) کو جن پر ہم تقلیداً چلے آرہے ہیں، قرآن کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

تمہارے دوسرے سوال کا جواب ذرا زیادہ تشریح طلب ہے۔ میں نے اپنے گذشتہ سفر بلوچستان میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک ویران سی بستی کے قریب کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارات ہیں۔ ایک طرف ریلوے سگنل کا ٹوٹا ہوا کھمبا استادہ ہے، دوسری طرف ریل کا کانٹا موڑنے کا چکّر ہے۔ ذرا فاصلے پر ریل کی پٹڑی کے دو چار ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ گاؤں کے ایک بوڑھے نے بتایا کہ پہلے یہاں ریل کا اسٹیشن تھا۔ ہماری بستی اناج اور پھلوں

---

[1] یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ خط ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا تھا۔

سے بھری رہتی تھی۔ آنے جانے والے مسافروں کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی اور بستی کے لوگ خوشحال تھے اب یہاں سے ریل اُٹھا دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بستی نہیں ویرانہ ہے۔ نہ معلوم ہمارے کونسے گناہوں کی مار ہم پر پڑی۔ اب بڑی مشکل سے دن گزرتے ہیں۔ اس بڈھے نے ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ اس کی ایک دو پشتوں کے بعد جو بچے پیدا ہوں گے وہ اپنے ماں باپ سے ریل کی کہانیاں سنیں گے۔ اس کی برکات کے قصے سُن کر وہ ریل کے متعلق عجیب سا تصور قائم کریں گے۔ ریل کے مقام پر وہ ان ہی ٹوٹے ہوئے کھمبوں اور بکھری ہوئی پٹڑیوں کے نشانات دیکھیں گے۔ چونکہ انہوں نے ریل دیکھی نہ ہوگی اس لئے وہ یہی سمجھ بیٹھیں گے کہ وہ برکتیں ان ہی کھمبوں اور پٹڑی کے ٹکڑوں سے وابستہ تھیں۔ انہیں اگر کوئی سمجھانا چاہے کہ یہ کھمبے اور پٹڑیاں درحقیقت ریلوے کے عظیم نظام کے اجزاء تھے اور اس نظام کے اندر یہ اجزاء لاینفک تھے۔ لیکن ریلوے کا نظام منتشر ہو جانے سے اب ان سے وہ نتائج نہیں برآمد ہو سکتے جن کے لئے یہ وضع کئے گئے تھے، تو یہ بات ان بچوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکے گی۔ ریل کو دیکھے بغیر وہ ریل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں لگاسکیں گے اور نہ ہی یہ سمجھ سکیں گے کہ یہ کھمبے اور پٹڑیاں اب کیوں بے نتیجہ قرار دیئے جارہے ہیں اور اُس وقت ان میں کون سی نئی قوت پیدا ہو جائے گی کہ ان کے ایک اشارے پر ریل مع اپنی تمام برکات کے اِدھر سے اُدھر چلتی پھرتی رہے گی۔

دین ایک نظام کا نام ہے۔ اس نظام سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کے انسان اس انداز سے مل جُل کر رہیں کہ ہر فرد کو اس کی مضمر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشوونما پانے کے اسباب اور مواقع یکساں طور پر میسر ہوں۔ وہ نظام جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت (انسانی صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذریعہ بنے اور اس طرح دوسروں کی ربوبیت کی فکر اور انصرام میں خود اپنی انسانیت کی ربوبیت کا سامان پائے۔ طبیعی زندگی کی ضروریات تو اس نظام میں قدمِ اوّل سے بھی پیچھے کی بات رہ جاتی ہے۔ جو ربّانی نظام ہر فرد کی تمام فطری صلاحیتوں کے مکمل نشوو ارتقاء کا ذمہ دار ہو وہ انسان کی طبیعی ضروریات کو کب فراموش کرسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم القدر نظام کے اجزاء کثیر التعداد، مختلف النوع ہوں گے۔ نظام کے اندر ان اجزاء میں سے چھوٹے سے چھوٹا جزء بھی اپنا مقام، اپنی خصوصیت اور اپنی اہمیت رکھے گا اور اس نظامِ کُلّی کے نتائج مرتب کرنے میں اس کا بھی پورا پورا حصہ ہوگا اور اس جزء کے صحیح طور پر کام نہ کرنے سے پورا نظام معطل ہو جائے گا جس طرح ریل کی پٹڑی کے کسی ایک پیچ کے ڈھیلے ہو جانے سے تمام گاڑیاں اپنی اپنی جگہ رُک جاتی ہیں۔ اسلامی نظام میں

مختلف احکامات کی یہی حیثیت تھی۔ جب وہ نظام قائم تھا تو اس میں ہر نقل و حرکت جو نظام کے اصول کے مطابق ہوتی تھی، اس نظام کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتی تھی۔ لیکن جب نظام منتشر ہو گیا تو اس نظام کے یہی اجزاء سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے جکڑوں اور پٹڑی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی طرح باقی رہ گئے۔ ہم نے اس نظام اور اس کی برکات کی باتیں سُنی ہیں، اسے مشہود بیکر میں دیکھا نہیں۔ اب ہم انہی سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے جکڑوں اور پٹڑی کے ٹکڑوں کو اس نظام کی برکتوں اور سعادتوں کا ذریعہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ انہی پر ہم اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور ان ہی سے توقع کرتے ہیں کہ ہماری اُجڑی ہوئی بستیاں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔ ان میں پھر سے ملک ملک کے اناج اور قسم قسم کے پھل آئیں گے۔ ہمارا کارواں پھر پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مصروفِ جادہ پیمائی ہو جائے گا۔ سلیم! سوچو کہ ان حسین اور مقدس آرزوؤں سے یہ توقعات کبھی بھی پوری ہو سکتی ہیں؟ ریل کے نظام کے اندر یہی کھمبے اور پٹڑیاں ان برکتوں اور سعادتوں کے ذرائع تھے۔ لیکن اس نظام کے باہر یہ از خود کسی برکت اور سعادت کا موجب نہیں بن سکتے۔ نظام کے اندر یہ دین کے اجزاء تھے۔ نظام سے باہر یہ رسومات ہیں۔ مذہب، رسومات کے مجموعے اور ان سے وابستہ مقدس آرزو کا نام ہے ــــ دین کی صداقت کی دلیل اس کے زندہ نتائج ہوتے ہیں۔ مذہب کی صداقت اس کے ماننے والوں کی خوش عقیدگی سے باہر کہیں نہیں ہوتی۔ دین ایک چلتے پھرتے جسم نامی کی مثل ہوتا ہے۔ مذہب میں جسمِ مردہ کے الگ الگ ٹکڑے متبرک مقامات پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کا جو نظام دیا تھا اور جسے اس نے "الدّین" کی جامع اصطلاح سے پکارا تھا، اگرچہ اس کے الگ الگ حصے نہیں کیئے جا سکتے لیکن سمجھنے کے لئے یوں سمجھو کہ اس کا ایک حصہ وہ تھا جس سے افراد کی زندگی میں انقلابات پیدا ہوتے تھے اور دوسرا وہ جو انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بنتا تھا (اسے پھر سمجھ لو کہ یہ دو الگ الگ حصے نہیں تھے۔ داخلی انقلابات یعنی تغیّر کا لازمی نتیجہ ربوبیتِ عامہ اور ربوبیتِ عامہ کا فطری نتیجہ نفسِ انسانی کی نشوونما تھا۔ میں نے یہ دو حصے تمہیں سمجھانے کے لئے الگ الگ کئے ہیں تاکہ تمہارے مزید استفسار سے بچ سکوں)۔ ان دو حصوں کو قرآن نے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ سے تعبیر کیا۔ الصَّلٰوۃ کی اصطلاح میں نفسیاتی تغیرات کا پورا نظام اپنی سمٹی ہوئی شکل (MINIATURE FORM) میں منعکس ہو جاتا اور زکوٰۃ میں نشوونما دینے (ربوبیت) کے تمام اسباب و ذرائع سمو جاتے ہیں۔ الزَّکٰوۃ کے معنی ہی نشوونما (GROWTH) کے ہیں۔ الصَّلٰوۃ ایک مسلم کی زندگی کے ہر سانس کو محیط ہوتی ہے۔ اس کی ہر نقل و حرکت،

اس کی فکر، اس کے ارادے، ان ارادوں کے مظاہر، تمام کے تمام الصّلوٰۃ ہی کے مظہر ہوتے ہیں۔ الصّلوٰۃ صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔ وہ صراطِ مستقیم جس کے متعلق فرمایا کہ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ "تیرے نشوونما دینے والے کا قانونِ ربوبیت خود متوازن راہ پر چل رہا ہے"۔ اسی کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں پہلے نمبر کے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو۔ جو ادھر اُدھر کی راہوں میں نکل جائے وہ مصلّی نہیں۔ اسی لئے سورۃ القیامہ میں نظامِ اسلامی سے مُنہ موڑنے والے کے متعلق فرمایا: فَلَا صَدَّقَ وَ صَلّٰى وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۷۵/۳۱-۳۲) "وہ تصدیق نہیں کرتا اور نہ ہی صلوٰۃ کا پابند ہے بلکہ تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں اختیار کرتا ہے"۔ دیکھو سلیم! یہاں تصدیق کے مقابلہ میں تکذیب ہے اور صَلّٰى کے مقابلہ میں تَوَلّٰى، یعنی گریز کی راہیں نکالنا۔ اس لئے مصلّی وہی ہوگا جو متوازن راہ (صراطِ مستقیم) پر اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کے عین پیچھے چلتا جائے اور ادھر اُدھر دیکھے تک نہیں۔ سجدہ سے مراد ہی قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ سورۃ علق میں دیکھو۔ حضورؐ سے فرمایا گیا کہ نظامِ خداوندی سے مُنہ موڑنے والے کی اطاعت مت کرو (لَا تُطِعْهُ) بلکہ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (۹۶/۱۹) سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ یعنی سجدہ ہر غیر خداوندی قانون کی اطاعت سے انکار اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کا مظہر ہے۔ اسی طرح سورۃ مرسلات میں مجرمین اور مکذبین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ (۷۷/۴۸) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو یہ رکوع نہیں کرتے۔ یعنی قانونِ خداوندی کی تکذیب اور اس سے سرکشی رکوع سے مانع ہوتی ہے۔ لہٰذا رکوع کے معنی قانونِ خداوندی کی عملی تصدیق اور اس کے سامنے جُھک جانا ہے۔ سورۃ اعراف میں دیکھو، قانونِ خداوندی کے ساتھ کامل تمسّک کا دوسرا نام اقامتِ صلوٰۃ رکھا گیا ہے۔

> وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ (۷/۱۷۰)۔
>
> متقی وہ ہیں جو قانونِ خداوندی کے ساتھ پورا پورا تمسّک رکھتے ہیں، یعنی صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ ہمواریاں پیدا کرنے والے (مصلحین) ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

تمسّک بالکتاب یعنی قانونِ خداوندی کا عملاً اتباع ناممکن ہے جب تک دین کا نظام عملاً جاری و ساری نہ ہو۔ اور چونکہ اقامتِ صلوٰۃ بھی اسی نظام سے وابستہ ہے اس لئے اقامتِ صلوٰۃ بغیر تمکّن فی الارض (یعنی کسی

خطۂ زمین میں قرآنی حکومت قائم کئے بغیر) ناممکن ہے۔ سورۂ حج میں دیکھو کس قدر واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جب ہم ان لوگوں کو جو قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تمکّن فی الارض عطا کریں گے تو وہ الصلوٰۃ قائم کریں گے اور الزکوٰۃ کا انتظام کریں گے (۲۲/۴۱)۔ دوسری طرف سورۂ نور میں دیکھو، استخلاف فی الارض اور تمکّنِ دین کو "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" سے مشروط ٹھہرایا گیا ہے (۵۵-۵۶/۲۴)۔ اور آگے چلو۔ سورۂ شوریٰ میں جہاں یہ فرمایا کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ان کی حکومت باہمی مشاورت سے طے پائے گی)، اس سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ اور اس کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ آتے ہیں (۴۲/۳۸)۔ سورۂ حج میں جہاں قرآنی نظام قائم کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ان کا فریضۂ زندگی یہ ہوگا کہ وہ نوعِ انسانی کے اعمال کے نگران ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا: فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (۲۲/۷۸) اور اس کے بعد کہا وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ یعنی قانونِ خداوندی سے اعتصام، اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ ہی سے ممکن ہے۔ سورۂ اعراف میں دیکھو۔ پہلے فرمایا: قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (۷/۲۹) میرے نشوونما دینے والے نے یہ کہا ہے کہ نظامِ ربوبیت کے لئے توازن اور تناسب قائم کرنا ضروری ہے (قرآن میں عدل اور قسط اور وسطیٰ کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہیں اور ان ہی پر پورے نظامِ ربوبیت کا مدار ہے لیکن ان کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ انہیں یا تو کسی دوسرے خط میں لکھوں گا اور یا پھر تمہیں اُس کتاب کا انتظار کرنا ہوگا جس میں نظامِ ربوبیت کی تفاصیل دی جائیں گی[1])۔ اس کے بعد فرمایا کہ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ یعنی نظامِ ربوبیت میں توازن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اعمال اور افکار کے رُخ میں صحیح سمت اختیار کرو اور یہ سمت خدائی قانون کے ساتھ اپنا رُخ متوازی رکھنے سے حاصل ہوگی۔ اور اس کے بعد فرمایا: وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۷/۲۹) اور خالص نظامِ زندگی اسی قانون کے ذریعہ سے قائم ہو سکے گا۔ غور کرو سلیم! اگر قیامِ صلوٰۃ سے مقصود محض ہماری رسمی نمازیں ہوں تو ان کے لئے تمکّن فی الارض، یعنی ملک میں قرآنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ نمازیں تو ہم انگریزوں کی غلامی میں بھی پڑھا کرتے تھے اور آج بھی مسلمان اسی طرح پڑھ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے۔ ہماری ان نمازوں سے ہمیں کب استخلاف ملا؟ سورۂ بقرہ میں دیکھو۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے

---

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ (۱۹۵۰ء)۔

کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲/۲۷۷) ان لوگوں پر جو نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کو قائم کریں گے" کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا"۔ ذرا غور کرو کہ کیا ہماری نمازیں اور اڑھائی فیصد والی زکوٰۃ یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہے کہ ہمیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہو. صلوٰۃ کے متعلق سورۃ عنکبوت میں بیّن الفاظ میں ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (۲۹/۴۵) یقیناً صلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے سلیم! اس حتم اور یقین کو سامنے رکھو جس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے اور پھر اس کے بعد دیکھو کہ کیا ہماری موجودہ نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں؟ سورۃ روم میں دیکھو کیسے حسین اور بلیغ انداز میں اقامتِ صلوٰۃ کے دونوں گوشوں کے فطری نتائج کو بیان کیا گیا ہے : وَ اتَّقُوۡہُ یعنی قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس کے بعد کہا. وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَھُمۡ یعنی اس قانون کی نگہداشت کا عملی نتیجہ نظامِ قرآنی کی تشکیل ہوگا اور اس نظام کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ نوعِ انسانی جو اس نظام کے بغیر گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے ایک مرکز پر جمع ہو جائے گی اور اس طرح وحدتِ قانون سے وحدتِ نظام اور وحدتِ نظام سے وحدتِ انسانیت مشہود ہو جائے گی (۳۱-۳۲/۳۰)۔

یہاں پہنچ کر سلیم! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ نماز کے نام سے جو کچھ آج مسجدوں میں کیا جاتا ہے کیا اس کی بھی کچھ اصلیت ہے؟ اس کا جواب "ہاں" میں بھی ہے اور "نہیں" میں بھی. تمہیں معلوم ہے کہ فوج کے سپاہی کی ساری زندگی سپاہیانہ ہوتی ہے. لیکن بایں ہمہ کچھ وقت کے لئے ہر روز ہر سپاہی کو ان فرائض کی یاد دہانی اور مشق کے لئے ایک میدان میں بلا لیا جاتا ہے جو انہیں میدانِ جنگ میں ادا کرنے ہوتے ہیں. تم یہ بھی جانتے ہو کہ ایک نفسیاتی کیفیت (PSYCHOLOGY) افراد کی ہوتی ہے اور ایک اجتماع کی. جسے (MASS PSYCHOLOGY) کہا جاتا ہے. اجتماع اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے لیکن اجتماعی نفسیات افراد کی نفسیات سے الگ خصوصیت رکھتی ہیں. اجتماعی نفسیاتی کیفیت افراد کی نفسیاتی کیفیتوں کا حاصل جمع (SUM TOTAL) نہیں ہوتی. اس سے کہیں زیادہ اور منفرد نتائج کی حامل ہوتی ہے. اسلام نے دین کے نظام کی یاددہانی کے لئے صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات کو تجویز کیا ہے. اس لحاظ سے یہ اجتماعات اس نظام کے لاینفک پُرزے ہیں. لیکن اگر نظام مفقود ہو اور رسمی طور پر الگ الگ یا مساجد میں جمع ہو کر رکوع اور سجود کر لیا کریں تو اس کی مثال اسی سگنل کے کھمبے یا ریل کی پٹڑی کے ٹکڑے کی سی ہوگی جو ریل بند ہو جانے کے بعد اس بستی میں پڑے ہوتے تھے. ذرا سوچو سلیم! ایک سپاہی کے لئے وردی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اہمیت رکھتی ہیں.

لیکن اگر کوئی سپاہی فوج سے برطرف ہوجانے کے بعد اپنے گاؤں میں ہر روز صبح اُٹھ کر نہایت احتیاط اور التزام سے اپنے بوٹ کے تسموں سے لے کر سر کی ٹوپی تک ہر شے نہایت باقاعدگی سے پہنے اور بندوق کی جگہ ڈنڈا اٹھا کر چپ راست بھی کرتا رہے تو اس کا یہ عمل فی ذاتہٖ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرے گا. حالانکہ فوج کے اندر ان میں سے ہر شے مجموعی نتیجہ مرتب کرنے کے لئے لاینفک تھی. یہ ہے وہ حقیقت جس کی بنا پر میں نے کہا ہے کہ نماز کی یہ ظاہری شکل و صورت اپنی اہمیت رکھتی بھی ہے اور نہیں بھی. جب یہ نظامِ دین کا جزو بنتی ہے تو اس کی ہر حرکت خاص اہمیت رکھتی ہے اور جب اسے اس نظام سے الگ نکال لیا جاتا ہے تو ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے. دین میں یہی اجزاء نظامِ دین کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں. لیکن انسانوں کا خود ساختہ مذہب انہیں مقصود بالذات قرار دیتا ہے. دیکھو سلیم! قرآن نے اس فرق کو کس خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے. سورۂ بقرہ میں ہے، لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ (۲/۱۷۷) یعنی کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف مُنہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف. یہ جماعتی نظم پیدا کرنے کا طریقہ ہے مقصود بالذات نہیں. اس کے بعد فرمایا: وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ لیکن اصل کشاد کی راہ یہ ہے کہ ـــــ اس کے بعد قرآنی نظام کے مختلف اجزاء کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد فرمایا: وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ یعنی یہ ہیں نظامِ دین کے بنیادی عمود. یعنی قانونِ خداوندی کی نگہداشت سے ربوبیّتِ عامہ (انسانیت کے نشوونما کے اسباب و ذرائع کی فراہمی. یہ ہے اصل کشاد کی راہ. ان آیات میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل مقصود اپنے فکر و عمل کو وحیِ خداوندی کے مطابق بنانا ہے، کسی خاص سمت کی طرف رُخ کرنا مقصود نہیں. لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری جگہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ ایک خاص سمت کی طرف رُخ کرنا بھی اپنے مقام پر اہمیّت رکھتا ہے. چنانچہ فرمایا: وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۴۴) یعنی دین کے پورے نظام میں اپنے افکار و عمل کا رُخ قانونِ خداوندی کے ساتھ متوازی رکھنا اور اس کی ظاہری شکل میں تمام افرادِ جماعت کا رُخ نظامِ دین کے مرکزِ محسوس کی طرف رکھنا. غور کرو سلیم! وہی چیز (یعنی کسی خاص طرف رُخ کرنا) جس کے متعلق ایک جگہ کہا تھا کہ وہ کشاد کی راہ نہیں، دوسری جگہ کتنا ضروری قرار پا گیا. وہ "مذہب" کی رسم تھی اور یہ دین کا جزو ـــــ اسی نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قرآن نے "دِيْنُ الْقَيِّمَةِ" کہہ کر پکارا ہے جہاں فرمایا: وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا: اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ بجز اس کے کہ تم صرف قانونِ خداوندی کی محکومی اختیار کرو. مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور اپنا نظام خالصتہً اس کے قانون کے مطابق متشکل کرو. حُنَفَآءَ

ٹھیک ٹھیک اسی کی سیدھ میں اپنا رُخ قائم کرو۔ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ یعنی نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرو اور انسانیت کی نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرو: ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ ؕ (۹۸/۵) یہ ہے وہ نظام جو اپنے اندر خود بھی توازن رکھتا ہے اور انسانیت میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

یہ ہے فرق سلیم! "مذہب" کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں۔ "مذہب" کی نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے اور دین کی صلوٰۃ انسانیت کے ارتقاء کا موجب ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو پھر سُن لو کہ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں اپنی ساری زندگی کو قوانینِ خداوندی کے اتباع میں گزار دینا۔ لیکن صلوٰۃ کے اجتماعات دین کے نظام کا ایک اہم جزو ہیں اس لئے ان کا قیام بھی نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اجتماعات اسی صورت میں صحیح نتائج مرتب کرتے ہیں جب وہ دین کے نظام کا جزو بن جائیں۔

اب سلیم! تمہارا تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب بھی مشکل نہیں۔ ہم قرآنی دین سے جس قدر دُور ہٹ چکے ہیں اور اس کی جگہ جس طرح انسانی ذہن کے پیدا کردہ اعمال اور افکار نے لے رکھی ہے، یہ وہی حالات ہیں جن میں اقوامِ سابقہ میں نبی آیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ خدا کی کتاب اپنی اصلی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہم اس ضابطۂ حیات (قرآن) کے مطابق عملی نظام کس طرح متشکل کریں۔ ضابطۂ دین ملنے کے بعد دین کے نظام کو کس طرح متشکل کیا جاتا ہے، اس چیز کو بھی قرآنِ کریم نے خود بیان کر دیا ہے۔ جب نبیؐ اکرمؐ کو وحی کے ذریعے صحیح راستہ دکھا دیا اور یہ بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کو اپنی نشوونما ارتقاء کے لئے کس قسم کے نظامِ زندگی کو قائم کرنا ہوگا تو اس کے بعد آپ کو تزمیل کا حکم دیا گیا۔ تم نے سورۂ مُزَّمِّلْ کو پڑھا ہے (کسی زمانہ میں تو تم اس کا ورد بھی کیا کرتے تھے)۔ اس سورہ میں نبیؐ اکرمؐ کو جس لقب سے مخاطب کیا گیا ہے اس میں بتا دیا گیا ہے کہ دین کے نظام کی تشکیل کے لئے پہلا کام کیا کرنا ہے۔ اس کے لئے مُزَّمِّلْ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں۔ اونٹ کے کجاوے میں جو دو سواریاں بیٹھتی ہیں اور جن کے انتخاب میں اس بات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان سے کجاوے کا توازن قائم رہے، انہیں ایک دوسرے کا زمیل کہا جاتا ہے۔ تزمیل کے معنی اس قسم کے رفقائے سفر پیدا کرنا ہے اور مزمّل اسے کہتے ہیں جو ایسے رفقائے سفر پیدا کرنے میں نہایت احتیاط اور انہماک سے مصروف سعی و عمل ہو۔ رسولؐ اللہ سے کہا یہ گیا تھا کہ دین کے نظام کی تشکیل کے لئے پہلا مرحلہ ایسے رفقاء پیدا کرنا ہے جو فکر و عمل میں ہم آہنگ ہوں۔ لہٰذا، ہمارے

لئے بھی موجودہ فکری انتشار اور قلبی پراگندگی میں پہلا کام تزمیل کا ہے. یعنی ایسے رفقائے کار کی تلاش جن میں فکری ہم آہنگی ہو. لیکن یہ عملِ تزمیل کس قدر ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے' اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے. ذرا غور کرو. حقیقت یہ ہے کہنے کو تو آج ہر شخص بطور فیشن مراجعت الی القرآن (BACK TO THE QURAN) پکارتا رہتا ہے لیکن جو شخص عملاً قرآن کو حکم تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے' اسے سب سے بڑا ملحد اور بے دین قرار دے دیا جاتا ہے. اس لئے کہ قرآن "موجودہ مذہب" کے خلاف اعلانِ جنگ ہے. دین کا مقصود انسانی زندگی کی معاشرتی ناہمواریاں (فساد) دُور کر کے ان کی جگہ ہمواریاں (اصلاح) پیدا کرنا تھا. مذہب کا کام مفاد پرستی کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو مضبوطی سے قائم رکھنا ہے. دین' فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے' مذہب انسانی فکر کو معطل کر دیتا ہے. دین' زندگی کی مستقل اقدار سامنے لا کر انسانی فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ' اپنے زمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر' ان کی روشنی میں اپنے لئے جزئیاتِ قانون مرتب کرے. مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ ہم سے پہلے انسانوں (اسلاف) نے کبھی سوچا تھا اس سے ایک قدم اِدھر اُدھر ہٹنا جہنم میں گرنا ہے. دین اپنے نتائج کو سب سے پہلے اسی دنیا میں سامنے لاتا ہے اور ان نتائج کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے. مذہب کی رسمیات چونکہ کوئی زندہ نتیجہ پیدا کر نہیں سکتیں' اس لئے وہ ان اعمال کو مزین بنانے کے لئے یہ دھوکا دیتا ہے کہ اُن کے نتائج اس دنیا میں نہیں نکلیں گے' اگلی دنیا ہی میں جا کر مرتب ہوں گے. دین' زندگی کو مسلسل قرار دیتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو اپنے آغوش میں لئے رہتی ہے. اس کی رُو سے زندگی کی نشوونما یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک برابر ساتھ چلتی ہے. مذہب' دنیا سے نفرت سکھاتا ہے تاکہ مفاد پرست گروہ اس پر بے غل وغش قابض رہیں اور عوام رزق کے سرچشموں کو ان مستبدین کے ہاتھوں سے چھیننے کا تصور بھی نہ کر سکیں. دین' صرف خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے' حتیٰ کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اسی قانون کی اطاعت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دیتے تھے. مذہب اشخاص پرستی سکھاتا ہے. کہیں زندہ اشخاص کی' اور کہیں مردہ کی. چونکہ عوام کی ذہنی سطح محسوسات کی خوگر ہوتی ہے اور تقلیدی تقدس سے اس چیز کو اور بھی پختہ کر دیا جاتا ہے' اس لئے مذہب اپنی مسندوں کو برقرار رکھنے کے لئے عوام کو ہر اس دعوت کے خلاف مشتعل کرتا رہتا ہے جو اشخاص پرستی کے بجائے قانونِ خداوندی کی اطاعت کی طرف بلائے. لہٰذا' اس قسم کے حالات میں' جسے قرآن نے "خشکی اور تری میں فساد" سے تعبیر کیا ہے' خالص قانونِ خداوندی کی طرف دعوت دینا بڑا صبر آزما مرحلہ ہے. لیکن سہل یا دشوار' راستہ بہرحال یہی ہے. اس سفر کے پروگرام میں پہلا مرحلہ "تزمیل" ہے.

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، یہ مرحلہ بڑا صبر طلب ہے (صبر کے معنی استقامت ہیں)۔ عاجلہ مفاد پرستی کے پروگرام اپنے نتائج فوراً سامنے لے آتے ہیں اس لئے ایسے پروگرام کی کامیابی بڑی آسان ہوتی ہے لیکن مستقل اقدار کے تابع نظامِ زندگی کا قیام اپنے نتائج بہت دیر میں سامنے لاتا ہے۔ خود اس پروگرام کے دَورِ اوّل پر غور کرو۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جیسی اولوالعزم اور بلند سیرت شخصیت ہے جو اس نظام کی طرف دعوت دیتی ہے۔ نبوت ملنے کے بعد سے آپؐ کا عرصۂ حیات (آپؐ کی طبعی زندگی کے اعتبار سے) کُل ۲۳ سال ہے۔ اس ۲۳ سال کو قیامت تک کے زمانہ پر پھیلاؤ۔ ایک ایک سانس میں صدیاں سمٹی ہوئی ملیں گی۔ اس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں سے ابتدائی ۱۳ برس کا عرصہ اسی تزمیل میں گزر گیا۔ آہستہ آہستہ بتدریج، ایک ایک، دو دو کر کے تین چار سو کے قریب رفقائے سفر میسّر آئے۔ اس مرحلے میں وقت اور کوشش تو بہت صرف ہوئی لیکن جو رفقائے سفر میسّر آئے ان کی ایک ایک جست نے صدیوں کی مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے کر دیں۔ اس عملِ تزمیل کے دوران نہ کسی سے ٹکراؤ ہوتا ہے نہ تصادم۔ نگاہ صرف اس مقصد پر مرکوز رہتی ہے کہ انسانوں کے اس انبوہ سے ہر وہ فرد جس میں اس نظام کے قبول کرنے اور اسے قائم رکھنے کی صلاحیت موجود ہے، ریت کے تودوں سے الگ ہو کر اپنی طرف آ جائے تاکہ (قرآن کے الفاظ میں) کوئی ایک فرد بھی نادانستہ ہلاک نہ ہونے پائے۔ دیکھو سلیم! کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس نظام کی طرف دعوت دینے والے پر۔ اسے تمام تکالیف اور مصائب نہایت ہمت سے برداشت کرنے ہوں گے تاکہ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہنے پائے جس میں اس نظام کے قبول و قیام کی صلاحیت ہو اور وہ اس وجہ سے ہلاک ہو جائے کہ اسے صادقین کی رفاقت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایسے صلاحیت رکھنے والے افراد کی تلاش کرنا، پھر ان کے ذہنوں میں جو غلط نقوش مستولی ہوں، انہیں صاف کر کے ان کی نکھری ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اس میں کسی قسم کے جبر اور اکراہ کو کام میں نہ لانا، یہ ہے سب سے پہلا کام جس سے زمیل اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس کا عملی طریقہ یہی ہے کہ خالص قرآنی فکر کو عام کیا جائے اور جو لوگ اس فکر کو اپنے اندر محسوس کریں وہ ایک مرکز پر جمع ہوتے چلے جائیں۔ اس فکری ہم آہنگی کے بعد اگلا قدم ہوگا نظامِ ربوبیت کے لئے فضا کو سازگار بنانا۔ جو مفاد پرستانہ موانع اس کے راستے میں حائل ہوں گے انہیں راستہ سے ہٹانا ضروری ہوگا۔ اس ربوبیت سے جس میں ہر فرد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس نظام کے ذمہ ہوگی، انسانیت کی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی اور ہر آنے والی نسل اپنی سابقہ نسل سے کہیں آگے ہوگی۔ تا آنکہ انسانیت خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی اور "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔" جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جسے آج روٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے

اور جو ہماری موجودہ معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے؛ وہ تو اس نظامِ ربوبیت کی تمہیدی منزل ہے۔ اس نظام میں رزق کے سرچشمے افراد کے بجائے نظام کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اُس نظام کے ہاتھ میں جس کی بنیاد وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق کے غیر متبدل قانون پر ہوتی ہے۔

سلیم! تمہارے ذمہ یہ کام ہے کہ قرآن کے جس جس گوشے کو تم سمجھ چکے ہو اسے آگے پھیلاتے چلے جاؤ اور باقی حصوں کے سمجھنے میں جو جو دشواریاں پیش آئیں اُن کا حل طلب کرتے رہو اور اس سے مایوس مت ہو کہ مفاد پرست پارٹیاں کیا کچھ کر رہی ہیں۔

اب رہا تمہارا یہ سوال کہ خدا پر ایمان کے بغیر محض اخلاقی ضابطوں پر کسی نظام کی بنیاد کیوں نہیں رکھی جا سکتی؟ سو اس کے جواب کے لئے دوسرے خط کا انتظار کرو جس میں یہ بتاؤں گا کہ خدا پر ایمان کے بغیر اخلاق کا تصور ہی ناممکن ہے۔ لیکن خدا سے مراد قرآنی خدا ہے، نہ کہ ذہنِ انسانی کے تراشیدہ بُت۔ وہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکے گی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری موجودہ پستی کی وجہ ہماری کمزوریِ ایمان ہے، تو اس کا صحیح مفہوم کیا ہوتا ہے؟

اب میں تھک گیا! خدا حافظ۔

والسّلام

اگست ۱۹۵۰ء

بارہواں خط

تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟

سلیم بیٹے! دعا

تم نے بلاواسطہ تو سورۃ الماعون کے سرِفہرست "تکذیبِ دین" کا مطلب دریافت کیا ہے لیکن بالواسطہ اس میں اور نکات بھی آگئے ہیں۔ وہ نکات صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے متعلق ہیں جو بجائے خویش بڑی وضاحت چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کی ایک خط میں گنجائش نہیں اس لئے میں مختصر الفاظ میں ان کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ ل۔ و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ چنانچہ صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَۃً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر کا گھوڑا پہلے نمبر کے گھوڑے کے عین پیچھے مسلسل دوڑ رہا ہو۔ پہلے نمبر والے گھوڑے کو سَابِقٌ کہتے ہیں اور اس کے پیچھے آنے والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اس سے صَلّٰی کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے والا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت میں ہے۔ سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ صَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَ ثَلَّثَ عُمَرُ (بحوالہ تاج العروس) "رسول اللہ پہلے تشریف لے گئے، ان کے پیچھے حضرت ابوبکرؓ اور پھر تیسرے نمبر پر حضرت عمرؓ...... امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں جو ہے: لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴/۴۳) "ہم مصلّین میں سے نہیں تھے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاءؑ کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ان تصریحات سے صلوٰۃ کا بنیادی اور جامع مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع۔ خدا کی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یہ اتباع زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود نہیں۔ بلکہ انسان کی پوری کی پوری زندگی اس کے اندر آ جائے گی۔ اس لئے اس کے معنی ہوں گے زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ خداوندی کا اتباع۔ ان فرائضِ منصبی کی تکمیل جو انسان پر ان قوانین کی رُو سے عائد

ہوتے ہیں۔ وہ نظام جس کے اندر رہتے ہوئے انسان ان فرائض کی تکمیل کر سکتا ہے' دین' کہلاتا ہے۔ لہٰذا 'صلوٰۃ کا نظام' دین کا پورا نظام ہوگا۔ صلوٰۃ کے اجتماعات (جنہیں نماز کہا جاتا ہے) اسی نظام کا ایک حصہ ہیں۔ یہ درحقیقت عملی مظاہرہ ہے اس ایمان کا کہ ہم نے اپنی پوری زندگی قوانینِ خداوندی کے تابع بسر کرنی ہے اور ان کے سوا کسی قانون اور فیصلے کے سامنے نہیں جھکنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کا تصور صرف اجتماعاتِ نماز تک محدود نہیں بلکہ انسان کی ساری زندگی کو محیط ہے۔ یعنی جب ہم نماز ادا کر لیں تو ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم فریضۂ صلوٰۃ سے بالکلیہ فارغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا یہ چاہیئے کہ ہم نے فریضۂ صلوٰۃ کے ایک حصہ کو ادا کیا ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب ہم اپنی پوری زندگی نظامِ خداوندی کے تابع بسر کریں اور اسی طرح بسر کرتے جائیں تا آنکہ ہماری دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (۲/۱۳۲)

صَلّٰی کے معنی

یہ بات کہ صَلّٰی کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں، قرآنِ کریم نے خود واضح کر دیئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ القیامۃ میں ہے۔ فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰی وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۷۵/۳۲)۔ یہاں دیکھو صَدَّقَ کے مقابلہ میں کَذَّبَ آیا ہے۔ (صَدَّقَ کے معنی ہیں تصدیق کرنا، سچ کر دکھانا اور کَذَّبَ کے معنی ہیں تکذیب کرنا۔ جھٹلانا) اور صَلّٰی کے مقابلے میں تَوَلّٰى آیا ہے۔ تَوَلّٰى کے معنی ہیں گریز کی راہیں نکالنا، پھر جانا، لوٹ جانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صَلّٰی اس روش کی ضد ہے جس میں انسان کے سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے اس سے پھر جاتا ہے یا گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یہاں سے واضح ہے کہ صلّٰی کے معنی (خود قرآن کی رُو سے بھی) کسی کے پیچھے سیدھے راستے پر چلنا ہے۔ دوسرے مقام پر خود صلوٰۃ کا لفظ بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ سورۂ نور میں کائنات کی مختلف اشیاء کے اجمالی اور پرندوں کے خصوصی ذکر کے بعد کہا ہے۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ (۲۴/۴۱) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلوٰۃ کے معنی وہ نماز نہیں جو مساجد میں ادا کی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے معنی ہیں وہ فرائضِ منصبی جو ان اشیائے کائنات کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ یعنی اس قانون کا اتباع جس کے مطابق چلنے کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ (تسبیح کے معنی ہیں فرائض کی تکمیل میں پوری پوری جدوجہد کرنا)۔ یہ وجہ ہے کہ میں اقامتِ صلوٰۃ کا ترجمہ نظامِ صلوٰۃ کا قیام کرتا

نظامِ صلوٰۃ

ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہر جگہ " اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ " کا حکم دیا ہے تو اس سے مراد نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا ہے۔ نظامِ خداوندی کا قیام۔ نماز کے اجتماعات اس کے اندر آجاتے

ہیں۔ لیکن صلوٰۃ کا فریضہ ان اجتماعات تک محدود نہیں، ان سے باہر بھی ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کی عبادت مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں، زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ انسان جب اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک ہوتا ہے تو اس وقت بھی اقامتِ صلوٰۃ کر رہا ہوتا ہے اور اس سے فارغ ہو کر جب زندگی کے دوسرے معاملات میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے تو اس وقت بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی کرتا ہے۔ یہ چیز کہ صلوٰۃ کا دائرہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے خود قرآن سے واضح ہے۔ سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم نے آپ سے کہا کہ

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (۱۱/۸۸)۔

اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جن کی محکومیت (عبودیت) ہمارے آباء اختیار کرتے چلے آتے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔

اس سے ظاہر ہے کہ مال و دولت کا قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا بھی صلوٰۃ کے اندر داخل ہے۔

امید ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ صلوٰۃ سے مطلب نماز کے اجتماعات نہیں (لفظ نماز عربی زبان کا نہیں قدیم فارسی زبان کا ہے)، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اجتماعات بھی فریضۂ صلوٰۃ کے اندر داخل ہیں۔ لیکن یہ فریضہ یہیں تک ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ انسان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ جو انسان نماز کے اجتماعات میں شریک نہیں ہوتا، وہ بھی تارکِ صلوٰۃ ہے اور جو کسی معاملہ میں قانونِ خداوندی کی اطاعت نہیں کرتا وہ بھی تارکِ صلوٰۃ ہے۔ میں اس نقطہ پر زور اس لئے دیتا چلا آ رہا ہوں کہ جب ہم نماز پڑھ لیتے ہیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ سے کلیتہً فارغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا یہ چاہیئے کہ ہم اقامتِ صلوٰۃ کے صرف ایک گوشے سے فارغ ہوتے ہیں۔ یہ فریضہ مکمل طور پر اس وقت ادا ہوگا جب ہم اپنی ساری زندگی خدا کے قانون کے تابع بسر کریں گے۔ فقط نماز پڑھ لینا اور باقی زندگی خدا کے احکام کے خلاف گذارنا، ہمیں مصلّی نہیں بنا سکتا۔ مصلّی وہی ہے جو ساری زندگی خدا کے قانون کے پیچھے چلے۔ اس حقیقت کو سورۂ مریم کی ایک آیت میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا ذکر ہے جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا۔ اس کے بعد

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ

یہ ہے کہ: فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹/۵۹) یعنی ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے خیالات و خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زندگی کی دو روشیں ہیں۔ ایک روش یہ ہے کہ انسان اپنے مفاد اور خیالات کے پیچھے چلے۔ اس کے برعکس، دوسری روش یہ ہے کہ انسان، وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنے خیالات اور خواہشات کا اتباع کرنے والے صلوٰۃ کی روش کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ کے معنی ہوئے وحیٔ خداوندی کا اتباع۔ "صلوٰۃ کے ضائع" کرنے سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ صلوٰۃ کی رسمی شکل کو برقرار رکھتے ہیں لیکن اس کی اصل و غایت کو ضائع کر دیتے ہیں (تفصیل اس کی ذرا آگے جا کر سامنے آئے گی)۔ بہرحال اس سے بھی واضح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ صلوٰۃ کی حقیقت کو ضائع کرتا ہے۔

یہ تھی پہلی بات۔ دوسری بات یہ کہ جس نظام کا تعلق انسانی زندگی کی نشوونما (DEVELOPMENT) سے ہے۔ قرآن اسے خاص اہمیت دیتا ہے۔ بلکہ (اصل یہ ہے کہ) دین کا مقصود اور غایت ہی انسانی زندگی کی نشوونما ہے۔ "انسانی زندگی کی نشوونما" میں انسانی جسم (طبعی زندگی) کی نشوونما بھی داخل ہے اور انسانی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما بھی۔ انسانی ذات کی نشوونما سے مفہوم ہے ان تمام صلاحیتوں کی پوری پوری بالیدگی اور ارتقاء جو انسان کے اندر مضمر رکھی گئی ہیں۔ جو حصہ انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما سے متعلق ہے اسے معاشی نظام کہتے ہیں۔ قرآن نے بتایا یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان پوری کی پوری محنت سے کام کرے اور اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "ایتائے زکوٰۃ" کہتے ہیں۔ یعنی نشوونما دینا۔ سامانِ زیست مہیا کرنا۔ (زکوٰۃ کے معنی نشوونما یا (GROWTH) کے ہیں)۔ جیسا کہ سورۂ ہود کی اس آیت سے واضح ہے جسے (حضرت شعیبؑ کی صلوٰۃ کے ضمن میں) اوپر درج کیا گیا ہے (نظامِ صلوٰۃ کا نظامِ معاش کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے قرآن میں اقیموا الصلوٰۃ اور آتوا الزکوٰۃ بالعموم اکٹھے آتے ہیں۔

ایتائے زکوٰۃ

تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟

ان دونوں باتوں کو تمہیداً سمجھ لینے کے بعد اب آگے چلو. سورۂ ماعون میں ہے. اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ (۱/۱۰۷) "کیا تُو نے اس شخص کو بھی دیکھا (اس کی حالت پر بھی غور کیا) جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟" یہاں دین سے انکار کرنے والوں کا ذکر نہیں. دین کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے. یعنی وہ جو زبان سے دین کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اسے جھٹلاتے ہیں. تم سوچو سلیم! کہ وہ کون ہے؟ جو اس سوال کا جواب سننے کے لئے ہمہ تن توجہ نہ ہو جائے گا. اس لئے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ معلوم کرے کہ وہ کون ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ دین کی تکذیب کرتا ہے اور پھر کہتا بھی اس طرح ہے کہ یہ بات محض ذہنی یا اعتقادی نہ رہے بلکہ محسوس طور پر دیکھنے والے کے سامنے آجائے (رائیت کا اشارہ اسی طرف ہے. سوال کو ایک مرتبہ پھر سامنے لاؤ. یعنی

کیا تُو نے اس شخص کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟

اب اس کا جواب سنو. جواب یہ ہے کہ؛ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ (۳-۲/۱۰۷) یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا.

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ تمہارے ذہن میں یہ ہوگا کہ قرآن یہ کہے گا کہ دین کی تکذیب وہ کرتا ہے جو خدا کو نہیں مانتا. آخرت پر یقین نہیں رکھتا. جس کے عقائد درست نہیں (وغیرہ وغیرہ) لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا. اس نے یہ کہا ہے کہ دین کی تکذیب وہ شخص کرتا ہے جو دین پر ایمان رکھنے کے دعوے کے باوجود کرتا یہ ہے کہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ ایسا انتظام کرنے کے لئے تگ و دَو کرتا ہے.

یتیم کی عزت

جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں عربی زبان میں یتیم صرف اسی کو نہیں کہتے جس کا باپ مر چکا ہو. اس کے بنیادی معنی ہیں تنہارہ جانے والا. دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ کوئی گروہ، کوئی پارٹی، کوئی جتھہ، کوئی جماعت ہو اس کی معاشرہ میں بڑی عزت ہوتی ہے. لیکن جو تنہارہ جائے اس کی کوئی عزت نہیں کرتا. یہی نہیں کہ کوئی اس کی عزت نہیں کرتا بلکہ اسے ہر جگہ دھکے ملتے ہیں. جس معاشرہ میں ہر فرد (بجز ان کے جن کے پاس قوت واقتدار اور جتھے اور گروہ ہوں) اپنے آپ کو تنہا (یتیم) محسوس کرے قرآن کی رُو سے وہ معاشرہ جہنمی معاشرہ ہوتا ہے. ہمارے ہاں کسی طرح ہر فرد اپنے آپ کو

(بستی رستی دنیا میں) تنہا محسوس کرتا ہے اس کا علم و احساس ہم میں سے ہر ایک کو ہے. لیکن اس جہنم میں صرف ہمیں ماخوذ نہیں. یورپ اور امریکہ کی قومیں، جو ہم سے بہت آگے ہیں، اس باب میں ان کی حالت بھی ہم سے کچھ مختلف نہیں (میں نے شاید تمہیں بتایا ہے یا نہیں) اگلے دنوں امریکہ سے ایک دلچسپ کتاب شائع ہوئی تھی. وہاں کے چند نامور صحافیوں (جرنلسٹس) نے مل کر ملک کے اعداد و شمار جمع کئے اور ان کی روشنی میں بتایا کہ ان کے ہاں معاشرہ کی حالت کیا ہے. جو کچھ انہوں نے اس کتاب کی تفاصیل میں لکھا ہے اسے تو چھوڑو. انہوں نے اپنے معاشرہ کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کا اندازہ اس نام (ٹائیٹل سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اس کتاب کے لئے تجویز کیا تھا. انہوں نے اس کتاب کا نام تجویز کیا (THE LONELY CROWD) غور کرو سلیم! کہ یہ نام کس قلبی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے. میں کہوں گا کہ یہ کتاب کا نام نہیں، ایک چیخ ہے جو اپنے معاشرے کی حالت کو دیکھ کر ان لوگوں کے منہ سے بے اختیار نکل گئی ہے.... (THE LONELY CROWD)

اُف (CROWD) اور (LONELY) یعنی یہ معاشرہ نہیں بلکہ انسانوں کا ایک ایسا انبوہ یا ہجوم ہے جس میں ہر فرد، اتنے افراد کے گرد و پیش ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے. امریکہ کے ان مبصرین نے تو اس حقیقت کو اب پایا ہے. قرآن اسے بہت پہلے بیان کر چکا ہے. اس نے اس کے لئے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں (بلکہ اس سے بھی زیادہ جامع) اس نے کہا ہے کہ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص دوسروں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے. دیکھا تم نے سلیم! یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے ان مصنفین نے اپنی کتاب کے ٹائیٹل کے لئے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے.

تکذیبِ دین کرنے والوں کی قرآن نے دوسری خصوصیت یہ بتائی ہے کہ؛ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ. مسکین (سَکَنَ. سَاکِنٌ) سے ہے. اس کے معنی ہیں وہ شخص جو حرکت سے محروم ہو جائے. جس کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے. جس میں کام کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہے. جو متحرک سے

مسکین | ساکن ہو جائے. جو (IN CAPACIATED) ہو جائے. خواہ کسی وجہ سے ہو. ہمارے معاشرے میں ایسا شخص اپنی مصیبت آپ بھگتتا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتا ہے. نہ کوئی اسے پوچھتا ہے اور نہ اس کے بچوں کا پرسانِ حال ہوتا ہے. قرآن کہتا ہے کہ جس معاشرہ میں یہ کچھ ہوتا ہو اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا. دیکھو سلیم! قرآن نے سورۃ الفجر میں اس حقیقت کو کس قدر

دل نشین الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جب خدا کی راہ نمائی کی طرف سے آنکھیں بند کرلے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اُسے فراخئ رزق نصیب ہو تو اس پر اتراتا ہے لیکن جب اس پر (اس کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے) تباہی آتی ہے تو کہتا ہے۔ رَبِّیٓ اَهَانَنِ. میرے رب نے مجھے خواہ مخواہ ذلیل کر دیا۔ قرآن کہتا ہے ایسے لوگوں سے کہہ دو کہ کَلَّا. ایسا ہرگز نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں یونہی (بغیر کسی جرم اور قصور کے) ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں — سُن رکھو کہ یہ اس لئے ہوا کہ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۷-۱۸/۸۹) تم ان افراد کی جو تنہا رہ جاتے تھے، عزت نہیں کرتے تھے اور ان کے رزق کا بندوبست نہیں کرتے تھے جن کی حرکت رُک جاتی تھی۔ غور کیا تم نے سلیم! قرآن کہتا ہے کہ وہ افراد جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، قابلِ عزت اور واجب التکریم ہیں اس لئے کہ (ان کے ساتھ یہ جذبہ اور گروہ جتھہ نہ سہی) وہ فرزندانِ آدم (انسان) تو ہیں اور ہم نے ہر فردِ آدم کو (محض اس کے آدمی ہونے کی حیثیت سے) واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ قرآن نے ان لوگوں کے خلاف صرف یہی دو جُرم عائد نہیں کئے کہ وہ یتیموں کی عزت نہیں کرتے تھے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ — وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا. یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ انہیں باپ دادا کی طرف سے میراث میں مل جاتا ہے وہ سب ان کا اکیلوں کا حق ہے۔ اس لئے وہ اسے سمیٹ کر کھا جاتے ہیں۔ وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۱۹-۲۰/۸۹) اور ایسا جال بچھاتے ہیں جس سے لوگوں کا مال اِدھر اُدھر سے لڑھک کر سب ان کے ہاں جمع ہو جائے۔ یہ وجہ ہے ان کی تباہی و بربادی کی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ مسکینوں کے رزق کا بندوبست نہ کرنے والے اور خدا پر ایمان نہ لانے والے ایک ہی ہیں۔ یہ دونوں باتیں لازم و ملزم ہیں۔ جو مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتا، وہ درحقیقت خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ اہلِ جہنم کے متعلق کہتا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۙ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ (۳۳-۳۴/۶۹) وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ (عربی زبان میں واؤ کے معنی اور بھی ہوتے ہیں اور یعنی بھی۔ اس جگہ (و) کے معنی اور کئے جائیں یا یعنی۔ مفہوم وہی ہے کہ ایمان باللہ اور اطعام المسکین

ساتھ ساتھ چلتے ہیں)۔

اب پھر تم سورۂ ماعون کی طرف آؤ جہاں سے یہ بات چلی تھی۔ یعنی اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ۔ یعنی تکذیبِ دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزّت نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہے ــــ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (۴-۵/۱۰۷) سو تباہی ہے ان مصلّین (نمازیوں) کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ تم حیران ہو گئے سلیم! کہ پیچھے سے جو بات چلی آرہی تھی وہ خالص معاشی مسئلہ سے متعلق تھی۔ (یعنی مسکین کے رزق کا انتظام) اور اس کے بعد مصلّین کا ذکر آگیا اور ذکر بھی آیا (ف) کے ساتھ۔ (فویل) جس کا عربی زبان میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ...... بالفاظِ دیگر قرآن نے کہا ہے کہ تکذیبِ دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزّت نہیں کرتے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے۔ سو ان مصلّین کے لئے تباہی ہے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اس سے وہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یعنی صلوٰۃ اور معاشی نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبری اور غفلت کا نتیجہ ہے کہ انسان اسے محض پرستش کا طریق سمجھتا ہے اور معاشرتی اور معاشی نظام کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں محسوس کرتا۔ یہ ان کی بھول ہے۔ قرآن کی میزان میں حقیقی مصلّین وہ ہیں جو اپنے معاشرتی اور معاشی نظام کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں معاشرتی و معاشی نظام غیر خداوندی خطوط پر متشکّل ہوں تو ان کے مصلّین (نمازیوں) کی صلوٰۃ (نماز) صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ ایسی صلوٰۃ کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی بھول یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فقط نام ہے ان حرکات و سکنات کا جو مرئی اور محسوس (VISIBLE AND PERCEPTIBLE) ہیں جو دوسروں کو نظر آسکتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نمازی ہے۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۙ (۴-۶/۱۰۷) وہ ان ظاہری حرکات و سکنات (قیام۔ رکوع۔ سجود۔ رکعات وغیرہ) کو ادا کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ صلوٰۃ سے فارغ ہو گئے۔ حالانکہ یہ ظاہری حرکات، حقیقی صلوٰۃ کے مظاہر (SYMBOLS) ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ظاہری حرکات بھی ضروری ہیں کیونکہ حقیقت کے اظہار کا ذریعہ مجازہی ہوتا ہے۔ لیکن صلوٰۃ ان حرکات کے مجموعہ ہی کا نام

نہیں۔ صلوٰۃ کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ وہ مفہوم کیا ہے۔ اسے قرآن نے اگلی آیت میں واضح کر دیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ تم اس اگلی آیت تک پہنچو جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لے آؤ۔ یعنی

۱۔ کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو تکذیبِ دین کرتا ہے؟
۲۔ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے رزق کا اہتمام نہیں کرتا۔
۳۔ لہٰذا تباہی ہے ان مصلّین کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔
۴۔ یعنی جو اس چیز ہی کو صلوٰۃ سمجھتے ہیں جو دوسروں کو نظر آجائے۔

اور اس کے بعد ہے ا۔

وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۠ (۱۰۷/۷)

یعنی ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نماز کی حرکات و سکنات بڑی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن رزق کے جن سرچشموں کو بہتے پانی کی طرح کھلا رہنا چاہیئے تھا انہیں بند لگا لگا کر روک لیتے ہیں تاکہ وہ انہی کے لئے مخصوص ہو جائیں اور دوسرے انسان ان سے متمتع نہ ہو سکیں۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح معاش سے صلوٰۃ اور صلوٰۃ سے معاش کی طرف رجوع کرتا ہے؟ پہلے اس نے تکذیبِ دین کے سلسلہ میں یتامیٰ و مساکین کی بات چھیڑی تو اس سے مصلّین کا ذکر سامنے لے آیا۔ اس کے بعد مصلّین کی غلط روش کا ذکر کیا تو اس سے یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ کا معاشی پہلو نکل آیا۔ اس طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ صلوٰۃ اور معاش میں کس قدر گہرا تعلق ہے اور تکذیبِ دین کرنے والے وہ مصلّین ہیں جو صلوٰۃ کے رسوم و ظواہر کے پابند تو ہوتے ہیں لیکن معاشی نظام کو قوانینِ خداوندی کے تابع نہیں رکھتے۔ اسی سے تم نے یہ بھی دیکھا کہ قرآنِ کریم کی آیات کس قدر مربوط ہیں۔ لیکن یہ ربط و نظم اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے کہ انسان کے سامنے دین کا وہ مرکزی تصور (CENTRAL IDEA) ہو جسے قرآن بطور اصل الاصول کے پیش کرتا ہے۔ اس تصور کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات کس طرح اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس کا یہ مرکزی تصور سامنے نہ ہو تو پھر اس میں کوئی ربط و نظم دکھائی نہیں دیتا۔ یہ جو تم نے اکثر لوگوں سے سنا ہوگا کہ قرآن میں (معاذ اللہ) کوئی ربط نہیں تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ورنہ خدا کی کتاب اور بے ربط!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

ان حضرات سے کون کہے کہ

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن نے کن لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ تکذیبِ دین کرتے ہیں. اب یہ دیکھو کہ وہ اس مرکزی خیال کی توضیح و تشریح مختلف مقامات پر کس انداز سے کرتا ہے. قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک جگہ ایک بات کو بطور اصول بیان کرتا ہے اور پھر دوسرے مقامات پر اس کی تشریح کرتا ہے. کبھی اس کے مطابق مثالوں اور تشبیہوں سے اور کبھی اس کی ضد سے۔ (JUXTA POSITION)

اہلِ جہنم سورۂ مدثر میں ہے کہ اہلِ جنت، اہلِ جہنم سے پوچھیں گے کہ: مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (۷۴/۴۲) تمہارا وہ کونسا جرم تھا جو تمہیں جہنم میں کھینچ لایا؟ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ (۷۴/۴۳-۴۴) وہ جواب دیں گے کہ ہم "مصلّین" میں سے نہیں تھے. یعنی (اور) ہم مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے. وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (۷۴/۴۵) البتہ ہم باتیں بہت بنایا کرتے تھے. بلند آہنگ دعاوی کیا کرتے تھے. جاذبِ نگاہ پلان بنایا کرتے تھے. امید افزا اسکیمیں تیار کیا کرتے تھے.

اس کے بعد ہے:

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ (۷۴/۴۶)

اور اس طرح ہم دین کی تکذیب کیا کرتے تھے.

دیکھا تم نے سلیم! وہی صلوٰۃ (مصلّین) اور طعام المسکین کا ذکر اور وہی تکذیبِ دین! یہاں دین کے بجائے یَوْمِ الدِّین آیا ہے. یوم کے معنی ہیں زمانہ یا دور (TIME; AGE; PERIOD) یعنی وہ دور جس میں نظامِ خداوندی متشکل ہو کر سامنے آجائے. جس میں انسانی اعمال، اپنے نتائج کو محسوس پیکروں میں سامنے لے آئیں. جس میں مکافاتِ عمل کا قانون ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر نظر آنے لگ جائے. ان جہنمیوں کا کہنا یہ ہوگا کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہیں تھے جو صلوٰۃ کی حقیقت پر نگاہ رکھ کر قیامِ صلوٰۃ پر عمل پیرا ہوتے تھے اور اس طرح ایسا نظام قائم کرتے تھے جس میں مساکین کے رزق کا انتظام بحسن و خوبی ہو جائے. یوں ہم دین کے نظام کی عملاً تکذیب کیا کرتے تھے. یعنی اپنی روش سے دنیا پر یہ ثابت کر دیتے تھے کہ یہ دعویٰ کہ صلوٰۃ کے

ذریعہ ایسا نظام عمل میں آسکتا ہے جس میں معاشی مسائل کا اطمینان بخش حل مل جائے جھوٹا ہے۔ نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. سورۂ تطفیف کا تو آغاز ہی اس موضوع سے ہوتا ہے. ارشاد ہے؛ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ ان لوگوں کے لئے تباہی ہے جو معاشی معاملات میں توازن قائم نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کے حقوق و واجبات میں کمی کر دیتے ہیں. الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۸۳/۱-۳) یعنی وہ لوگ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورے ماپ سے لیتے ہیں لیکن جب دوسروں کو دیتے ہیں تو ماپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں. تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے سرمایہ دار طبقہ کی روش اور ذہنیت کو کیسے جامع انداز میں بیان کیا ہے؛ عمل تو پرانے زمانے کے پیمانوں اور ترازوؤں کے ذریعے ہو یا دورِ حاضرہ کی اقتصادی اسکیموں کے ذریعہ، ذہنیت ہر جگہ وہی کارفرما ہے. اس کے بعد چند آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا. اور پھر وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۸۳/۱۰). اس دور میں (يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۳/۶) جب تمام نوعِ انسانی خدا کی عالمگیر ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی) ان مکذبین (تکذیب کرنے والوں) کے لئے تباہی ہوگی. الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (۸۳/۱۱) یعنی ان لوگوں کے لئے جو یوم الدین کی تکذیب کرتے تھے.

ناپ تول پورا نہ کرنے والے

دیکھا تم نے سلیم! یہاں بھی مکذبین انہیں کہا گیا ہے جو معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے.

تصدیقِ دین

یہ تو ہوا تکذیبِ دین کا بیان. اب یہ دیکھو کہ وہ اس کے مقابلہ میں "تصدیقِ دین" کو سامنے لا کر کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے. یعنی اس نے اوپر یہ بتایا تھا کہ تکذیبِ دین کون کرتا ہے اور اب یہ بتائے گا کہ تصدیقِ دین کون کرتا ہے. ذرا غور سے سنو کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے. سورۂ معارج میں ہے کہ: تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ (۷۰/۱۷) جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے. کسے بلاتی ہے؟ ______ اسے جو سیدھے راستہ سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے. یہ تو اصولی بات ہوئی. اس کے بعد اس اصول کی تشریح سامنے آتی ہے. وَجَمَعَ فَاَوْعٰى یہ وہ ہے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے. دوسری جگہ ہے. جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ (۱۰۴/۲) جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا

ہے کہ کتنا ہو گیا اور اس میں کتنا اور ڈالا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی بات نہیں ہے۔ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کے پیچھے نہ چلے تو اس کی حالت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت بے صبرا اور حریص ہو جاتا ہے اس کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ (اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ (۷۰/۱۹)۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ (۷۰/۲۰-۲۱) جب اس پر مصیبت آتی ہے تو واویلا مچانے لگ جاتا ہے اور جب اسے مال و دولت مل جاتا ہے تو اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ جس طرح اسے تنگدستی کے زمانے میں مال کی ضرورت تھی اسی طرح اس مال کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو اس وقت تنگدست ہیں (یہ وہی کیفیت ہے جسے سورۂ ماعون میں، وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت سے صرف مصلّین بچ سکتے ہیں۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ (۷۰/۲۲-۲۳) وہ مصلّین جو صلوٰۃ کی مداومت کرتے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر لیا اور کسی میں اس کے خلاف چل پڑے۔ یا کبھی ان کا اتباع کر لیا اور کبھی ان سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں۔ مصلّین وہ ہیں جو اس صحیح روش کو اختیار کر کے استقامت اور استقلال سے اس پر جمے رہتے ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ ابتداء میں بات خالص معاشی مسئلہ کے متعلق ہو رہی تھی (کہ انسان کی عام ذہنیت یہ ہے کہ وہ مال و دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے اور اس سے اس کا جی ہی نہیں بھرتا) اور اس کے بعد فوراً مصلّین کا ذکر آ گیا۔ اس سے پھر یہ واضح ہو گیا کہ قرآنی نظام میں معاش اور صلوٰۃ کا کس قدر گہرا تعلق ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ مصلّین کے بعد خدا کیا کہتا ہے — وہ کہتا ہے ؛ وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴) یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق ہے اور حق بھی مبہم نہیں بلکہ واضح اور معلوم۔ سائل اسے کہتے ہیں جس کی ضروریات کے پورا ہونے میں کمی رہ جاتے اور محروم اسے کہتے ہیں جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے بالکل قابل نہ ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ دولت مند محتاجوں، مفلسوں کو خیرات کے طور پر کچھ دے دیں۔ بالکل نہیں۔ خیرات پر زندگی بسر کرنا انسان کی انتہائی ذلت ہے اور احترامِ آدمیت کے منافی۔ قرآن گداگروں کی جماعت نہیں پیدا کرتا۔ اس لئے اس نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے نظام میں ہر محتاج و محروم اپنے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشوونما

بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل کرتا ہے۔ یہ نہ خیرات ہے، نہ کسی کا ان پر احسان۔ اسی لئے قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جن کے پاس فاضلہ دولت ہے وہ اسے اپنے زیردستوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے؟ (فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۱۶/۷۱) یعنی یہ فاضلہ دولت درحقیقت ان کا حق ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے انہیں اس کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان آیات کا ترجمہ ایک بار پھر سامنے لے آؤ جو اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی

جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جو یا تو سیدھے راستے سے مُنہ پھیر کر چل دیتا ہے اور یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

یعنی اس شخص کو جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے کس کر باندھ رکھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ انسان جب اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلتا ہے تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ واویلا مچاتا ہے اور جب مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو اسے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے۔

لیکن اس ذہنیت سے مصلین بچے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی صلٰوۃ پر مداومت سے قائم رہتے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں محتاجوں اور محروموں کا حق معلوم ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد ہے:-

وَ الَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۰/۲۶)

یہ وہ لوگ ہیں جو یوم الدّین کی تصدیق کرتے ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کس طرح تصریفِ آیات (آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے اپنی مرکزی تعلیم کی وضاحت کرتا ہے۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ دین کی تکذیب کون کرتے ہیں اور اب بتایا کہ اس کی تصدیق کون کرتے ہیں۔ اس تفصیل کو اس نے سورۃ القیامۃ کی دو مختصر سی آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے (جو پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں اور) جن میں کہا گیا ہے کہ دردناک عذاب میں مبتلا وہ ہوتا ہے جو

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ۝ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ۝ (۷۵/۳۲-۳۱)

جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ قانونِ خداوندی کے پیچھے چلتا ہے۔ بلکہ وہ تکذیب کرتا ہے اور اس راستے

سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ "تکذیب کرنے والے اور گریز کی راہیں نکالنے والے" کے لئے قرآن نے فرعون کو بطورِ مثال پیش کیا ہے جس کے عہد میں ملوکیت (فرعونؔ) پیشوائیت (ہامانؔ) اور سرمایہ داری (قارونؔ) بیک وقت جمع تھیں۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰیO (۲۰/۴۸) ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر ہوتا ہے جو تکذیب کرتا اور گریز کی راہیں نکالتا ہے اور اس طرح زندگی کی صحیح روش سے پھر جاتا ہے۔

سورۂ لیل میں تکذیب و تصدیق کے تقابل کو ایک اور انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰیؕ (۹۲/۴) یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں مختلف لوگوں کی تگ و تاز کا رُخ مختلف سمتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام سمتوں کو سمٹایا جائے تو یہ اصولی طور پر دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گی۔

دینے والے

یہ دو سمتیں اور ان کے نتائج یہ ہیں۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰیۙ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰیۙO (۹۲/۶-۵) سو جو شخص دوسروں کو دے گا اور تقویٰ شعار بن جائے گا اور اس طرح ہمواریاں پیدا کرنے والے کی تصدیق کرے گا۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (۹۲/۷) تو ہم اس پر فراخیوں کی راہ آسان کر دیں گے۔

اس کے برعکس

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰیۙ وَ کَذَّبَ بِالْحُسْنٰیۙ (۹۲/۹-۸) جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لے گا اور اپنے آپ کو معاشرے سے مستغنی سمجھ لے گا۔ یعنی یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس اس قدر مال و دولت ہے اس لئے مجھے دوسروں کی کیا محتاجی ہے۔ میں ان کی کیا پرواہ کرتا ہوں، اور اس طرح ہمواریاں پیدا کرنے والے دین کی تکذیب کرے گا۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیؕ (۹۲/۱۰) تو ہم اس پر تنگدستی کے راستے کشادہ کر دیں گے۔

وَ مَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰیO (۹۲/۱۱) اور جب اس کی تباہی کا وقت آئے گا تو اس کا مال و دولت اس کے کسی کام نہ آسکے گا۔ یہ اُسے اس تباہی سے کبھی نہیں بچا سکے گا جو اس کی سرمایہ دارانہ روش کا لازمی نتیجہ ہے۔

وہ اس روش کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اپنے مال و دولت کے معاملہ میں اپنی مرضی اور اپنے فیصلوں کے مطابق ہی چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس باب میں انسان کو وحیٔ خداوندی

کے تابع چلنا چاہیئے۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۹۲/۱۲) راہ نمائی دینا ہمارا کام ہے اس لئے کہ انسان ہمیشہ اپنی ذاتی مصلحت اور پیش پا افتادہ مفاد ہی کو سامنے رکھتا ہے اور مستقبل پر اس کی نگاہیں نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس

وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى (۹۲/۱۳) ہمارے سامنے حال بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی. ہمارے پیشِ نظر اس کی طبعی زندگی کی نشو ونما بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی بالیدگی بھی. انسان کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور ہمارے سامنے پوری نوعِ انسانی کا مفادِ کُلّی۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

جو شخص (یا نظام) مفادِ خویش ہی کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۹۲/۱۴) سو میں تمہیں اس شعلہ انگیز آتشِ سوزاں سے متنبہ کرتا ہوں جو سب کچھ تباہ کرکے رکھ دیا کرتی ہے۔

لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِىْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۱۵-۹۲/۱۶) اس میں صرف وہی داخل ہوتا ہے جو شقی ہوتا ہے. یعنی وہ جو تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ اس کے برعکس؛

متّقی کون ہے؟

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (۹۲/۱۷) اس سے اُسے محفوظ رکھا جاتا ہے جو متقی ہو. اب سوال پیدا ہوا کہ متقی کسے کہتے ہیں. اس کا جواب اگلی آیت میں دے دیا.

اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) یعنی وہ جو اس لئے مال دیتا ہے کہ اس سے (اس کی اپنی ذات کی اور دیگر افرادِ انسانیہ کی) نشو ونما ہو سکے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات سے دیگر امور کے علاوہ متقی کا مفہوم بھی کس طرح واضح ہو گیا یعنی متقی بھی وہ ہے جو اپنا مال دوسروں کی نشو ونما کے لئے دیتا ہے اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی نشو ونما ہو جاتی ہے. یہاں بھی دیکھو کہ تقوے اور معاشی معاملات کا کس قدر گہرا تعلق ہے. جو لوگ

تقویٰ اور "تزکیۂ نفس" کا کچھ اور مفہوم سمجھتے ہیں اور ان کا تعلق "روحانیت" (یعنی ان کی مصطلحہ روحانیت) سے قرار دیتے ہیں، ان کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا۔ فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ع (۵۳/۳۲) تم اپنی ذات کی نشوونما (تزکیہ) کا فیصلہ خود ہی (اپنے معیاروں کے مطابق) نہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ اسے بہترین طور پر خدا ہی جانتا ہے اور وہی بتا سکتا ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ متقی اسے کہتے ہیں۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ۚ (۹۲/۱۸) جو اپنا مال دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے اور اس طرح اس کی ذات کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے۔ اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰى ۙ (۵۳/۳۳) کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یعنی وہ شخص

وَ اَعْطٰى قَلِیْلًا وَّ اَكْدٰى ۝ (۵۳/۳۴) جو مرتا بھرتا کچھ دیتا بھی ہے تو بہت تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

متقی کون نہیں؟

سورۂ لیل میں تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن نے اَلْتَقٰی (متقی کے مقابلہ میں اشقی (شقی) کو پیش کیا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ جہنم کے تباہ کن عذاب میں مبتلا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ شقاوت کسے کہتے ہیں۔ قرآن نے سورۂ طٰہٰ میں بڑے واضح الفاظ میں اس کی تشریح کی ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ (۲۰/۲) ہم نے قرآن کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو شقاوت میں مبتلا ہو جائے۔ شقاوت کے معنی ہیں سعادتوں سے محروم رہ جانا۔ جگر پاش مشقتوں میں مبتلا ہو جانا۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے گی وہ کبھی زندگی کی سعادتوں سے محروم نہیں رہے گی اور اسے جگر سوز مشقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی سعادتیں کیا ہیں اور جگر پاش مشقتیں کسے کہتے ہیں۔ اس کی تشریح آگے چل کر قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں اس طرح کر دی کہ آدم جنت میں تھا جہاں اس کی زندگی اس نہج سے گذر رہی تھی کہ اسے نہ بھوک کا خوف تھا نہ پیاس کا۔ نہ لباس کی فکر تھی نہ مکان کی۔ یہ سب ضروریات زندگی نہایت آسانی سے اور بافراط (رَغَدًا) پوری ہوتی چلی جاتی تھیں۔ (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝ (۱۱۸-۱۱۹/۲۰)۔ اس کے بعد ہے کہ ہم نے آدم سے کہہ دیا کہ دیکھنا! تم کہیں اس راستے کو چھوڑ کر ابلیس کی راہ اختیار نہ کر لینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہیں اس جنت سے نکال دے گا۔ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ...

(۲۰/۱۱۷) تو اس سے کیا ہوگا۔ فَتَشْقٰى ○ (۲۰/۱۱۷) تو اس کا نتیجہ شقاوت ہوگا۔ یعنی تُو ان تمام چیزوں سے محروم ہوجائے گا جو تمہیں اس وقت فراوانی سے حاصل ہیں اور ان کے حصول کے لئے تمہیں جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔

اس کے بعد ہے آدم ابلیس کے فریب میں آگیا اور اس طرح اس زندگی آسائشوں سے محروم ہوگیا۔ اس سے آدم سخت مایوس اور افسردہ خاطر ہوگیا۔ اس نے خدا سے کہا کہ کیا اب اس کے لئے اس پہلی (جنتی) زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں؟ جواب ملا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تمام فراوانیاں اور آسائشیں تمہیں پھر سے حاصل ہوسکتی ہیں بشرطیکہ تم (اپنے خیالات کا اتباع چھوڑ کر) ہماری راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ○ (۲۰/۱۲۳) نہ تیری محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی تو شقاوت میں پڑے گا۔ اس کے برعکس، وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا.... (۲۰/۱۲۴) جو شخص ہمارے ضابطۂ قوانین سے پہلوتہی کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہوجائے گی۔ اور صرف یہی نہیں کہ اس کی یہاں کی روزی تنگ ہوجائے گی بلکہ وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ○ (۲۰/۱۲۴) اسے ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اتقٰی کے مقابلہ میں جو اشقٰی آیا ہے اس میں اشقٰی کے معنی کیا ہیں! یعنی وہ جو زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو اور اس کے لئے اسے جگر سوز مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ لہٰذا متقی وہ ہے جسے زندگی کی تمام ضروریات اور سعادتیں بافراط میسر ہوں اور وہ اپنی محنت کی کمائی کو دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے صلٰوۃ اور معاشی معاملات میں کتنا گہرا تعلق ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ صلٰوۃ صرف اس نماز تک ہی محدود نہیں جو مسجد کی چار دیواری کے اندر ادا کی جاتی ہے بلکہ اس کا دائرہ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ صلٰوۃ اس نظام کا نام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے چلتے ہیں اور اس کے وقتی اجتماعات اس نظام کا ایک حصہ ہیں۔ اس سے

فحشا و مُنکر

تمہاری سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ط (۲۹/۴۵) "صلٰوۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے"۔

تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ فحشاء کے معنی ہیں بخل اور منکر کے معنی ہیں عقل فریب کار کی حیلہ تراشیاں جن کی رُو سے انسان سب کچھ اپنے لئے ہی سمیٹ کر رکھ لینا چاہتا ہے۔ اس ذہنیت اور اس روش سے انسان صرف نظامِ صلوٰۃ کی رُو سے رُک سکتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت سورۂ معارج کی ان آیات ہی کی تفسیر ہے جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ

> اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ (۷۰/۲۳-۱۹)

اور انہی تصریحات سے یہ حقیقت بھی تمہارے سامنے آگئی کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ دین کی تکذیب وہ کرتا ہے جو (سورۂ ماعون کے الفاظ میں)۔

> یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کا بندوبست نہیں کرتا۔ سو ایسے مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو نماز کے ظاہر ارکان و اجزاء ہی کو حقیقی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور عملاً ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ رزق کے ان سرچشموں کو جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں اپنے لئے روک رکھتے ہیں۔

یوم الدّین

ممکن ہے بعض لوگ اس پر اصرار کریں کہ آیت (۷۰/۲۶) میں جو پہلے گذر چکی ہے ——— "یوم الدین" کا ترجمہ "جزا و سزا کا دن" ہی کرنا چاہیئے۔ لیکن جو حقیقت پچھلے صفحات میں سامنے آچکی ہے اس کی رُو سے اس ترجمہ سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "جزا و سزا کا دن" کے معنی ہوں گے "جب خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ہر انسانی عمل، ہر روشِ زندگی ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارا کی متعین کردہ روش کا نتیجہ زندگی کی آسودگیاں اور خوشحالیاں ہیں۔ اس کے خلاف چلنے کا انجام تباہی اور بربادی ہے۔ جو شخص ذاتی مفاد پرستی کی روش اختیار کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نہیں ہوگا، وہ خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ عملاً یہ کہتا ہے کہ نہیں! یہ غلط ہے کہ اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ ہے وہ شخص جو تکذیبِ دین یا تکذیبِ یوم الدین کرتا ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے

کہ جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی. جو اس قسم کا معاشی نظام قائم کرے گی اسے استحکام اور بقا نصیب نہیں ہوگی. وہ مٹ جائے گی اور اس کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کا تصورِ حیات اس کی پہلی قوم سے مختلف ہوگا اور وہ ان جیسا معاشی نظام قائم نہیں کرے گی. سورۂ محمد میں ہے. هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ تم وہ ہو کہ تمہیں اس کی دعوت دی جاتی ہے کہ تم اپنے مال و دولت کو انسانی فلاح و بہبود کے کھلا رکھو. فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ؕ سو تم میں سے وہ لوگ ہیں جو اس روش کو اختیار کرنے کی بجائے بخل کی روش اختیار کر لیتے ہیں جس میں انسان سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر دوسروں کو اس سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ جو دوسروں کو محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشو و نما سے محروم رکھتا ہے. اِس سے خود اس کا نقصان ہوتا ہے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا. اس لئے کہ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ؕ اللہ کسی کا محتاج نہیں اور تم اپنی نشو و نما کے لئے اس کے محتاج ہو. یاد رکھو. وَاِنْ تَتَوَلَّوْا اگر تم سیدھے راستے سے پھر گئے اور اس سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸) اس کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی. یہ خدا کا اٹل قانون ہے اور جو سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، سرمایہ داری کا نظام قائم و دائم رہ سکتا ہے اور اس غلط روش کے نتائج و عواقب کو نمازیں پڑھنے سے روکا جا سکتا ہے وہ تکذیبِ دِین کرتا ہے. وہ خدا کے قانونِ مکافات کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے. خدا نے قوموں کے عروج و زوال اور بقا اور فنا کے لئے جو قانون مقرر کر رکھا ہے وہ کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہو سکتا.

ستمبر ۱۹۵۶ء

والسلام

پرویز

(پرویز صاحب کا یہ خط ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا. اس کے بعد انہوں نے صلوٰۃ، زکوٰۃ، معاشی نظام، تکذیب و تصدیقِ دین کے موضوعات پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے. جو حضرات ان موضوعات کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں، وہ (کم از کم) ان کی تفسیرِ قرآن کے سلسلۂ زریں (مطالب الفرقان) کا مطالعہ فرمائیں جس کی اس وقت تک سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں. ہم اس مقام پر صرف اتنی مزید وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ (جیسا کہ پرویز صاحب نے کہا ہے) قرآنِ کریم نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو تکذیبِ

دین کرتے ہیں. یعنی جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کرتے بلکہ مسلمان کہلاتے ہوئے ایسی روش اختیار کرتے ہیں جس سے غیر مسلم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلام کے یہ دعادی کہ وہ نوعِ انسان کی جملہ مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے' غلط ہے. اگر اس کا یہ دعویٰ سچا ہوتا تو ان لوگوں کی حالت ایسی کیوں ہوتی جو اسلام کے مدعی ہیں.

پھر اس نے کہا ہے کہ جو لوگ گریز کی راہیں نکالتے ہیں ان کی جگہ خدا دوسری قوم لے آئے گا. "گریز کی راہیں" تراشنے سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کی راہ سے انکار نہیں کرتے بلکہ ایسی روش اختیار کرتے ہیں جس سے بظاہر ایسا نظر آتے کہ وہ اسلام کا مقصد پورا کر رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اس راہ سے اعراض برت رہے ہیں.

خدا نے کہا ہے کہ وہ اس قسم کی روش اختیار کرنے والی قوم کی جگہ' دوسری قوم لے آئے گا جو ان جیسی نہیں ہو گی.

ہم اربابِ بصیرت سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ غور کریں کہ کیا خدا کی اس وعید کا اطلاق ہم ہی پر تو نہیں ہوتا؟

تیرہواں خط

کیریکٹر کیسے پیدا ہو؟

سلیم! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تمہارے ذہن پر غالب چھا رہا ہے۔ تمہارے اس اندازِ نگارش نے مجھے بھی ان بھولی بسری وادیوں کی یاد پھر سے تازہ کرادی۔ ہر چند ہمارے شعراء کے ہاں حقائق سے زیادہ لطائف ہوتے ہیں لیکن ان میں غالب اپنی شانِ انفرادیت لئے بالکل الگ نظر آتا ہے۔ جس شعر کے متعلق تم نے پوچھا ہے، وہ یوں ہے۔ ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غور کرو کہ مرزا کیا کہہ گیا ہے اور کس انداز سے کہہ گیا ہے؟ سچ کہا تھا اس نے کہ ؎

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے
ایں ہاسخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

اس باب میں میری کیا پوچھتے ہو۔ ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

ہٹاؤ ان قصّوں کو اور اپنے خط کا جواب سنو۔

سلیم! مجھے تمہاری بیتابیٔ تمنا کا احساس ہے۔ لیکن تم بھی ذرا صبر طلبیٔ عشق پر نگاہ رکھا کرو۔ میں جانتا

ہوں کہ تمہاری کیفیت اب یہ ہو چکی ہے کہ

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے

لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

جب تک افکار میں پختگی نہ آجائے، مقامِ دعوت و عزیمت کا قصد یا آرزو، خیالِ خام ہی نہیں بلکہ حیات نمائی اور ہلاکت فروشی ہے۔ اور پختگیٔ افکار نا ممکن ہے جب تک فکر کی ہر نشید اس سرچشمۂ علم ویقین سے ہم آہنگ و یک رنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغازِ سخن لَا رَیْبَ فِیْہِ کے زلزلہ انگیز و کوہ تمثال دعوئ حقیقت کشا سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا تم نے نام لیا ہے ان کی تحریروں کا مسلسل مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ ان میں کس قدر تضاد اور کیسا تخالف ہے۔ اس لئے کہ ان کا نقطۂ پرکار، فکر، علمِ خداوندی نہیں بلکہ اپنے امیال و عواطف یا وراثتی نقوش و خطوط ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو اپنی مصلحت کوشیوں کے پیشِ نظر، دیدہ و دانستہ ساحرین کی رسیوں کو موسیٰ (علیہ السلام) کا اژدھا بنا کر دکھاتے ہیں تاکہ ان شعبدہ بازیوں اور فسوں سازیوں سے عوام کی نگاہوں میں مقدس بن جائیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس موجِ سراب کو سچ مچ چشمۂ حیواں سمجھ کر خود بھی فریبِ نفس میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس داستان گوئی سے آسودۂ خواب رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن طائفۂ اول ہو یا گروہِ ثانی، ملت کے حق میں دونوں زہرِ ہلاہل ہیں۔ اسی فریب خوردگی کا نتیجہ ہے کہ وہی مسلمان جس کی بزمِ حیات کا کبھی یہ عالم تھا کہ

لشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب

اب اس کی ہر محفل میں یہ کیفیت ہے کہ

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال

تمہارے استفسار کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اُس سوال کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی رُو سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈا؟ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو تو مرغی اور انڈے کے اس پریشان کن دائرے سے نکل جانا مشکل نہ ہوگا۔ تم کہتے ہو کہ اسلامی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں چل سکتا ہے جن میں کیریکٹر ہو اور کیریکٹر والے لوگ آج موجود نہیں۔ انہیں اسلامی نظام ہی پیدا کرے گا۔ اس لئے آغازِ کار کس

طرح کیا جائے؟

پہلے یہ دیکھو کہ کیریکٹر سے مراد کیا ہے؟ کیریکٹر ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے جس کے متعدد گوشے ہیں۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی نظامِ مملکت کے لئے جس کیریکٹر کی ضرورت ہے وہ آج ناپید ہے تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں خود غرضی اور بددیانتی اس قدر عام ہے کہ متاعِ ملت کسی کی امانت میں نہیں دی جا سکتی۔

اب سوچئے کہ خود غرضی سے مفہوم کیا ہے اور یہ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ مفادِ کُلّی کو انفرادی مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ قومی زندگی میں اسی کا نام فقدانِ کیریکٹر (CHARACTERESSNESS) ہے۔ پھر سنیئے! عدمِ کیریکٹر سے مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کی فکر کرتا ہے اور مفادِ کُلّی کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا۔ (اس فقرہ کے ایک ایک لفظ کو سلیم! الگ الگ دہراؤ۔ پھر بات ذہن نشین ہو سکے گی)۔

اب دیکھئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تم جانتے ہو کہ حفاظتِ خویش (PRESERVATION OF SELF) جبلّت (INSTINCT) کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو بروئے کار لانے کے لئے عقل، سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ لہٰذا عقل کا فریضہ ہی یہ ہے کہ یہ اس فرد کی حفاظت کرے جس کی یہ عقل ہے۔ اور چونکہ عقل ہر فرد کی الگ الگ ہوتی ہے اس لئے ہر عقل کا فریضہ "اپنے فرد" کا تحفظ ہے۔ اسی کا نام انفرادیت ہے اور اسی وجہ سے خود غرضی (SELFISHNESS) ہر انفرادی عقل کا تقاضا ہے۔ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) یہ جبلّت (INSTINCT) کا تقاضا ہے اس لئے انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے۔ ہر حیوان اپنی حفاظت کے لئے چارہ جوئی کرتا ہے۔ ایک خوردبینی جرثومہ سے لے کر عظیم الجثہ ہاتھی تک، ہر ذی حیات بقائے خویش کی فکر میں مضطرب اور رہتا ہے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حیوانات اور انسان میں ایک نمایاں فرق ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا، تم نے اپنے ہاں گائے کو دیکھا ہوگا۔ جب وہ بھوکی ہو اور اس کے سامنے چارہ ڈال دیا جائے تو وہ دوسری گائے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ لیکن جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکتی ہے تو نہایت اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جاتی ہے اور اس کی پرواہ تک نہیں کرتی کہ باقی ماندہ چارہ محفوظ رکھا ہے یا نہیں۔ یعنی اسے اپنی موجودہ بھوک کی فکر ہوتی ہے، مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حیوانات۔ چیونٹیاں، مکوڑے، وغیرہ مستقبل کے لئے بھی ذخیرہ جمع کرتے ہیں، لیکن ان کا عمل اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں۔ یعنی

ان کی اجتماعی جبلّت اس قسم کی واقع ہوئی ہے' انفرادی عقل نہیں. لیکن انسانی عقل' حال کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کی طمانیت کے بھی درپے رہتی ہے.

سلیم! ذرا سوچو کہ انسان کو "مستقبل کی فکر" کیوں پیدا ہوتی ہے؟ تم بادنیٰ تعمق اس نتیجہ تک پہنچ سکو گے کہ اس فکر اور پریشانی کا محرک جذبۂ احتیاج کا خوف ہے. یعنی ہر فرد کو خوف دامنگیر رہتا ہے کہ اگر میرے پاس کل کے لئے کچھ نہ ہوا تو میں کیا کروں گا. اس خوف کی وجہ سے ہر فرد کی عقل اُسے اکساتی ہے کہ وہ کل کی فکر بھی آج ہی کرلے. اور چونکہ انسانی زندگی کا کل (FUTURE) غیر متعین ہے (کیونکہ کسی کو موت کے وقت کا علم نہیں) اس لئے ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے تاکہ وہ کل کی احتیاج سے مامون ہوجائے. یہ ہے وہ جذبہ' جس کے تحت ہر فرد اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتا ہے. اسی کا نام خود غرضی ہے. جب ہر فرد اپنی اپنی فکر میں پریشان ہو تو جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب پولیس کسی مجمع پر لاٹھی چارج کرتی ہے تو ہر شخص اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگ اٹھتا ہے اور اس افراتفری (نفسا نفسی) میں ہوتا یہ ہے کہ جو شخص کہیں گر گیا' کچلا گیا. اسے بھگدڑ مچنا کہتے ہیں. مجھے یاد آگیا. تم نے خود ہی تو سنایا تھا کہ جب میونسپل ہال سے جلسہ میں پٹاخے کی آواز آئی تھی تو لوگ کس طرح اپنی اپنی جان کی فکر میں بدحواس ہوکر بھاگ اُٹھے تھے اور اس بھگدڑ میں کتنے لوگ پاؤں تلے روندے گئے تھے. خود لاہور کی شاہی مسجد میں کتنے لوگ عید کی نماز کے "ہجومِ مومنین[1]" میں پس کر مر گئے تھے. جس طرح ایسے مجمعوں میں بھگدڑ مچتی ہے' اسی طرح جب کسی معاشرے میں ہر فرد اپنی اپنی حفاظت کی فکر میں مصروف تگ وتاز ہوجائے' تو اس معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس میں اس طرح کھلبلی مچ جاتی ہے کہ جو کمزور نیچے گرتا ہے' وہ کچلا جاتا ہے. یہ ہے وہ معاشرہ جس میں کہا جاتا ہے کہ لوگوں کا کیریکٹر نہیں رہا_ ہر شخص دوسروں کو لوٹنے کی فکر میں ہے.

اب سمجھ لیا تم نے سلیم! کہ کیریکٹر کے فقدان کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی علت کیا ہے؟ کیریکٹر کی کمزوری کے معنی ہیں خود غرضی' اور خود غرضی کا محرک جذبہ ہوتا ہے' احتیاج کا خوف. یعنی یہ اندیشہ کہ اگر میرے پاس کچھ نہ رہا تو کل میرا یا میری اولاد کا کیا حشر ہوگا؟ اس میں شبہ نہیں کہ کیریکٹر کی کمزوری کے بعض اور پہلو بھی ہوتے ہیں. مثلاً ہوسِ اقتدار وغیرہ. لیکن اگر تم غور سے دیکھو گے تو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی حیثیت ثانوی ہے' بنیادی

---

[1] عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین (اقبالؒ)

چیز وہی "احتیاج کا خوف" ہے۔ ہوسِ اقتدار بھی غیر شعوری طور پر اسی خوفِ احتیاج کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ یعنی انسان احتیاج سے مامون ہونے کے لئے اِدھر اُدھر سے سمیٹنے کی فکر کرتا ہے اور پھر اس سمیٹے ہوئے کی حفاظت کے لئے اقتدار کے قلعے بناتا ہے۔ اس میں استثناء ان نفسیاتی مریضوں (PSYCHOLOGYICAL CASES) کی ہے جو اپنی انانیت کی تسکین کے لئے اقتدار چاہتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی صورت ہے۔ عمومی شکل وہی ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ سو وہ علّتِ اولیٰ جو انسانی معاشرے میں بھگدڑ مچا دیتی ہے ہر فرد کے دل میں احتیاج کے خوف سے مصئونیت (SECURITY) کی فکر ہوتی ہے۔ اور جس طرح ہر بھگدڑ میں، ہر فرد اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرتا ہے اور اس فکر میں اس قدر بدحواس ہو جاتا ہے کہ اتنا بھی خیال نہیں کرتا کہ جو گر پڑا ہے اسے روند کر تو آگے نہ بڑھے، اسی طرح معاشرے کی اس توازن شکن بھگدڑ میں ہر فرد اپنے مفاد کے تحفّظ میں مضطرب اور پریشان رہتا ہے۔ کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔ یہی کچھ افراد سے آگے بڑھ کر اقوام میں ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر فرد کی طرح ہر قوم اپنے مفاد کی فکر میں رہتی ہے۔ دوسری قوم کے مفاد کا کوئی خیال نہیں کرتی۔

لیجئے سلیم! مرض کی تشخیص تو ہو گئی۔ یعنی:۔

(۱) تحفّظِ خویش، جبلّی تقاضا ہے جس کے لئے ہر فرد کی عقل، سامان و ذرائع فراہم کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔

(۲) عقل اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں ہر وقت اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح فردِ متعلّقہ کی حفاظت کا سامان بہم پہنچ جائے۔

(۳) انسان، عام حیوانات کی طرح، اپنی وقتی حفاظت پر ہی قانع نہیں ہو جاتا بلکہ مستقبل کی حفاظت بھی چاہتا ہے۔

(۴) اس حفاظت کے لئے اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر میں کل کو محتاج ہو گیا تو میرا یا میری اولاد کا کیا بنے گا؟

(۵) احتیاج کی یہ فکر اسے ہر وقت مضطرب و پریشان رکھتی ہے اور اس طرح ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے اور اس دوڑ میں دوسروں کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔

(۶) اسی کا نام خود غرضی اور کیریکٹر کا فقدان ہے۔

اب آؤ اس کے علاج کی طرف!۔

علّتِ مرض ہے احتیاج کا خوف۔ لہٰذا، مرض کا علاج ہو گا اس خوف کا دل سے نکال دینا۔ سوال

یہ ہے کہ یہ خوف دل سے نکالا کس طرح جا سکتا ہے؟

اگر ہر فرد کو اس امر کا پورا پورا یقین ہو جائے کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہ سکتی. اس کو کوئی احتیاج ستا نہیں سکتی. وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا. اس کی اولاد کسی حالت میں بے کس، دبے بس نہیں رہ سکتی. یعنی اسے اس امر کا یقین ہو کہ اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان موجود ہے' تو اس کے دل سے احتیاج کا خوف نکل جائے گا. تمہیں معلوم ہے کہ جس شخص نے زندگی کا بیمہ کرا رکھا ہو' وہ کس قدر مطمئن ہوتا ہے. یزدانی کو دیکھو' جس دن سے اس نے زندگی کا بیمہ کرایا ہے' اس کی اعصابی کمزوریاں کس طرح رفع ہوتی چلی جا رہی ہیں؟ زندگی کا بیمہ تو ایک طرف' جس دن سے ملک سرفراز نے دکان کا بیمہ کرایا ہے' گھوڑے بیچ کر سوتا ہے. ورنہ اس سے پہلے چار میل پر فائر بریگیڈ کی گھنٹی اس کے ہوش و حواس گم کر دیا کرتی تھی. لہٰذا کسی فرد کے دل سے فکرِ احتیاج نکل جائے تو اس میں خود غرضی نہیں رہتی اور جب خود غرضی نہ رہے تو خود بخود کیریکٹر پیدا ہو جاتا ہے.

لیکن وہ یقین کس طرح سے پیدا کیا جائے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے؟ یعنی ہر فرد کے دل میں اس امر کا یقین کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہ سکتی وہ اور اس کی اولاد کبھی بھوکی نہیں مر سکتی.

یہ پیدا ہو گا اللہ پر ایمان لانے سے' اُسے رازق ماننے سے' اس پر توکل کرنے سے. اس امر پر یقین رکھنے سے کہ ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے سر لے رکھی ہے.

میں یہ لکھ رہا ہوں اور تمہاری اس ہنسی کی آواز گوشِ تصور سے سُن رہا ہوں جو ان فقروں سے بےساختہ تمہارے لب پر آ جائے گی. میں خود تمہاری اس ہنسی میں شریک ہوں.

تم کہو گے کہ میں کیسی پہیلیاں کہہ رہا ہوں. یعنی ایک طرف تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ یقین پیدا ہو گا اللہ کی رزاقیت پر ایمان سے. اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ باتیں ایسی ہیں جن سے بےساختہ ہنسی آ جاتی ہے. لیکن یہ پہیلیاں نہیں. ذرا سمجھنے کی کوشش کرو تو بات بالکل صاف ہے. ان الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو ہمارے مروجہ مذہب نے تمہارے ذہن میں مرتسم کر رکھا ہے. وہ مفہوم فی الواقعہ ایسا ہے جس سے بیساختہ ہنسی آ جاتی ہے. لیکن ان ہی الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو خود ان الفاظ کے "مصنف" نے متعین کیا ہے. وہ مفہوم واقعی وہ یقین پیدا کر سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے. "مذہب" نے جس خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی انسان کے رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا. اس کے رازق ہونے کے دعوٰ

کے باوجود، اس کی خدائی میں کروڑوں بندے بھوکے سوتے اور لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں اس کے بلند آہنگ اعلان کے باوجود کہ وَ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (۱۱/۶) "زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو" آج آدھی دُنیا کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہو رہی۔ لہٰذا "انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے پیدا کردہ "خدا" پر ایمان لانے اور اس کے دعادی پر توکل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ یہی وہ "خدا" تھا جس کے متعلق مارکس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم وہ ہے جسے خود خدا نے متعین کیا ہے اور جو سلیم! قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رُو سے ان مقامات پر، خدا سے عملاً مفہوم ہے وہ نظام جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے اور اس طرح وہ تمام ذمہ داریاں اپنے سر پر لے لیتا ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کی رزاقیت کا نظام کس طرح کارفرما رہتا ہے۔ یعنی تمہاری نانی اماں کی زبان میں، وہ "پتھر میں کیڑے" کو کس طرح روزی پہنچاتا ہے؟ سرِدست اس موضوع کو چھوڑو اور اسے سمجھ لو کہ انسانی دنیا میں اس کا دعویٰ رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رُو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں مشیتِ خداوندی کی تکمیل، انسانوں ہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ لہٰذا، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کی رُو سے قائم ہو، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جس پر پورا پورا توکل (بھروسہ) کیا جا سکتا ہے اور یہی ہے وہ نظام جو انسان کے دل میں اس امر کا یقین پیدا کر سکتا ہے کہ میں بھوکا نہیں مر سکتا، میری اولاد تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس نظام میں انسان احتیاج کی فکر سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی خصوصیتِ کبریٰ ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کی ذمہ داری میں آجانے والوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف رہے گا، نہ احتیاج کی فکر ستائے گی۔ اسی نظام سے انسان کی دُنیا اُس جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے متعلق ابنِ آدم سے کہا گیا تھا کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَ لَا تَعْرٰی ۝ وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَ لَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۸) "اس میں نہ تو بھوکا رہے گا نہ ننگا، نہ پیاسا رہے گا نہ (بلامکان کے) دھوپ میں۔" اور یہ

جنت بنے گی کس طرح سے؟ اس طرح کہ کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ○ (۲۰/۱۲۳) "ہماری طرف سے تمہیں رہنمائی کے قوانین ملیں گے. جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو نہ اس کی کوششیں بے نتیجہ رہیں گی اور نہ اسے بھوک، لباس اور سردی گرمی کی تکالیف اٹھانی پڑیں گی" لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. انہیں احتیاج کا خوف دامنگیر نہیں ہوگا.

سلیم! تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ خود غرضی کا بنیادی سبب احتیاج کا خوف تھا اور اس خوف سے نجات کا ذریعہ اس نظامِ ربوبیت کا قیام ہے جو ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے. بلکہ اس میں کسی فرد کے دل میں احتیاج کا خوف پیدا ہی نہیں ہوتا اور جب انسان احتیاج کی طرف سے مامون ہو جاتا ہے تو خود غرضی باقی نہیں رہتی. اور جب خود غرضی باقی نہیں رہتی تو کیریکٹر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے. اب سمجھئے سلیم! کہ ہم میں آج کیریکٹر کیوں نہیں اور کیریکٹر پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ نظامِ ربوبیت کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ممکن ہے جو کیریکٹر والے ہوں. اور چونکہ آج ہم میں کیریکٹر نہیں اس لئے اس نظام کا قیام ناممکن ہے. اور میں کہتا ہوں کہ تم اس نظام کی ابتدا کر دو، کیریکٹر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا. تم خدا کی ربوبیت کو عام ہونے دو پھر دیکھو کہ کس طرح

ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

کا منظر تمہارے سامنے نہیں آجاتا اور موجودہ افراد کی سیرت میں پاکیزگی پیدا نہیں ہو جاتی!

اس نظام کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے. شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی، اس نظام کے تصور کے عام کرنے اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگۂ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے. اس کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے. نبئ اکرمؐ نے اسی نقطہ سے آغازِ کار کیا تھا: وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ یعنی اس قانونِ ابدی کی تعلیم اور اس کی حکمت اور لِم کی تفہیم سے. کتاب، قانون کو کہتے ہیں اور حکمت ہوتی ہے (THE WAY OF IT) اس کی غایت. اس تصور کو عام کرنے سے ایسے سعادت مند افراد نِتھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن کی نگاہوں میں کشادا اور قلب میں وسعت ہوتی ہے. اسی کا نام نفس کی بالیدگی (تزکیہ) ہے اور تعلیمِ کتاب و حکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے: وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ. اب یہاں سے سلیم! ایک دوسرا نکتہ شروع ہوتا ہے. یعنی یہ کہ اس تعلیم سے کون سی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے جس سے انسان کی نگاہوں میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ذاتی مفاد کی تنگ وادیوں سے نکل کر اجتماعی

مفاد کی اس جنت میں جا پہنچتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (۳/۱۳۲) "اس کی وسعت تمام ارض و سما کو محیط ہے۔" یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے۔ جب بات چھیڑ دیتے ہو تو اسے پوری طرح سمجھ بھی لیا کرو۔

تم دیکھ چکے ہو کہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرد کی ذات کا تحفظ کرے۔ اسی لئے ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور کسی اور کو اس مفاد میں شریک نہیں کرتا۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے مفاد کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے۔ یہ شراکت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کا اپنا مفاد اس کی اولاد ہی کا مفاد بن جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنی اولاد کے لئے کرتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر اس قدر نہیں ہوتی جس قدر اولاد کے مستقبل کی ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت یہی اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ اگر میری موت بے وقت ہو گئی تو میری اولاد کا کیا بنے گا؟ تم نے سلیم! غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یعنی وہی عقل جس کا فریضہ اس فردِ متعلقہ کا تحفظِ ذات تھا' ان ماورائے ذات افراد کی حفاظت کے لئے اس درجہ مشوش و پریشان کیوں ہو گئی؟ اس لئے کہ یہ شخص (باپ) ان ماورائے خویش افراد (یعنی اولاد) کو خود اپنی ذات ہی کا جزو سمجھتا ہے۔ وہ ان میں اور اپنے آپ میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ یہی جذبہ ہے جس کے تحت گھر (HOME) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ عائلی زندگی کی اساس و بنیاد یہی ہے۔ اس زندگی سے ابتداء ہوتی ہے ایک عہدی رشتے کی۔ یعنی ایک مرد اور ایک عورت اپنے گھر کی نئی دنیا بسانے کا عہد کرتے ہیں اور اس عہد سے ایک نیا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں اپنی اولاد کو خود اپنی ذات کا جزو سمجھتے ہیں۔ اس طرح "گھر" ایک ایسی وحدت (UNITY) بن جاتا ہے جس میں انفرادی مفاد' اجتماعی مفاد میں گم ہو جاتا ہے۔ اس سے' اس فردِ متعلقہ (باپ) کی نگاہوں میں اتنی کشاد اور قلب میں ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک حد تک بیرونِ خویش مفاد کو بھی' اپنی ذات کا مفاد سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس وسعت و کشائش سے انفرادیت کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ تم ایسے افراد کی سیرت کا مطالعہ کرو جو تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یوگ اور سنیاس کے تجرد کی زندگی نہیں' بلکہ اس تجرد کی زندگی جس کے متعلق اکبرؔ نے کہا تھا کہ

ہوئے اس قدر مہذب' کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں' مرے ہسپتال جا کر

تم دیکھو گے کہ اس یکسر انفرادیت کی زندگی میں ان کی سیرت کے بہت سے گوشے بحرِ بیکراں ہونے کی بجائے گھٹ گھٹ کر جوئے کم آب بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ "مشینی" قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ دِلّی کی "کرخنداری زبان" میں یوں سمجھ لو کہ یہ "ایک دم لٹھ ہو جاتے ہیں، لٹھ"۔ یعنی ان میں زندگی کی لوچ نہیں رہتی۔

لیکن باپ اور اولاد کا یہ تعلق علم کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ جس باپ کو معلوم نہ ہو کہ فلاں لڑکا اس کا بیٹا ہے وہ اسے کبھی اپنی ذات کا جزو نہیں سمجھتا۔ تم نے رستم و سہراب کا قصہ پڑھا ہوگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ اسی لئے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ لیکن جونہی ان پر یہ راز کھل گیا' دونوں اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ لہٰذا 'اشتراکِ مفاد کے لئے اس امر کا ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ وہ افراد خود اس شخص کی ذات کا جزو ہیں۔ قرآن اس احساس کی بیداری (یا تعلیم) کی ابتداء عائلی زندگی کی اہمیت کو سامنے لانے سے کرتا ہے۔ تم قرآن کے مختلف اوراق پر غور کر دا ور دیکھو کہ عائلی زندگی (FAMILY LIFE) کی ضرورت اور اہمیت کو کس طرح مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لانا ہے کہ ایک فرد کے مفاد' اس کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہوتے۔ اس میں اور بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس احساس سے انسان کی تربیتِ ذات کی ابتداء ہوتی ہے۔ عائلی زندگی کے اس نقطۂ آغاز سے قرآن بتدریج آگے بڑھتا ہے اور ان دیواروں کو ایک ایک کرکے توڑتا جاتا ہے جنہوں نے انسان کو محدود چار دیواری کے اندر محبوس کر رکھا ہے۔ جوں جوں یہ دیواریں ٹوٹتی ہیں' اس کی اُفقِ نگاہ' وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آخر الامر وہ اس مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) تمام نوعِ انسانی کی تخلیقی اصل ایک ہے۔ یعنی جس رشتہ (ایک اصل کی شاخیں ہونے کے احساس) نے باپ اور بیٹے میں اشتراکِ مفاد پیدا کر دیا تھا' قرآن اُسی رشتہ کو تمام انسانوں میں مشترک قرار دیتا ہے اور اس طرح "عقلِ خود بیں" کو "عقلِ جہاں بیں"[1] میں تبدیل کر دیتا اور نفسِ انسانی سے انفرادیت کی گرہیں کھول کھول کر آگے

---

[1] معلوم نہیں سلیم! تم نے اقبالؒ کا مطالعہ بالالتزام شروع کیا ہے یا نہیں؟ اگر اب تک نہیں کیا تو یقین مانو کہ تم نے اپنے آپ کو ایک قیمتی متاع سے محروم رکھا ہے۔ وہ "پیامِ مشرق" میں اہلِ فرنگ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ ؎

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم دارد — نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم دارد

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

انسانیت کی وسعتیں عطا کر دیتا ہے۔ اس طریقِ کار کا نام ہے "تعلیمِ کتاب وحکمت" اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے نفسِ انسانی کی نشوونما۔ یعنی تزکیۂ نفس (وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ)۔ اس طریقِ تعلیم (تصوّرِ ربوبیت کو عام کرنے) سے معاشرے میں ایسے افراد نکھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن پر اس نظام کی اہمیت واشگاف ہو جاتی ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں اس نظام کی ابتداء ہوتی ہے جس میں ہر فرد فکرِ احتیاج سے بے خوف ہو جاتا ہے اور جب یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو پورے معاشرے میں اس کیریکٹر کی لہر دوڑ جاتی ہے، جس کے فقدان کا رونا ہم آج اس طرح روتے ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہتا ہے، کیریکٹر بھی باقی رہتا ہے۔ جب یہ نظام بگڑ جاتا ہے تو پھر وہی انفرادیت کی بھگدڑ شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے سلیم! قوم میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے اس نظام کی ترویج ضروری ہے جس میں افراد فکرِ احتیاج سے بے نیاز ہو جائیں اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی فضا عام ہو جائے۔ ہم نے یہ نظام دیکھا نہیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام خود رسالتمآبؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔ یہ نظام باقی نہ رہا، لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔ بقول غالبؔ: ؎

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

اسی "پرتوِ نقشِ خیالِ یار" کے تصدق، ہر اس شخص کا جس کی نگاہوں کے سامنے اس کا تصور ہو، یہ عالم ہوتا ہے کہ

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال!

اسی نظامِ قرآنی کی طرف دعوت میری زندگی کا مقصود ہے۔ میری کوششیں ابھی تک "تعلیمِ کتاب وحکمت" کی منزلِ اوّل میں ہیں۔ میں امکان بھر اس کے صحیح تصوّر کو عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ عام مسلمانوں کی نگاہوں سے اس کا تصوّر یکسر اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے اُسے از سرِ نو سامنے لانے کے لئے بڑی کاوش درکار ہے۔ جب اس کا تصوّر عام ہو جائے گا تو اسے عملاً متشکل کرنے کا ولولہ بھی بیدار ہو جائے گا: ؎

اور "جاوید نامہ" میں بتاتے ہیں کہ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں میں کیا فرق ہے۔ ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی کا نام کیریکٹر ہے۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

تم پوچھتے ہو کہ اس کتاب و حکمت کے مرحلۂ اوّل کے بعد کیا پروگرام ہوگا؟ تم نے جتنی مرتبہ اس سوال کو دہرایا ہے میں نے یہی کہا ہے کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ پہلے اس تصوّر کو عام تو کرو۔ لیکن اس جواب سے تمہارے قلبِ سراپا شوق و اضطراب کی تسکین نہیں ہوتی۔ اب اس کے بعد اگر میں تمہارے غالبؔ کے الفاظ میں یہ کہہ دوں کہ

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

تو کہو تمہاری تسکین ہو جائے گی؟

تم ٹھیک کہتے ہو کہ:

یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

لیکن سلیم! ہر غنچہ اپنے جوشِ نمو سے کھل کر پھول بنتا ہے۔ "نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل"؛ اگر اسے اس سے پہلے کھلانے کی کوشش کرو تو اس کی ایک ایک پتی بکھر جائے گی۔ اس نظام کی شگفتگی بھی اُسی قانون کے تابع عمل میں آتی ہے جو اس کی اساس و بنیاد ہے۔ تمہیں اس نظام کے جلد روبہ عمل آنے کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دیتی، لیکن سلیم! میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ

جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

یہ کب ہوگا؟ اس کے لئے نہ تمہاری بیتابیٔ تمنا کچھ کہہ سکتی ہے، نہ میرا گریۂ نیم شبی۔ اس باب میں تو خدا نے خود اپنے رسولؐ تک سے کہہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ انقلاب تمہارے بعد ظہور پذیر ہو یا تمہارے سامنے: فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۙ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ[1]

---

[1] سلیم! جب ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ دورانِ گفتگو میں یہ آیت سامنے آگئی تو اس سے اُن پر کیا کیفیت طاری ہو گئی تھی، اسے کسی دوسری فرصت میں بیان کروں گا۔ اس واقعہ کی یاد سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض لمحات ایسے بھی تھے جنہیں دیکھنے کا موقعہ مجھے ہی ملا تھا۔

(۴۱ - ۴۲/۴۳)۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس کے لئے نہایت حتم ویقین سے کہہ دیا کہ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِىٓ اُوْحِىَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۴۳/۴۳) "تم قرآن کے ساتھ متمسک رہو۔ یہی وہ متوازن راہ ہے جو اس انقلاب تک لے جائے گی"۔

یہی اس انقلابِ عظیم کے داعیٔ اوّل نے کیا اور یہی تمہیں اور مجھے کرنا ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جس کا دہرا دینا ضروری ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ انسانی زندگی کا منتہا اس کی طبعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی نہیں بلکہ ان ضروریات کی طرف سے اطمینان، اس کی نگاہوں میں وہ کشادگی پیدا کر دیتا ہے جس سے یہ ذاتی مفاد پر کلّی مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور اس طرح انسانی معاشرہ میں نظم، ضبط اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ مساعد فضا پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی کے لئے ناگزیر ہے۔ اس طرح بہ حیثیتِ مجموعی انسانیت کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اس بلند سطح سے کیا ہوتا ہے؟ آج اس چیز کا سمجھنا دشوار ہے۔ اس لئے کہ آج ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں اس میں نفسا نفسی کی ایسی بھگدڑ مچ رہی ہے کہ انسانی فکر کے لئے اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنا محال ہو رہا ہے۔ اس وقت انفرادی مفاد کی دھند اس قدر دبیز ہے کہ اس میں انسان دو قدم آگے نہیں دیکھ سکتا۔ ان حالات میں وہ کیا سمجھے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی فضا میں دلوں کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے؟ بقول اقبالؒ:

بآدمے نرسیدی؟ خدا چہ می جوئی؟

لیکن اسے بھی سمجھ رکھو کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مقامِ آدم حاصل کرنا لاینفک ہے۔ اور آدم وہ ہے جس کی نشوونما زندگی کی ابتداء اس ارض سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جس آدم کے لئے ارض (معاش) کی مشکلات حل نہیں ہوتیں، اس کی نگاہیں اُوپر کیا اٹھ سکیں گی۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

ابھی سلیم! تمہاری دو تین باتیں اور جواب طلب ہیں۔ لیکن ان کے جواب سے پہلے میں تمہاری توجہ پھر اس اہم نکتہ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے؛

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم

اور وہ یہ کہ جو بات تم پوچھتے ہو پہلے اس کا مفہوم متعین کرو۔ یاد رکھو سلیم! آدھی بات تو محض تعین مفہوم سے واضح ہو جائے گی۔ یقین نہ آئے تو ایسا کر کے دیکھ لو! میں کہتا ہوں کہ اگر ہم اس دور میں صرف اتنا کر جائیں کہ ہمارے ہاں جو الفاظ اور اصطلاحات مروج ہیں ان کا مفہوم اس طرح متعین کر لیں کہ ہر بولنے اور سننے والے کے ذہن میں ایک مفہوم آئے (جس طرح پانی کہنے سے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آتا ہے) تو یقین مانو کہ یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ میں اسی کی کوشش کر رہا ہوں، خدا مجھے کامیاب کر دے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جب تم سے کوئی کہے کہ فلاں کارو بار کرو، اس میں تمہیں نفع ہوگا، تو کہنے والا بھی سمجھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ اس سے مطلب کیا ہے؟ یہ الفاظ ایک ہندو کہے یا مسلمان۔ سُنّی کہے یا شیعہ، مقلد کہے یا غیر مقلد، ہر ایک کا مفہوم ایک ہوگا۔ لیکن سلیم! جب کبھی تم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، اس سے تمہیں ثواب ہوگا، "تو ایمان سے کہو، تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اس سے کیا ہوگا؟" یا یہ کہ ان الفاظ کا جو مفہوم تم نے سمجھا ہے، تمہیں یقین ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں بھی وہی مفہوم ہے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ کیا تم کسی ایسے شخص کو جو اس لفظ (ثواب) کے اُس مبہم مفہوم سے مطمئن نہیں جو وراثتی طور پر ہمارے ذہنوں میں چلا آرہا ہے، سمجھا سکتے ہو کہ اس سے مفہوم کیا ہے؟ جب کوئی زیادہ اصرار کرے گا تو تم کہہ دو گے کہ اس سے "نجات" حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے پھر وہی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ "نجات" سے مفہوم کیا ہے؟ اور کیا یہ مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں یکساں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے؟ تم کہہ دو گے کہ اس سے مفہوم جنت میں جانا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جنت کا مفہوم تمہارے ذہن میں متعین ہے اور کیا یہی مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے؟ مجھے تسلیم ہے کہ جہاں تک ان امور کا تعلق آنے والی زندگی سے ہے ان کا پورا پورا مفہوم، زندگی کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن ان امور کا تعلق صرف آنے والی زندگی ہی سے تو نہیں، ہماری موجودہ زندگی سے بھی تو ان کا تعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے، کیا ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے ہے؟ اور کیا وہ مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں یکساں ہے جو ان اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے؟ یہ تو تمہیں بھی تسلیم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کو سلیم! قرآن نے پیش کیا ہے۔ لہٰذا، قرآن کو ان کا مفہوم بھی متعین کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو (معاذ اللہ) وہ بڑی

ناقص کتاب ہے. لیکن اگر وہ ان کا مفہوم متعین کرتا ہے تو وہ آج ہماری نگاہوں سے یکسر او جھل ہے. یاد رکھو سلیم!
جب تک ہم ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم، جن کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے (اور وہ کون سی چیز ہے
جس کا کسی نہ کسی حد تک ہماری موجودہ زندگی سے تعلق نہیں ؟) اس طرح متعین نہیں کرتے جس طرح ہم کاروباری
دنیا میں الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم متعین کرتے ہیں، ہمارا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا. معاملات کی دُنیا
میں تجریدی گفتگو (ABSTRACT TALK) سے کبھی کام نہیں چل سکتا. نہ کوئی قوم اس اندازِ گفتگو سے زندہ رہ
سکتی ہے. ہمیں ٹھوس (CONCRETE) زمین پر رہنے کے لئے بھیجا گیا ہے. ہمارے معاملات بھی ٹھوس
اندازِ گفتگو سے ہونے چاہئیں. دیکھتے ہو کہ غالبؔ اپنی رندانہ شوخی سے اس باب میں کیا کہتا
ہے ؛ وہ کہتا ہے کہ :

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

لہٰذا سلیم! سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم ان تمام الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم جنہیں ہم روزمرّہ
بلا سوچے سمجھے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، قرآن سے متعین کر لیں. اس کے بعد باقی منزل بہت آسانی
سے طے ہو جائے گی. یہی وہ بنیادی مقصد ہے جس کے لئے میں نے قرآن کا وہ لغت مرتب کیا ہے جس کا چرچا
تم کتنے دنوں سے سُن رہے ہو. جب وہ لغت (اور اس کی روشنی میں متعین کردہ مفہوم القرآن[1]) شائع ہو گا
تو اُس وقت تم دیکھو گے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کا مفہوم عربی زبان اور قرآنِ کریم کی روشنی میں کس عمدگی سے
متعین ہو جاتا ہے.

مجھے اس سے خوشی ہوئی سلیم! کہ میرے خطوط سے تمہارے شکوک کی بہت سی پھانسیں نکلتی جا رہی ہیں ؛

دُعائیں دیں گے میرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل کے

لیکن اس میں میری کاریگری تو کچھ نہیں. یہ تو اس کتابِ مبین کا تصدّق ہے جس کا سب سے پہلا دعویٰ

---

[1] یہ دونوں مدّت ہوئی شائع ہو چکے ہیں. ۱۹۸۰ء.

یہ ہے کہ لَا رَیْبَ[1] فِیْہِ . اس سے قلب کے تمام اضطراب رفع ہو جاتے ہیں:

نہیں اس میں شک کوئی تاجورؔ کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غمِ دوست درد نگار ہے

یہ خط توقع سے زیادہ لمبا ہو گیا۔ باقی باتوں کے متعلق پھر سہی۔

والسّلام
اپریل ۱۹۵۱ء

[1] رَیْبَ کے معنی اضطرابِ قلب کے ہیں۔

چودھواں خط

انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟

(سابقہ خط کے تسلسل میں)

تم نے بالکل سچ کہا ہے سلیم! کہ اخلاق و دیانت کے سب وعظ اسی وقت تک ہیں جب تک انسان کو بددیانتی کا موقعہ نہیں ملتا۔ آج جو شخص بددیانتی اور رشوت ستانی کا سب سے بڑا مخالف اور ناقد ہے' اختیارات ہاتھ میں آجانے کے بعد وہ بھی انہیں جیسا ہو جاتا ہے جن پر وہ اس قدر شدید نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ پرانی کہاوت میں اسے "عصمتِ بی بی از بیچارگی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تم نے سلیم! بات تو چھوٹی سی اور بظاہر پیش پا افتادہ کہی ہے لیکن اس کے نتائج و عواقب پر غور کرو تو وہ بہت دُور رس ہیں۔ ساری دُنیا کے انسانوں پر غور کرو۔ کوئی قوم' حتّٰی کہ کوئی فرد ایسا نہ ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے۔ چوری ضرور کرنی چاہیئے۔ لوگوں پر ظلم کرنا' دوسروں کا حق دبا لینا' غریبوں کو ستانا نہایت مستحسن کام ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہے گا۔ لیکن اس کے باوجود دُنیا میں ہر جگہ ہوتا یہی دکھائی دے گا۔ دُنیا کی تاریخ پر غور کرو۔ ساری تاریخ اسی تضادِ قول و عمل سے بھری پڑی ہے۔ انسان نے ہمیشہ اخلاقی ضوابط کی تعریف کی ہے' لیکن عمل اس کے خلاف کیا[1]۔ یہی کچھ شروع سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی آج ہو رہا ہے۔ اخلاقیات کے لئے کسی وعظ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس بات کو ہر شخص از خود مان رہا ہے۔ جسے وہ بلا دلیل و برہان صحیح تسلیم کر رہا ہے' اس کے لئے اسے وعظ و نصیحت کی کیا ضرورت ہے؟ تم کسی سے کہو کہ سچ بولنا بہت اچھا

---

[1] یہ انسان کی عمومی حالت کا ذکر ہے' مستثنیات کا نہیں۔

ہے، وہ بلا تامّل کہہ دے گا، دریں چہ شک؟ لیکن جب اسے ضرورت پڑے گی، بلا توقف جھوٹ بول دے گا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے اور ہمارا تجربہ اس پر گواہ کہ تنہا اخلاقی ضوابط (ETHICAL CODES) انسان میں کوئی اصلاح نہیں پیدا کرسکے۔ نہ پہلے کرسکے تھے، نہ آج کر رہے ہیں۔ انسان نے ہمیشہ اخلاقی ضوابط کو سراہا ہے اور ہمیشہ ان کے خلاف عمل کیا ہے۔ تمہارے اخلاقیین (MORALISTS) کی کوئی مقدس آرزو اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی۔ سقراط (SOCRATES) کا خیال تھا کہ انسان بُرائی اس لئے کرتا ہے کہ اسے علم نہیں ہوتا کہ وہ بُرائی ہے۔ نیکی اور بُرائی میں تمیز ہو جانے کے بعد کوئی شخص برائی کی طرف مائل نہیں ہوسکتا۔ دیکھو کہ انسان کی تاریخ، سقراط کے اس حُسنِ ظن کو کس قدر جھٹلا رہی ہے؟ کسے معلوم نہیں کہ جھوٹ بُرا ہے اور سچ اچھا۔ لیکن اس تمیز کے بعد کتنے ہیں جو جھوٹ سے اجتناب کرتے ہیں اور سچ کا التزام۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور تمہارے تبسّم زیرِ لب کو بھی کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا ہوں جو تمہارے ان خیالات کی غمازی کر رہا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ "انسان کی فطرت" ہی بدواقع ہوئی ہے۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ "انسانی فطرت" کا تصوّر ہی غلط ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ نہ نیک نہ بد۔ خامۂ قدرت نے اس کی لوحِ جبیں کو بالکل خالی رکھا ہے کہ وہ خود اپنے قلم سے جو کچھ چاہے اس پر لکھ لے۔ لہٰذا، مذکورہ صدر حقائق و شواہد سے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ انسانی فطرت ہی بدواقع ہوئی ہے، ایسی عمارت کی تعمیر ہے جس کی بنیاد ہی نہ ہو۔ اس قسم کے اعلانات (VERDICTS) درحقیقت اخلاقیین کے اعترافِ شکست کے مرادف ہیں۔ اس حقیقت کو تو وہ چھپا نہیں سکتے کہ ان کے اخلاقی مواعظ، انسانی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اس معاملے میں ان کی اپنی غلطی کہاں ہے، وہ اپنی شکستِ پندار کو اس فریب میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی بدواقع ہوئی ہے۔ اس باب میں سب سے بڑی شکست عیسائی کو ہوئی۔ عیسائیت (حضرت مسیح علیہ السلام کی نہیں بلکہ ان کے نام لیواؤں کی خودساختہ عیسائیت) کا مدار ہی اخلاقی مواعظ پر تھا۔ اس لئے کہ یہ عیسائیت کمزوروں اور محکوموں کا مذہب تھی اور منفعلانہ اخلاق[1] کے نام پر اپیلیں کمزور ہی کیا کرتے تھے۔ جس شخص کے پاس اپنی حفاظت کا سامان موجود

---

[1] محکومیت اور مغلوبیت ہمیشہ منفعلانہ اخلاق کی تعلیم دیتی ہے۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ چور اگر تمہارا کوٹ اتار لے تو صدری اتار کر خود دے دو، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دو، شر کا مقابلہ مت کرو، خدا کی بادشاہت کمزوروں اور ناداروں کے لئے ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہے اور مدافعت کی قوت حاصل۔ وہ چور اور ڈاکو سے رحم کی درخواست نہیں کرتا۔ وہ ان کے حملے کا جواب بندوق کی گولی سے دیتا ہے۔ جس کے پاس مدافعت کا سامان اور غلبے کی قوت نہیں ہوتی وہ دوسروں سے ڈرتا ہے اور ان کے رقیق جذبات سے اپیلیں کرکے رحم کی درخواستیں کرتا ہے۔ عیسائیت میں اس کا نام رہبانیت کی زندگی ہے (رہب کے معنی ہی خوف کے ہیں)۔ اس طرح ڈر ڈر کر زندگی بسر کرنے کا مسلک حضرت مسیحؑ کی تعلیم نہیں تھی۔ یہ اُس تعلیم کے دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھی جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے انقلاب آفریں نظامِ زندگی (دین) کو رہبانیت میں بدل کر اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ (یہی وہ حربہ تھا جو اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں نے استعمال کیا تھا)۔ جب اس طرح دین کی انقلاب سامانی' رہبانیت کی پند آفرینی میں بدل گئی تو شر کی قوتیں بدلگام ہوگئیں۔ اب ان مبلّغینِ اخلاقیات نے دوسروں کو (اور شاید اپنے آپ کو بھی) یہ کہہ کر دھوکا دے لیا کہ انسان کی فطرت ہی بدواقع ہوئی ہے جو اس پر اخلاقی مواعظ کا اثر نہیں ہوتا۔ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش سے اپنے اوّلیں ماں باپ (آدم وحوّا) کے گناہوں کو ساتھ لاتا ہے۔ عیسائیت کی طرح یہی حالت ہندوؤں کے ضابطۂ اخلاق کے ساتھ ہوئی۔ انہوں نے انفرادی طور پر تو یہ کہہ دیا کہ ہر انسان اپنے موجودہ جنم میں اپنے سابقہ جنم کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی وہ گناہوں کی کثافت اور آلائش کو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی لاتا ہے۔ اس میں بھی عیسائیت کے اس عقیدے کی جھلک صاف نظر آتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا جا چکا ہے۔ اور اجتماعی طور پر انہوں نے انسانی تاریخ کو مختلف زمانوں (جُگوں) میں تقسیم کردیا۔ گزشتہ زمانہ ست جگ (سچائی کا دور) قرار پاگیا (کیونکہ وہ گزر چکا تھا) اور موجودہ زمانہ کل جُگ (جھوٹ کا دَور)۔ بات وہی ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ملزم ٹھہرانے کی بجائے انسانی فطرت یا زمانے کے چکر کو ملزم قرار دے دیا جائے۔ یہی کچھ مجوسیت میں ہوا۔ انہوں نے دنیا میں خیر و شر کو دو مستقل قوتیں قرار دے دیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا کہ شر کی قوتوں پر پند و نصائح کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شر مستقل طور پر اپنا وجود رکھتا ہے جسے معدوم نہیں کیا جاسکتا۔ بُدھ مت والے اور آگے بڑھے تو انہوں نے (عیسائیت کی رہبانیت کی طرح) کہہ دیا کہ مادّہ خالص شر ہے' یہ دنیا جیل خانہ ہے' نجات اس میں ہے کہ انسان اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔

آج سلیم! ساری دنیا میں اخلاقی مبلّغین کا یہی نقشہ ہے۔ کہیں انسانی فطرت کو بد قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی اس زمانہ کو کل جُگ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے' کوئی اسے قربِ قیامت اور چودھویں صدی سے تعبیر کرکے مطمئن ہوجاتا ہے اور پھر اپنی مایوسیوں کے آسرے اور زندگی کے سہارے ڈھونڈنے کے لئے

اس قسم کی پناہ گاہیں تراشتا ہے اور اس کے بعد اور ایک دور آئے گا جس میں "ایک آنے والا" عالمِ بالا سے ظہور پذیر ہوگا اور اس کے ہاتھوں شر کا خاتمہ اور اخلاق کی فتح ہوگی۔

انسان شروع سے اسی فریب میں مبتلا چلا آرہا ہے اور اسی فریب میں مبتلا چلا جارہا ہے۔ بالادست قوتوں کی یہ کتنی بڑی سازش تھی کہ انہوں نے زیردست انسانوں کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم "نیک بنو، برائیوں کو چھوڑ دو" کی مالا جپتے رہو، دنیا خود بخود سُدھر جائے گی۔

اب تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ

۱۔ جب انسان اپنی فطرت میں بد نہیں، تو پھر دنیا میں یہ فساد کیوں ہے؟ اور

۲۔ جب اخلاقی مواعظ بیکار ہیں، تو پھر اس فساد کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟

قرآن انہی سوالات کا جواب دیتا ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ آیا ہی ان سوالات کا جواب دینے اور ان مشکلات کا حل بتانے کے لئے تھا۔ اسے یاد رکھو کہ قرآن کسی کو فریب میں مبتلا نہیں رکھتا۔ وہ حقائق (REALITIES) سے مُنہ نہیں موڑتا بلکہ وہ ان کا کھلے بندوں سامنا کرتا ہے (IT FACES REALITIES) وہ کہتا ہے کہ دنیا میں انسان بستے ہیں اور انسان جیسے کچھ ہیں، ہمارے سامنے ہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں کو گناتا ہے۔ وہ اس کی جاذبِ نگاہ چیزوں کو ایک ایک کرکے شمار کراتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (۳/۱۴)

یعنی "انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے لئے ازدواجی زندگی، بال بچّے، چاندی اور سونے کے ذخیرے، سِدھے ہوئے گھوڑے، مال، مویشی، کھیتی باڑی وغیرہ وجہ خوش نمائی ہیں۔ اس لئے انسان ان کی طرف کھنچتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن ان چیزوں کو مقصود بالذّات نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ انسان کی قریبی زندگی (حیاتِ طبعی) کی نشو ونما کے ذرائع ہیں۔ اگر انسان ان ہی کو مقصودِ حیات قرار دے لے تو زندگی میں توازن نہیں رہتا۔ وہ منزلِ مقصود جس میں حُسن و توازن ہے، قانونِ خداوندی کی رُو سے متعین ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ جب اس قسم کی مخلوق (انسانوں) کو باہم مل جُل کر رہنا ہو

تو اسے اس انداز سے رہنا چاہیئے کہ اس کے معاشرے میں فساد پیدا نہ ہو اور وہ ان تمام اخلاقی ضوابط کا پابند ہو کر رہے جنہیں مبلغینِ اخلاق اس پر مسلط کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔
سنو سلیم! کہ یہ بہت غور سے سننے کی باتیں ہیں۔

یہ تو تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہر ذی حیات کا طبعی تقاضا ہے۔ یعنی جہاں بھی زندگی (LIFE) ہے اس کا تقاضا اپنے آپ کی حفاظت ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر انسان تک، ہر نفس میں تحفظِ خویش کا تقاضا موجود ہے۔ یعنی ہر ذی حیات اپنی حفاظت اور بقا کے لئے انتہائی جدّوجہد کرتا ہے۔ حیوانات کی سطح تک یہ تقاضا جبلّی طور پر (BY INSTINCT) پورا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں جبلّت سے آگے عقل بھی ساتھ آجاتی ہے۔ یعنی انسانی زندگی میں تحفظِ خویش، عقل کا فریضہ ہے[1]۔ وہ مامور ہی اس لئے ہے کہ وہ اس فرد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ میری عقل، میری حفاظت چاہے گی۔ آپ کی عقل آپ کا تحفظ، یعنی ہر فرد کی عقل اس فرد کی حفاظت چاہے گی۔ اسے کسی دوسرے فرد کی حفاظت سے سروکار نہیں۔ یہ چیز اس کی ذمہ داری سے باہر ہے۔ اس کا نام انفرادی زندگی ہے۔ یعنی ہر فرد کی الگ الگ زندگی۔ یہ ہوئی پہلی بات۔ اب دوسری بات یہ دیکھنی ہے کہ عقل اپنے اس فریضے کی ادائیگی کے لئے کرتی کیا ہے؟ اس نکتے کی وضاحت کے لئے شروع میں ذرا فنّی سی بات بیان کرنی ناگزیر ہے۔ اس سے اُکتا نہ جانا۔ غور سے سننا، کیونکہ آگے چل کر اسی سے تمہاری بات کا جواب سامنے آجائے گا۔

اس کائنات کو طبیعیاتی دنیا (PHYSICAL UNIVERSE) کہتے ہیں۔ "طبیعیاتی" کا مطلب عام فہم میں یوں سمجھو کہ جو چیزیں انسان کے دائرۂ حواس (SENSES) میں آجائیں، انہیں طبیعیاتی (PHYSICAL) کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک کی سائنس یہیں تک پہنچی تھی۔ اب سائنس کے مزید انکشافات نے یہ بتایا ہے کہ کائنات کی کوئی شے طبیعیاتی (PHYSICAL) ہے ہی نہیں۔ ہر شے ماوراء الطبیعیاتی (SUPER- PHYSICAL) ہے۔ جب کوئی ماوراء الطبیعیاتی عنصر اتنا ہیولیٰ (MASS) اکٹھا کر لے کہ وہ محسوس (PERCEPTIBLE) ہو جائے تو اسے طبیعیاتی (PHYSICAL) کہہ دیتے ہیں۔ اس مفہوم کو اگر میں انگریزی کے ایک فقرے میں لکھ دوں تو تم

---

[1] ان صفحات میں عقل کے صرف اس گوشے سے بحث کی گئی ہے جس میں اس کا فریضہ تحفظِ خویش ہوتا ہے۔

زیادہ آسانی سے سمجھ جاؤ گے۔

(WHEN SUPER-PHYSICAL GATHERS SO MUCH MASS THAT IT BECOMES PERCEPTIBLE BY OUR SENSORY ORGANS, IT IS CALLED PHYSICAL.)

لہٰذا، اس محسوسات کی دُنیا میں کسی شے کے وجود (EXISTENCE) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہیولیٰ اکٹھا کرے اور پھر اُسے یکجا (INTEGRATE) رکھے۔ انگریزی فقرے میں یوں سمجھو کہ

(PHYSICAL EXISTENCE MEANS GATHERING OF MASS AND KEEPING IT INTEGRATE)

عقلِ انسانی نے یہی سیکھا ہے کہ فرد کی ہستی (EXISTENCE) کو قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے جَمَعَ (COLLECTING OR GATHERING MASS) فَاَوْعٰی (WITHHOLDING OR KEEPING IT INTEGRATE)

جمع کرنا اور پھر اُسے سمیٹ کر رکھنا۔ اسے تحفظِ خویش کی یہی تدبیر یاد ہے، اس لئے وہ ہر وقت اسی میں مصروف رہتی ہے۔ قرآنی الفاظ میں جَمَعَ فَاَوْعٰی (۱۸/۷۰)[1]۔

غور کرو سلیم! جب کسی معاشرے کی صورت یہ ہو جائے کہ اس میں ہر فرد کچھ سمیٹنے اور سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہو تو اس معاشرے میں فساد (ناہمواریوں) کے سوا اور کیا ہوگا؟ یہ دوسری بات ہوگئی۔ پھر دہرالو کہ

پہلی بات یہ تھی کہ عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فردِ متعلقہ کے تحفظ کی فکر کرے۔

اور دوسری بات یہ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے عقل نے سیکھا صرف یہ ہے کہ سب کچھ جمع کیا جائے اور اسے اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لیا جائے۔

اب ایک قدم آگے بڑھو (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) تحفظِ ذات کا تقاضا حیوانات میں بھی ہے۔ لیکن حیوانات کل (TOMORROW) کا تصور نہیں رکھتے۔ یہ صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے[2] کہ وہ فردا کا تصور بھی رکھتا ہے۔

---

[1] مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰی ۙ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰی ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ (۷۰/۱۷-۲۰)۔

[2] ذات (PERSONALITY OF SELF) کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حافظہ کی رُو سے ماضی سے وابستہ ہوتی ہے اور مقصد (PURPOSE) کی رُو سے مستقبل سے بندھی ہوئی۔ یہ چیزیں نہ رہیں تو انسان حیوان کے درجہ پر جا پہنچتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی' آج کی فکر سے فارغ ہونے کے بعد کل کی فکر شروع کر دیتی ہے. اور چونکہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ اس کی موت کب واقع ہو گی اس لئے اس کی فردا لامتناہی ہو جاتی ہے. یعنی عقلِ انسانی کے نزدیک مستقبل کی فکر کی کوئی حد مقرر نہیں، اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ (۱۰۲/۲-۱).

بڑھاپے میں انسان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی موت قریب آ رہی ہے. اس سے امکان تھا کہ انسانی عقل اپنے مستقبل کی فکر کو مختصر کر دے. لیکن یہاں اسے اولاد کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے. میں نے تمہیں بتایا تھا سلیم! کہ جب ابلیس نے آدم کو یہ کہہ کر بہکایا تھا کہ آؤ بتاؤں کہ حیاتِ خلد (ہمیشہ کی زندگی) کا راز کیا ہے تو اس نے اس کا ذریعہ اولاد ہی بتایا تھا[1]. یعنی انسان اپنی موت کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہنے کی ہوس رکھتا ہے. لہٰذا' تحفظِ خویش کے بعد' اولاد کے تحفظ کی فکر اس کا دامن پکڑ لیتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا چلا جاتا ہے. حیوانات میں نہ کل کا تصور ہوتا ہے اور نہ ہی (کچھ وقت کے بعد) اولاد کی فکر. لہٰذا' اُن کی انفرادی زندگی' ان کی ذات تک محدود ہوتی ہے. لیکن انسان اپنے بعد' اپنی اولاد کے لئے زیادہ جمع کرنے اور اُسے سمیٹ کر رکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس طرح جَمَعَ فَاَوْعٰى کا سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے.

یہ تیسری بات ہو گئی. یعنی:

۱. تحفظِ خویش عقل کا تقاضا ہے.

۲. عقل نے تحفظِ خویش کے لئے سیکھا ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ جمع کیا جائے اور اسے سمیٹ کر رکھا جائے اور

۳. یہ سلسلہ ایک فرد کی اپنی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی اولاد کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے.

اب سوچو سلیم! جب عقلِ انسانی کا فریضہ ہی یہ ہو کہ وہ سب کچھ فردِ متعلقہ کے لئے جمع کرے اور اسے سمیٹ کر رکھے تو وہ کسی کے کہنے پر اپنے اس فریضے کو چھوڑ کیسے سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد اخلاقی ضوابط کا اقرار کرنے کے باوجود موقع ملنے پر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر' وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے جو دیگر افراد کر رہے ہوتے ہیں. عقل کا تقاضا ہی یہی ہے کہ وہ یہ کچھ کرے. اخلاقی اصولوں کا اقرار' اس تقاضے کو روک نہیں سکتا. یہی وجہ ہے کہ خالی اخلاقی مواعظ' انسان کو ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے. اسے سُن رکھو سلیم! کہ کوئی شخص تنہا عقل کی رُو سے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ اسے غریب کی مدد

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم" میں عنوان "آدم" جس میں قرآنی قصۂ آدم کا مفہوم واضح کیا گیا ہے.

کیوں کرنی چاہیئے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، دوسرے کی مدد کرنا عقل کے احاطے سے باہر کی چیز ہے۔ باہر ہی کی نہیں، بلکہ یہ چیز اس کے تقاضے کے خلاف اور اس کے فریضے کی نقیض ہے۔ عقل صرف اپنے فرد کے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اسے دوسرے افراد کے مفاد کے تحفظ سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ عقل کی دلیل صرف اپنے مفاد تک محدود رہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے سلیم! جب تم نے راشد سے کہا تھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا، تو اس نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ "مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا؟" یہ جواب ارشد ہی کا نہیں، تم صبح سے شام تک لوگوں کو یہی کہتے سنو گے۔ "میں کیوں جھوٹ بولوں؟ مجھے جھوٹ بولنے سے کیا حاصل ہوگا؟ مجھے کیا ضرورت تھی جو میں جھوٹ بولتا؟ میں غلط بیانی کیوں کرتا؟ اس سے مجھے کیا مل جاتا[1]؟" یہاں تک کہ اگر تم عدالت میں یہ کہو کہ فلاں شخص نے جھوٹ بولا ہے، تو اس کے بعد تمہیں یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ جھوٹ بولنے سے اس کا فائدہ کیا تھا۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ عقل کے پاس "کیوں" کا کیا جواب ہے؟ صرف یہ جواب کہ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوگا۔ لہٰذا عقل کسی ایسی بات کو اختیار ہی نہیں کر سکتی جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ اگر سچ بولنے میں فائدہ ہے تو عقل اسے سچ بولنے پر آمادہ کرے گی۔ اگر اسے جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر آتا ہو، تو وہ جھوٹ بولنے پر اکسائے گی۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ کوئی شخص تنہا عقل کی رُو سے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے؟ عقل زیادہ سے زیادہ یہ جواب دے گی کہ غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہیئے کہ اگر (خدانکردہ) کل کو میں خود غریب ہو گیا تو دوسرے میری مدد کریں گے! دیکھ لو! اس میں بھی وہی بات پوشیدہ ہے۔ یعنی اپنا فائدہ۔ عقل سے کہو کہ اپنے فائدے کو الگ کر کے بتائے کہ غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے؟ سچ کیوں بولنا چاہیئے؟ عقل اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے گی۔ عقل کے فیصلوں کا معیار صرف اپنا فائدہ اور نقصان ہوتا ہے۔ وہ ذاتی سود و زیاں کے چکر سے نکل ہی نہیں سکتی۔

لیکن اس سے سلیم! یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ چیز عقل کے خلاف لبطور جرم عائد کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ چیز عقل کا عین فریضہ ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کرتی ہے۔ اب اس سے

---

[1] غور کیجئے۔ ہم کس بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ میں جھوٹ کیوں بولوں؟ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟ یعنی یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اگر جھوٹ بولنے میں میرا فائدہ ہو تو میں بیشک جھوٹ بول دوں گا۔ یعنی ہم میں سے ہر شخص اعلان کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک ہی سچا ہے جب تک جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر نہیں آتا۔ کتنا بڑا جرم ہے جس کا اقرار ہم غیر شعوری طور پر اس بے تکلفی سے کرتے رہتے ہیں۔

یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ جس معاشرے کا کاروبار تنہا عقل کے سپرد کر دیا جائے، اس میں انسان کی حالت کیا ہوگی؟ یہی جو آج ہو رہی ہے۔

دوسری (اور نہایت اہم) بات، جسے اس مقام پر سمجھ لینا ضروری ہے یہ ہے کہ جس "عقل" کے متعلق یہاں گفتگو ہو رہی ہے، وہ عقل کا وہ خام (UN-DEVELOPED) درجہ ہے جس میں وہ انسانی جذبات کے لئے بطور آلۂ کار کام کرتی ہے۔ اس عقل میں اور جذبات میں بس اتنا فرق سمجھو کہ جذبات، انسان کے دل میں ایک آرزو پیدا کرتے ہیں اور اس کی یہ عقل اس آرزو کے صحیح ہونے کے دلائل فراہم کرتی اور اس کے حصول کی تدبیریں سجھاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس عقل کو "عقلِ خود بیں" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں "عقلِ جہاں بیں" ہے جو اُس خاص فرد کے مفاد کو نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے مفاد کو دیکھتی ہے۔ یہ وہ تربیت یافتہ عقل ہے، جو وحی کی راہ نمائی میں کام کرتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر آئے گی۔ اس وقت ہم جس عقل کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں وہ "عقلِ خود بیں" ہے جو فردِ متعلقہ کے مفاد سے زیادہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کا علاج کیا ہے؟ عقل کا تقاضا انفرادی مفاد کا تحفظ ہے اور اس سے معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل کو چھوڑتے ہیں تو پاگل کہلاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اپنے مفاد کی حفاظت کرنے والی عقل کو چھوڑنا انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ لہٰذا کیا جائے تو کیا کیا جائے؟

تم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ تمہارے ہاں سرکاری ہسپتال کا کمپونڈر خلیق احمد، بڑا اچھا آدمی تھا۔ دن بھر مریض آتے رہتے۔ وہ انہیں قیمتی سے قیمتی دوائیاں (نسخوں کے مطابق تیار کر کے) نہایت خندہ پیشانی سے مفت دیتا رہتا تھا۔ اس میں امیر و غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ وہ دوائی دینے سے پہلے کبھی نہیں پوچھتا تھا کہ مریض کی جیب میں پیسے بھی ہیں یا نہیں؟ نسخہ تیار کرتے وقت کبھی نہیں سوچتا تھا کہ اس میں ایسی قیمتی دوائی کیوں ڈالی جائے؟

اس کے بعد میں نے سُنا کہ اسی خلیق احمد نے ملازمت چھوڑ کر چوک میں اپنی دوکان کر لی اور اب یہ عالم ہے کہ مریض درد سے کراہ رہا ہے لیکن اس کی نگاہ اس کی جیب پر ہوتی ہے کہ اس میں دوائی کی قیمت دینے کے لئے کچھ ہے بھی یا نہیں؟ وہی خلیق احمد جو پہلے امیر اور غریب میں کوئی تمیز نہیں کرتا تھا اور سب کو ایک جیسی دوائی دیتا تھا، اب مریض کی جیب کے مطابق دوائی دیتا ہے۔ اب اس میں وہ خوبیاں نہیں رہیں جو پہلے تھیں۔ بلکہ سُنا ہے کہ نسخوں میں قیمتی دوائیاں ڈالتا ہی نہیں۔

تم نے سوچا سلیم! کہ خلیق احمد میں اتنا بڑا فرق کیوں آگیا؟ اب اس کی وہ پہلی خوبیاں کہاں چلی گئیں؟ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی. جب وہ سرکاری ہسپتال میں تھا تو اس کے رزق کی ذمہ داری ہسپتال نے لے رکھی تھی' اس لئے وہ دن بھر بڑی خندہ پیشانی سے دوائیاں بانٹتا رہتا تھا. لیکن اب اسے اپنے اور اپنی اولاد کے تحفظِ ذات کی فکر خود کرنی پڑتی ہے. اب اسے اپنا رزق انہی دوائیوں سے پیدا کرنا ہے. اس لئے اب وہی خلیق' چوک کے دوکانداروں میں سے ایک دکاندار بن گیا.

تم نے دیکھا سلیم! کہ اگر انسان کے تحفظِ خویش کے اسباب و ذرائع کے فراہم کرنے کی ذمہ داری کوئی اور لے لے تو پھر انسان میں ذاتی مفاد پرستی کی جگہ دوسروں کے مفاد کا خیال نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے. تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ایسے لوگ بھی تو ہیں کہ خلیق کی طرح ان کی تنخواہیں بھی مقرر ہیں لیکن اس کے باوجود ناجائز طریقے سے روپیہ بٹورنے سے باز نہیں آتے! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ (خواہ شعوری طور پر انہیں اس کا علم ہو' یا نہ ہو) ایسے لوگوں کو یقین نہیں ہوتا کہ ان کی تنخواہ' ان کی عقل کے تقاضے کے مطابق' ان کی تمام عمر اور ان کی اولاد کے کامل تحفظ کے لئے کفایت کر سکتی ہے' اس لئے وہ زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتے ہیں. اگر انہیں یقین ہو جائے کہ ان کی اپنی اور اُن کے متعلقین کی حفاظت کی پوری پوری ذمہ داری کسی اور نے لے رکھی ہے تو اس کے بعد انہیں ناجائز طریقے سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی. میں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس اتنا کچھ ہے کہ وہ ان کی اور ان کی اولاد کے تحفظ کے لئے کافی سے زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہوسِ زراندوزی کی تسکین نہیں ہوتی. سو اوّل تو اس قسم کی ذہنیتیں (ABNORMAL) ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انہیں چین نہیں لینے دیتا. دوسرے یہ کہ اس قسم کی ہوس' غیر شعوری طور پر ہمارے معاشرتی اور معاشی نظام کا نتیجہ ہے جس میں کسی انسان کو کسی وقت بھی اپنے مستقبل کے متعلق پورا پورا اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا. یہی عدمِ اطمینان اور فقدانِ یقین ہے جس کی وجہ سے انسان اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے.

لہٰذا' دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں :-

ایک تو یہ کہ' ہر فردِ معاشرہ کی اپنی اور اس کے متعلقین کی ذات کی حفاظت کے لئے سامان و ذرائع (یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی) کی ذمہ داری کسی اور پر ہونی چاہیئے. اور

دوسرے یہ کہ اس ذمہ داری کے متعلق افرادِ معاشرہ کو پورا پورا یقین ہونا چاہیئے کہ اس میں کبھی کوتاہی

نہیں ہوگی۔ یہ سہارا کبھی دغا نہیں دے گا؛ لَا انْفِصَامَ لَهَا (یہ رسّی کبھی ٹوٹے گی نہیں)۔

اب یہ بات واضح ہے سلیم! کہ اگر کہیں ایسا معاشرہ قائم ہو جائے تو اس میں عقل کا وہ تقاضا خود بخود پورا ہو جائے گا جس کی خاطر وہ انفرادی مفاد کے تحفظ کے لئے اس طرح حیران و سرگرداں پھر رہی تھی اور اس مفاد کے حصول کے لئے جائز و ناجائز، سب کچھ کر رہی ہے۔ جب عقل اس طرح مطمئن ہو جائے تو انسانی معاشرے کی بیشتر خرابیاں خود بخود دُور ہو جاتی ہیں۔

قرآن اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اسے وہ "قیامِ صلوٰۃ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی نظام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) (نظامِ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے روکتا ہے)۔ ان دو الفاظ پر غور کرو سلیم! فحش کے عام معنی تو "حد سے تجاوز" کرنا ہیں لیکن اس کے ایک معنی "بہت زیادہ بخل" کے بھی ہیں چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (۲/۲۶۸)

شیطان تمہارے دل میں تنگ دستی کا خوف پیدا کر کے تمہیں بخل کی تعلیم دیتا ہے۔

یہاں "فحشاء" کے معنی بخل ہیں۔ یعنی دولت جمع کر کے اپنی ذات تک سمیٹ رکھنا۔

دوسرا لفظ منکر ہے جس کا مادہ نکر ہے۔ اس کے اہم معانی عقلِ فریب کار (INTELLIGENCE - MIXED WITH CUNNINGNESS) کے ہیں۔ تَنْھٰی کے معنی روکنا ہیں۔ نُھْیَۃَ عقل کو کہتے ہیں۔ یعنی خود بھی ایک مقام پر پہنچ کر رُک جانے والی اور دوسروں کو بھی روک دینے والی۔

لہٰذا، اَلصَّلٰوۃَ وہ نظامِ معاشرہ ہے جس میں افرادِ معاشرہ، دولت کو سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود رکھنے (بخل) اور عقلِ فریب کار کی تحریک پر دوسروں کو دھوکا دینے اور ان سے غیروں کا سا سلوک کرنے (منکر) سے رُک جائیں۔ اور یہ رُکنا عقل و بصیرت کے خلاف نہ ہو، بلکہ خود عقل کا تقاضا ہی یہ ہو جائے۔ یعنی عقل مطمئن ہو جائے کہ اس رُک جانے میں اس کا (تحفظِ ذات کا) فریضہ پورا ہو رہا ہے۔

لیکن یہ حصہ قرآنی نظام کا ایک گوشہ ہے۔ اس میں افرادِ معاشرہ ان تمام امور سے رُک جاتے ہیں جن سے انفرادیت کی انسانیت کُش ناہمواریاں وجود میں آتی ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ "اٰتُوا الزَّكٰوۃَ" ہے جس کے معنی نشو و نما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کے ہیں۔ یہ دونوں مل کر قرآنی نظام کا دائرہ مکمل کر دیتے ہیں۔ وہ نظام جس میں ہر فردِ معاشرہ عقلِ خود بیں کی نفسانفسی سے رُک کر، دوسرے افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما

کے اسباب و ذرائع فراہم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس میں عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس کے تقاضے بطریقِ احسن پورے ہو رہے ہیں۔ اس لئے اسے ناہمواریاں پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

تم نے سلیم! بی اے میں اکنامکس تو پڑھی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس کی رُو سے اشیائے استعمال کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک "بلامعاوضہ اشیاء" (FREE GOODS) اور دوسرے "بامعاوضہ اشیاء" (ECONOMIC GOODS) فری گڈس وہ ہیں جو ہر فردِ معاشرہ کے لئے بلامعاوضہ یکساں طور پر کھلے ہیں۔ مثلاً ہوا، سورج کی روشنی، پانی کے چشمے وغیرہ۔ اکنامک گڈس وہ ہیں جنہیں انسان خرید کر استعمال کرتا ہے۔ حیوانات کی دنیا میں اکنامک گڈس کا وجود ہی نہیں ہوتا سب فری گڈس ہوتے ہیں۔ یہ لعنت انسان کی دنیا پر ہی مسلط ہے کہ اس میں اشیائے خورونوش اکنامک گڈس میں شامل ہیں۔ قرآن جس نظامِ ربوبیت کا داعی ہے اس میں ضروریاتِ زندگی کا شمار فری گڈس میں ہوتا ہے۔ قرآن نے جو نقشہ جنت کا کھینچا ہے، قرآنی معاشرہ اس کا عکس ہوتا ہے۔ "ابلیس" (انفرادی مفاد کے جذبہ) کے فریب میں آنے سے پہلے "آدم" جس جنت میں تھا اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ وہاں آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) تم جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ پیو۔ اس میں اشیائے خورونوش پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ سب فری گڈس میں شامل ہیں۔ صرف اشیائے خورونوش ہی نہیں بلکہ تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی (لباس، خوراک، مکان) تمام افرادِ معاشرہ کے لئے میسر ہوں گی۔ جنتِ آدم کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝ (۱۱۸ــ ۲۰/۱۱۹) "تیرے لئے اس میں وہ سب کچھ میسر ہے جس سے تو نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا، نہ پیاسا رہے گا نہ دھوپ میں"۔ لیکن اگر تو اس سے نکل گیا تو تجھے ان چیزوں کے حصول کے لئے بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی (فَتَشْقٰى)۔

احتیاطاً یہاں اس چیز کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس معاشرے میں یہ چیزیں مفت نہیں مل جائیں گی۔ جنت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں مُفت خوروں (مترفین) کا کوئی کام نہیں۔ مترفین صرف اس معاشرہ زندہ رہ سکتے ہیں جس میں معاشرتی ناہمواریاں ہوں اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خون پر پرورش پائے۔ "جنت" (قرآنی معاشرے) میں سعی و عمل ہر شخص کے لئے ہوگا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وہاں کا اٹل قانون ہوتا ہے۔ وہاں ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائے گا۔ لیکن کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔ وہ بھی محروم نہیں رہیں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اس نظام کے نتائج

اس قدر یقینی اور محکم ہوں گے کہ اس باب میں اضطراب و تذبذب کی کہیں گنجائش نہیں ہو گی۔ یہ ہے وہ نظام جس میں عقل اپنے فریضے کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے معاشرے میں فساد پیدا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے انسان اخلاقی ضوابط کا پابند رہ سکتا ہے یعنی ایک متوازن نظامِ ربوبیّت کا قیام جس میں ضروریاتِ زندگی فری گڈس میں شامل ہوں (یہ اس نظام کی ابتدائی خصوصیت ہے آگے بڑھ کر یہ نظام افرادِ معاشرہ کی تمام صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا ذمہ دار بنتا ہے)۔

جب ضروریاتِ زندگی فری گڈس میں شامل ہوں یا وہ روپے پیسے سے خریدنے کی بجائے اشیاء کے مبادلے (BARTER SYSTEM) سے حاصل ہو جائیں تو اس وقت معاشرے کا کیا نقشہ ہوتا ہے، اس کا ہلکا سا تصور ہماری گاؤں کی زندگی سے ہو سکتا تھا۔ آج کے گاؤں کی زندگی سے نہیں جو اس باب میں اب شہروں سے پیچھے نہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے کی گاؤں کی زندگی سے۔ تم نے سلیم! گاؤں کی وہ زندگی نہیں دیکھی۔ اس میں گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ ہم تو صرف نمک کے لئے شہر والوں کے محتاج ہیں اور بس۔ بات تھی بھی ٹھیک۔ غلّہ (گیہوں، چاول، دالیں) ان کے گھر کا ہوتا تھا۔ دودھ، گھی، مکھن، سب کچھ گھر کا۔ گڑ، شکر کا میٹھا بھی گھر کا۔ ساگ پات (سبزی، ترکاری) بھی خود پیدا کردہ۔ خربوزہ، ککڑی، موسم کے عام پھل (آم، جامن) بھی اپنے ہاں کے۔ تیلی کے ہاں سرسوں بھیجی اور تیل پلوا لیا۔ کپاس کات کر سُوت جولاہے کے ہاں بھیجا، کپڑے بن گئے۔ ڈھور ڈنگر مر گئے تو چمار نے کھال صاف کر دی اور موچی نے جوتے بنا دیئے۔ کمہار نے وہیں سے مٹی لی اور ضروریات کے برتن تیار کر دیئے۔ بڑھئی نے درخت کاٹا اور لکڑی کا سامان تیار کر دیا۔ تیلی، موچی، لوہار، بڑھئی، جولاہے، دھوبی، نائی کسی کو ٹکہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ہر فصل میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ اس لئے جو کچھ ایک زمیندار کے ہاں میسّر ہوتا تھا وہ سب کچھ ان کے ہاں بھی موجود رہتا تھا۔ زمیندار ان کی ضروریاتِ زندگی کا سامان بہم پہنچا دیتے تھے اور یہ ان کی ضروریات کی چیزیں تیار کر دیتے تھے۔ یہ تھا نقشہ سلیم! آج سے تیس چالیس سال قبل کے گاؤں کا۔ اس زندگی میں (بالعموم) کوئی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ کوئی "بے ایمانی" نہیں کرتا تھا۔ اس لئے کہ جھوٹ بولنے (یا بد دیانتی کرنے) میں "انہیں فائدہ کچھ نہیں تھا۔" انسان کی زندگی کی ہر ضرورت پوری ہوتی جاتی تھی (اور اس کا انہیں پختہ یقین تھا کہ ایسا ہوتا رہے گا) اور زائد از ضرورت چیز کا مصرف کچھ نہیں تھا۔ تیلی کے ہاں سرسوں بھیجی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ تیل کی چوری کرتا۔ اس کے اپنے ہاں (انہی زمینداروں کی دی ہوئی) سرسوں موجود تھی جو اس کی ضرورت کے لئے کافی تھی اور زائد از ضرورت کا مصرف

کچھ نہیں تھا. یہ تھی وجہ جو اس زندگی میں لوگ عام طور پر سچے اور دیانت دار ہوتے تھے. وہ زندگی بڑے اطمینان اور سکون کی تھی جس میں ہر شخص کو ایک دوسرے پر بھروسا تھا. لیکن اس کے بعد جب وہی اشیائے ضرورت پیسوں سے بکنے لگیں تو اس زندگی پر بھی وہ تمام لعنتیں (رفتہ رفتہ) مسلّط ہو گئیں جو تمہاری شہری زندگی کا طرۂ امتیاز ہیں. اب تمہارا وہی زمیندار، من بھر کپاس شہر میں لا کر دس روپے میں فروخت کرتا اور دس روپے کی پاؤ بھر ململ خرید کر واپس جاتا ہے (وقس علی ھٰذا). اب تیلی بھی تیل نکالنے کی اُجرت پیسوں میں طلب کرتا اور تیل چوری بھی کرتا ہے. کیونکہ اب زائد از ضرورت تیل کے گاہک موجود ہیں. اسی طرح رفتہ رفتہ گاؤں کا سچ جھوٹ سے اور دیانت داری، بددیانتی سے بدلتی چلی گئی. تا آنکہ آج شہر اور گاؤں دونوں میں ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا نقشہ پیدا ہو گیا. (اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم مشینوں سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے پرانی دیہاتی زندگی کی طرف لوٹ جائیں. جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں. وہ اگلی سطروں سے واضح ہو جائے گا).

میں نے ایک چھوٹی سی مثال سے تمہیں سمجھایا ہے کہ اخلاق کی پابندی کس طرح نظامِ معاشرہ سے وابستہ ہوتی ہے. قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں افرادِ معاشرہ کو جھوٹ بولنے اور بددیانتی کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے. اس طرح وہ اخلاقی ضوابط کے پابند ہو جائیں گے. اور یہ ہو گا ایک متوازن نظامِ ربوبیت کے قیام سے.

اخلاق کا مادّہ خلق (خ. ل. ق) ہے. خلق کے معنی کسی چیز کا اندازہ یا پیمانہ مقرر کرنا ہیں جس سے توازن قائم ہوتا ہے. خلیق کہتے ہی متوازن کو ہیں. قرآن نے جب نبیِ اکرمؐ کے متعلق فرمایا تھا کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (۶۸/۴) تو اس سے مطلب یہی تھا کہ انفرادی طور پر حضورؐ کی ذات میں انسانی صلاحیتیں پورے پورے توازن کے ساتھ موجود ہیں اور اجتماعی طور پر حضورؐ نے اس نظام کو متشکل فرمایا ہے جس سے معاشرہ میں پورا پورا توازن ہے.

بہرحال ہم نے دیکھ لیا کہ اخلاقی ضوابط کی پابندی وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتی. اس کے لئے نظامِ ربوبیت کا قیام ضروری ہے. اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل کس طرح ہو سکتی ہے ؟

یہ ظاہر ہے کہ

۱. عقل اپنے فریضے (یعنی تحفظِ خویشس کے لئے اسباب و ذرائع کی فراہمی) کی طرف سے اسی صورت میں مطمئن

ہو سکتی ہے جب اُسے تحفّظِ خویش کا یقین ہو جائے۔

۲. عقل کو اس امر کا یقین اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ نظامِ معاشرہ افراد کے تحفظِ خویش کے اسباب و ذرائع فی الواقع بہم پہنچا رہا ہے۔ خالی وعدے اس اطمینان کا باعث نہیں بن سکتے خواہ وہ کتنے ہی حسین و جاذبِ نگاہ کیوں نہ ہوں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ نظام اس قسم کے یقین دلانے کی پوزیشن میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ اچھی طرح قائم ہو جائے اور اس کے بوئے ہوئے بیج پھل دینے لگ جائیں۔

یہ ہے سلیم! اصل دشواری۔ عقل اس بھروسے پر کہ "بیج بویا ہے پھل لگنے دو" اپنا مسلک چھوڑ نہیں سکتی۔ اور نظام پھل لگنے سے پہلے عقل کا اطمینان کرا نہیں سکتا۔ لہٰذا، بات کیسے بنے؟ اس نظام کی ابتدار کیسے ہو؟ تخم ریزی میں عقل دیکھتی ہے کہ کچھ ملنا تو ایک طرف، جو کچھ پاس تھا وہ بھی مٹی میں مل رہا ہے۔ (عقل صرف مفادِ عاجلہ کو دیکھ سکتی ہے)۔

اس سے ظاہر ہے کہ آغازِ کار عقلِ خود بیں کی رُو سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا اس کے سوا کوئی اور قوت بھی ہے جس کی رُو سے اس نظام کی ابتدار ہو سکتی ہے۔

یہی اصل سوال ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے دو اہم مناہجِ زندگی کی تفریق شروع ہوتی ہے یہیں سے زندگی کے دو مختلف فلسفے سامنے آتے ہیں۔ مغرب کے مادیّین (POSITIVISTS MATERIALISTS) کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا صرف یہی محسوسات کی دنیا ہے۔ مادّی عناصر کی باہمی ترکیب سے کسی نہ کسی طرح زندگی اُبھر آئی اور زندگی نے ارتقائی منازل طے کر کے انسان میں عقل پیدا کر دی۔ لہٰذا، عقل کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور ذریعۂ علم نہیں۔

دوسرا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ دنیا صرف محسوسات کی دُنیا نہیں۔ بلکہ اس سے ماورار اور دنیا بھی ہے۔ زندگی مادّہ کی پیداوار نہیں۔ اس کا سرچشمہ مادّہ سے ماورار کہیں اور ہے۔ یہ سرچشمہ وہ ہے جہاں سے خود مادّہ کو اس کا وجود عطا ہوا ہے، اس لئے انسان کے لئے ذریعۂ علم صرف عقل نہیں۔ عقل کے ماورار ایک اور سرچشمۂ علم ہے جسے "وحی" کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ابلیس (عقلِ خود بیں) نے آدم کو اس جنّت سے نکالا ہے جس میں اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفالت خود بخود ہو رہی تھی (یعنی خدا کا نظامِ ربوبیّت) تو آدم سے یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی جنّت کو دوبارہ حاصل کر لو (یعنی پھر سے اس نظام کو قائم کر لو) تو عقلِ خود بیں کی رُو سے

ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ماورائے عقل ہدایاتِ آسمانی کی ضرورت ہو گی فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی (میری طرف سے راہنمائی ملتی رہے گی)۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ (پس جو کوئی اس ضابطۂ قوانین کے مطابق نظام قائم کرے گا) فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی (تو وہ نہ ان چیزوں کی تلاش میں مارا مارا پھرے گا اور نہ ہی اسے ان کے حصول کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ (لیکن جو اس نظام سے اعراض برتے گا) فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی (۲۰/۱۲۴)۔

یہ بالکل کھلے ہوئے اور واضح راستے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد۔ مخالف سمتوں میں جانے والے۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عقلِ خود بیں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صرف فردِ متعلقہ کی حفاظت کا انتظام کرے۔ لیکن وحی کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے جو افراد سے بلند ہے۔ اس کے نزدیک تمام نوعِ انسانی کے افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر انسان اُس سے ایک جیسے فاصلے پر (EQUIDISTANT) واقع ہوا ہے۔ اس میں نہ رنگ و خون کی تفریق ہے، نہ ملک و قوم کی تمیز۔ اُس کے پیشِ نظر ربّ العالمینی (ربوبیّتِ نوعِ انسانی) ہے، نہ کہ کسی خاص فرد یا خاص قوم کی ربوبیّت۔ یہ ہے فرق عقلِ خود بیں کی راہ نمائی اور وحی کی راہ نمائی میں۔ وحی چونکہ اسرارِ حیات کی شارح ہوتی ہے اس لئے وہ بتاتی ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ افراد کی تقسیم خود انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔ وہ اس حقیقت کو بطور مسلّمہ پیش کرتی ہے اور جو اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں اُن سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ عالمگیری نظامِ ربوبیّت کو ایک حقیقتِ ثابتہ سمجھتے ہوئے اس کی عملی تشکیل کے لئے گامزن ہو جائیں۔ یہاں اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن اس حقیقت کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا ہے اور انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ (جذبات سے الگ ہٹ کر) علم و بصیرت اور غور و تدبّر سے اس کی صداقت پر یقین کرے۔ جب انسانی عقل اس حقیقت کو تسلیم کر لیتی ہے تو یہ "خود بیں" سے "جہاں بیں" ہو جاتی ہے۔ یعنی "عقل کی راہ نمائی میں"۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اس نظام کی ابتدا کرنے والے (اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ) اس نظام کے نتائج دیکھے بغیر ان کے یقینی ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔ اسے "ایمان بالغیب" کہتے ہیں (یعنی اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان)۔ غور کیجئے۔ قرآن کی ابتدا "ربّ العالمین" (ربوبیّتِ عامہ) سے ہوتی ہے اور اس کے بعد ایمان بالغیب (یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲/۳)) کا مطالبہ۔ اس لئے کہ کسی نظام کے نتائج دیکھے بغیر اس کے قیام کے لئے جانکاہ مشقتیں اٹھانا اور جگر پاش مصیبتیں برداشت کرنا اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (PIONEERS) کے ایمانِ محکم کے بغیر ممکن نہیں۔ چونکہ اس نظام کے قیام میں

مترفین (دوسروں کی کمائی پر جینے والوں) کو اپنی موت نظر آتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ خارجی مشکلات ہوتی ہیں۔ دوسری طرف عقل خود ہیں قدم قدم پر عناں گیر ہوتی ہے کہ اپنی جان کیوں جوکھوں میں ڈال رہے ہو۔ خارجی اور داخلی مخالفتوں کے اس صبر آزما ہجوم میں، یہ صرف ان مُؤمِنِيْنَ الصَّابِرِيْن کے کوہ شکن ایمان کی قوت کا کرشمہ ہوتا ہے کہ ان کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہیں آنے پاتی۔ ان حوصلہ شکن اور ہمت آزما مراحل کے بعد، یہ نظام متشکل ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے درخشندہ نتائج اور تابندہ ثمرات اس طرح گوہر بار ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ جوق در جوق اس کے سایہ عاطفت میں آنے شروع ہو جاتے ہیں (يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا ۵ (۱۱۰/۲))۔ اس طرح یہ نظام عالمگیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کے متشکل اور اس کے نتائج برآمد ہو جانے کے بعد وہی عقل خود بیں جو پہلے اس مسلک کو اپنے تقاضوں کا حریف اور اپنے مفاد کا نقیض سمجھتی تھی، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ جس نظام کو وہ اپنی تنگ نگہی اور کوتاہ دامنی کی وجہ سے "مفادِ غیر" کے تحفظ کا نظام سمجھ رہی تھی، وہ اس کے اپنے مفاد کا ایسا کفیل ہوتا ہے کہ وہ خود اس قسم کا یقینی انتظام کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اب وہی ایمان جو پہلے ایمان بالغیب تھا، علیٰ وجہ البصیرت ایمان بن جاتا ہے۔ اس طرح عقل اور ایمان ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ یہی وہ طریق کار ہے جس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے ؎

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیز دہ

جب اس طرح انسان دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کسی ایک فرد کے اندر محبوس نہیں بلکہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہے تو وہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اس کا پھیلاؤ صرف عرض (SPACE) ہی میں نہیں بلکہ طول (TIME) کی سمت بھی ہے۔ اس لئے جس چیز کا نام "موت" رکھا جاتا ہے وہ انقطاعِ حیات نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ لیتا ہے کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل آگے بڑھے جا رہی ہے۔ جسے موت کہا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جوئے رواں، دامنِ صحرا سے صحنِ گلستان میں داخل ہو کر باغ کی فصیل کے باہر کھڑے ہونے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ لہٰذا، جہاں وحی، مفادِ خویش کی جگہ "ربّ العالمینی" (ربوبیتِ عامہ) کا تصور دیتی ہے اور اس طرح نگاہ کا رُخ فرد (INDIVIDUAL) سے انسانیت (HUMANITY) کی طرف پھیر دیتی ہے، وہاں وہ زندگی کو مادی عناصر کی چار دیواری سے نکال کر اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے آگے لے جاتی ہے۔ بنا بریں جس چیز کا نام انسانی نشوونما (سامانِ زیست) رکھا جاتا ہے وہ صرف جسم کی پرورش تک ہی محدود نہیں

رہتی. بلکہ جسم سے آگے بڑھ کر اصلِ حیات (نفس یا ذات) کی نشوونما کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے. لہٰذا نظامِ ربوبیت میں انسان کی طبیعی زندگی کے اسباب و ذرائع کی فراہمی کے ساتھ ساتھ نفسِ انسانی کے نشوو ارتقاء کا سامان بھی بہم پہنچتا رہتا ہے.

یہ ہے سلیم! وہ نظام جس کے اندر انسان خود بخود اخلاقی ضوابط کی پابندی اختیار کر لیتا ہے. اس نظام کے بغیر اخلاقی ضوابط کی پابندی کی کوئی اور شکل نہیں. انسان نے اس کا خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے. اس کی پانچ ہزار سالہ زندگی کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ تنہا اخلاقی مواعظ انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند نہیں بنا سکتے، وَالْعَصْرِۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍۙ (۱-۲/۱۰۳). زمانے کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ انسان تنہا عقل کی رُو سے بنائے ہوئے نظام کے اندر کبھی کامیابی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا. اسے اخلاقی ضوابط کا پابند بنانے اور اس کی مکمل نشوونما کرنے کا ایک ہی طریق ہے یعنی وحی کے مطابق نظامِ ربوبیت کا قیام (اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یہ وہ نظام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کی تعمیری نشوونما میں مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں (وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ) اور یہ لوگ اس پروگرام کو محض مفادِ عاجلہ کی خاطر اختیار نہیں کرتے کہ تھوڑے سے عرصے کے بعد اسے چھوڑ دیں. وہ اسے اپنی ساری زندگی کا مسلسل پروگرام بنا لیتے ہیں (وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۠ (۱۰۳/۳). یہی وہ نظام تھا جسے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ نے قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متشکل فرمایا تھا. اس نظامِ زندگی کے سوا انسانی نشوونما کا کوئی نظام نہیں. جس طرح کائنات میں ایک قانون کے سوا دوسرا قانون نہیں (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) قانونِ خداوندی کی رُو سے نظامِ حیات ایک ہی ہے، دو نہیں. وحدتِ قانون (UNITY OF LIFE) ہی وہ بنیاد ہے جس پر ساری کائنات کا دارومدار ہے. اس لئے انسانی معاشرے کا نظام (اَلدِّیْن) بھی ایک ہی ہو سکتا ہے. وحدتِ قانون کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی مثل دوسرا قانون نہ ہو. سلیم! ذرا پوچھو دنیا کے علمائے فطرت (SCIENTISTS) سے. وہ تمہیں بتائیں گے کہ کس طرح سائنس کی ساری عمارت اسی ایک اصول پر قائم ہے. یہی اصول دین میں بھی کارفرما ہے. یعنی نظامِ زندگی ایک ہے. اس کی مثل دوسرا نہیں. اسی لئے قرآن نے یہ چیلنج دیا ہے کہ اس کے پیش کردہ نظام کی مثل کوئی دوسرا نظام مرتب کر کے دکھاؤ.

یہ ہے سلیم! انسان کو صحیح راہ پر چلانے کا طریقہ. یعنی اس نظام کا قیام جس میں ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی

اور سامانِ نشوونما کی ذمہ داری خود نظام کے سر پر ہو۔ جس معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا، کسی ایک فرد کی صلاحیتیں بھی کامل طور پر نشوونما پانے سے رُک گئیں، وہ معاشرہ انسانوں کو اخلاقی ضوابط کا پابند نہیں بنا سکتا۔ ساری دنیا نے آزما کر دیکھ لیا۔ خود مسلمان بھی تیرہ سو سال سے دیکھ رہا ہے۔ نظامِ ربوبیت کے بغیر اخلاقی پابندی ناممکن ہے۔ اگر عقلِ خود بیں کو زبردستی اخلاقی ضوابط کی کسی ایک شق کا پابند بنا بھی دیا جائے تو وہ دوسری طرف سے سرک کر نکل جانے کی راہیں تلاش کرے گی۔ لہٰذا سلیم! تمہاری مقدس آرزوئیں، واعظ کے دل پذیر نصائح، حکومت کی جبری تدابیر، سب بے کار ہیں۔ جب تک عقل کو اپنے تقاضوں (تحفظِ خویش) کے پورے ہو جانے کا کامل یقین نہیں آ جاتا وہ اخلاقی مواعظ پر کان دھر ہی نہیں سکتی۔ قرآنی حکومت سے مراد، اس نظامِ ربوبیت کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔

اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی است

لیکن اس سے مفہوم صرف "روٹی" کا مہیا کر دینا نہیں۔ مقصودِ حیات اس سے آگے ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ عقل کی ایک سطح وہ ہے جو صرف فردِ متعلقہ کے مفاد کی فکر کرتی ہے (اسے عقلِ خود بیں کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں وہی عقل، انسانیت کے مفادِ کُلی کو سامنے رکھتی ہے (اسے عقلِ جہاں بیں کہا جاتا ہے)۔ یعنی وہ عقل جو وحی کی روشنی میں چلتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خط بند کرنے سے پہلے "عقل اور وحی" کے باہمی تعلق کے متعلق کچھ مختصراً لکھ دوں تاکہ اس باب میں تمہارے دل میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔

انسان کی ایک دنیا تو وہ ہے جس میں اسے خارجی کائنات (OUTER UNIVERSE) سے کام پڑتا ہے۔ اشیائے کائنات کی ماہیت کا معلوم کرنا، قوانینِ فطرت کا مطالعہ، فطرت کی قوتوں کی تسخیر، فرش کے ذرّوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک تمام اشیائے فطرت کے خواص و اثرات کا علم حاصل کرنا۔ ان میں ربط و ضبط پیدا کر کے جدید اشیاء کا وجود میں لانا۔ اس سے آگے بڑھے تو خود انسان کا مطالعہ بہ حیثیت ایک خارجی شے (OBJECTIVE STUDY) کے۔ اس کی طبعی ساخت و پرداخت۔ اس کے رجحانات و میلانات۔ اس کے ماضی کی تاریخ۔ اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے اسباب۔ اس کے حال کے مسائل (PROBLEMS) وغیرہ وغیرہ۔ کائنات کے گوشے ایسے ہیں جن میں انسانی علم و عقل، تجربہ اور مشاہدہ اس کی راہ نمائی کے لئے

کافی ہوتا ہے۔

لیکن زندگی کا ایک گوشہ اور ہے۔ یہ گوشہ وہ ہے جس میں انسان کا معاملہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ اسے انسانوں کی معاشرتی یا تمدنی یا اجتماعی زندگی کہا جاتا ہے۔ زندگی کے اس گوشے میں ایک انسان کے مفاد دوسرے انسانوں سے ٹکراتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کی عقلِ خود بیں کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اس لئے اس میدان میں عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS) شروع ہوجاتی ہے۔ یہ ہے وہ گوشہ جس میں اگر انسانی عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو قدم قدم پر تصادم شروع ہوجاتا ہے اور تمام معاشرہ میں فساد برپا ہوجاتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں "عقلِ خود بیں" کو "ابلیس" کہا جاتا ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ جب انسانوں کے معاملات سامنے آئیں تو عقل کو وحی کے تابع رکھو۔ وحی کے اصول انسانوں کے مفاد میں موافقت پیدا کر کے' ان کے باہمی تصادم کو مٹا دیتے ہیں۔ جب عقل کو اس طرح وحی کے تابع رکھا جائے (یا یوں کہو کہ عقل سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے)' تو عقل کی آنکھ حقیقت کو دیکھ لیتی ہے اور اس کے بعد اسے نظر آجاتا ہے کہ اس طریقِ عمل سے معاشرہ میں فساد برپا کئے بغیر' اس کے مفاد کا تحفظ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح وحی کی روشنی میں انسانی عقل' خود انسان کی داخلی دنیا کا مطالعہ بھی اسی طرح (OBJECTIVELY) کر لیتی ہے جس طرح وہ خارجی دنیا کا مطالعہ کرتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان اشارات سے تم سمجھ گئے ہوگے کہ عقل کے یہ مختلف گوشے کیا ہیں؟ اور اس کا صحیح مقام کیا؟ وہ کون سی عقل ہے جس سے کام لینے کی اس قدر تاکید کی جاتی ہے اور وہ کون سی جسے آزاد چھوڑنے سے اس طرح روکا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' اقبالؒ "عقلِ بے باک" کو عقلِ خود بیں کہہ کر پکارتا ہے اور اس عقل کو جو وحی کے تابع کام کرتی ہے "عقلِ جہاں بیں" سے تعبیر کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔

میں نے اس خط میں صرف "زر" اور "زمین" سے پیدا ہونے والے مفاسد کا ذکر کیا ہے۔ نظامِ

ربوبیت میں زن "(SEX)" سے پیدا ہونے والے مفاسد کا علاج کس طرح ہو جاتا ہے' اسے کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ یہ خط بہت لمبا ہو گیا ہے۔ مجھے بالآخر دنیا میں کچھ اور کام بھی تو ہیں۔ تمہاری تو یہ حالت ہے کہ

مہرباں ساقیٔ محفل کو جو دیکھا ہے روش
یہی ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہنچے

اور یہاں یہ عالم کہ

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اس لئے تمہارے سب تقاضے بیک وقت کس طرح پورے کئے جا سکتے ہیں؟

اچھا' خدا حافظ!

اپریل ۱۹۵۴ء

پندرہواں خط

اِس دَور میں دیانتدار بننا حماقت ہے

ہاں سلیم! مجھے اس انقلاب کا علم ہے اور تم سے بھی زیادہ علم جو راشد صاحب میں واقع ہوا ہے۔ ان کی تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی بھی میرے سامنے ہے اور بعد کی بھی۔ وہ ہندوستان میں بہترین دیانتدار، قابل، محنتی اور فرض شناس آفیسر تسلیم کئے جاتے تھے۔ انگریز تو ایک طرف، ہندو تک بھی ان کی دیانت اور صداقت کے معترف تھے۔ پاکستان آئے تو قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی خدمت کا بے پناہ جذبہ دل میں لئے ہوئے۔ میں بھی اتفاق سے اسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا جس میں وہ کراچی آئے تھے۔ راستہ بھر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں پاکستان سے عشق تھا۔ اس کی تشکیل پر ان کی جبینِ نیاز میں، بارگاہِ ایزدی میں، شکر لنے کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس پر اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کام تو میں نے پہلے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے لیکن اب تو، یہ کام کا کام اور جہاد کا جہاد ہے۔ اب اس محنت میں کچھ اور ہی لذت ملے گی۔ غرضیکہ سارا سفر انہی باتوں میں کٹا۔ ان کے ذہن میں بڑی اسکیمیں تھیں کہ اب یہ کیا جائے گا اور وہ کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق کام شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں اس کی مثال قائم کر دی کہ محنت اور دیانت، فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری، جذبۂ خدمت اور جنونِ بہبودِ ملت کسے کہتے ہیں۔ جن حالات میں یہاں دفاتر کے قیام کی ابتدا ہوئی ان کا تمہیں علم ہے۔ نہ میز تھا نہ کرسی۔ نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ نہ کوئی خاص عمارت تھی نہ کمرے۔ کسی کو برآمدے میں جگہ ملی ہے تو وہیں بیٹھ گیا۔ نہیں تو باہر درخت کے سائے میں خیمہ (TENT) لگا لیا۔ رہنے کے لئے جگہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ راشد صاحب اس زمانے میں ڈائریکٹر تھے۔ (اس زمانے کے ڈائریکٹروں کی طرح نہیں تھے کہ ابھی کل کلرک تھے اور آج ڈائریکٹر بن گئے)۔ اس زمانے

میں آئی سی ایس کے کافی سینئر افسر ایسی آسامیوں پر تعینات ہوا کرتے تھے۔ وہ نئی دہلی میں یوں سمجھو کہ ایک محل میں رہتے تھے۔ یہاں انہیں ایک فلیٹ میں ایک کمرہ مل سکا تھا جس میں کل سامان ایک چارپائی تھا۔ انہوں نے چارپائی پر بیٹھے سولہ سولہ گھنٹے روزانہ کام کیا! اور نہایت خندہ پیشانی سے کام کیا۔ ان کا تمام سامان دہلی سے آنے والی گاڑی میں جل گیا اور گھربار مشرقی پنجاب میں لٹ گیا۔ لیکن ان کی زبان پر شکایت کا ایک حرف تک نہ آیا۔ گورنمنٹ نے کئی بار ان لوگوں سے فہرستیں مانگیں جن کا اس طرح نقصان ہوا تھا لیکن انہوں نے ایک سوئی تک کا مطالبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مکان کے بدلے میں کوئی مکان بھی الاٹ نہ کرایا۔ جب بھی اس کا ذکر آتا تو وہ مسکرا کر کہہ دیتے کہ مجھے تو اللہ نے پھر بھی بہت کچھ دے رکھا ہے یہ انہیں ملنا چاہیئے جن بچاروں کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ اس آٹھ نو سال کے عرصہ میں ایسی ایسی آسامیوں پر تعینات رہے جن پر اوروں نے لاکھوں روپے بنا لئے تھے۔ لیکن ان کی یہ حالت کہ کیا مجال جو دفتر کی روشنائی سے نج کی چٹھی تک بھی لکھی ہو۔ ارباب بست وکشاد کو ان کی دیانت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جہاں لوٹ کھسوٹ کا اندھیر مچتا وہاں انہیں پوسٹ کر دیا جاتا اور وہ چند ہی دنوں میں حالات سنوار دیتے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یوں حالات سنوارنے سے خود راشد صاحب کے ساتھ کیا ہوتا؟ تم از خود شاید اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔ اس لئے کہ ان امور کا تعلق "رموزِ سلطنت" سے ہے جنہیں تمہارے جیسا "گدائے گوشہ نشیں" سمجھ نہیں سکتا۔ تم جانتے ہو کہ اتنے عرصہ کے حالات کی خرابی سے اب دفاتری کاروبار کے چلنے کی صورت کیا ہو چکی ہے ــــ کوئی معاملہ ہو ــــ اس میں حق دار اور غیر حقدار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو شخص رشوت دینا چاہتا ہو، جو اثر پیدا کر سکے، جو کہیں سے سفارش لا سکے، جو اوپر سے اشارہ کرا سکے، فیصلہ اس کے حق میں ہو جاتا ہے۔ یہ یہاں کے کاروبار کا عام نہج ہے۔ ایسا عام کہ یہ گویا ایک مسلّمہ طریق بن چکا ہے۔ اب راشد صاحب کی یہ کیفیت کہ رشوت دینے والا ان کی کوٹھی کے پاس تک نہ پھٹک سکے۔ ہم عصر افسروں میں سے ایک ایک نے سفارش کر کے دیکھ لیا۔ وہاں کسی کی سفارش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈروں نے (جو رفتہ رفتہ سفارت اور وزارت کی کرسیوں تک بھی جا پہنچے ہیں) اپنے "حکمنامے" بھیج کر ان کے نتائج دیکھ لئے۔ اربابِ حل وعقد نے اپنے "اشاروں" کی ناکامی کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک زبان سے ان کی دیانت کی تعریف کرتا لیکن دل سے چاہتا کہ یہ کانٹا کسی طرح بیچ میں سے الگ ہو تو ان کے کاروبار میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہمعصر افسروں کو (جو بددیانت بھی تھے اور نالائق بھی، کاہل بھی اور کام چور بھی) اس کا حسد کہ یہ اپنی دیانت اور محنت کی بناء پر عوام میں مقبول کیوں ہے۔

لہٰذا' وہ بھی چاہتے کہ انہیں کس طرح نیچے گرا دیا جائے۔ جب کسی کی مخالفت میں اتنے عناصر یک جا جمع ہو جائیں تو ہمارے معاشرہ میں محض دیانت اور محنت کس طرح اس کی حفاظت کر سکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ پولیس نے چار بازاری غنڈوں کو اپنے ساتھ ملایا اور راشد صاحب کے خلاف رشوت کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ راشد صاحب کو اس کا زعم تھا کہ تمام افسرانِ بالا اور اربابِ حل و عقد اُن کی دیانت سے باخبر ہیں۔ وہ ان کے کہنے پر بیسیوں مرتبہ جلتی آگ میں کود سے اور وہ کچھ کر کے دکھایا جو کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ دو چار آدمیوں کی شرارت ان کا کیا بگاڑے گی؟ لیکن تم یہ سُنکر حیران ہو گے کہ ان سب نے ایک دم آنکھیں پھیر لیں۔ اور راشد صاحب نے چند ہی دنوں میں محسوس کر لیا کہ اس تصادم میں وہ میدان میں بالکل تنہا کھڑے ہیں۔ چنانچہ ان پر چاروں طرف سے بلاؤں نے ہجوم کر دیا۔ ملازمت سے معطل (SUSPEND) ہو گئے تو روٹی تک کے لالے پڑ گئے۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہزاروں روپے درکار تھے' وہ کہاں سے آتے؟ جب کُرسی سے الگ ہوئے تو قریب ترین دوستوں اور ماتحتوں نے رسمی ملاقات تک چھوڑ دی۔ "رشوت کے الزام" سے معاشرہ کی نظروں میں خود بخود مجرم قرار پا گئے اور ساری عزت اور شہرت خاک میں مل گئی۔ وہ جدھر سے نکلتے لوگ ان سے آنکھیں چرانے۔ حتیٰ کہ انہیں یہ بھی محسوس ہونے لگ گیا کہ اگر کل کو اس کی نوبت آ گئی تو شاید کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملے۔

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں گھرے ہوئے راشد صاحب اس شام میرے ہاں آئے تھے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ان کی پریشانی اسی سے ظاہر ہے کہ وہ پہلے بہت کم سگریٹ پیتے تھے لیکن اب کش پر کش لگائے چلے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو میرے دل میں ان کے لئے کتنا احترام ہے اس لئے میری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں اور ہوتی کیوں نہ' جب میں جانتا تھا کہ وہ کس قدر مظلوم اور بیگناہ ہیں۔ لیکن میرے لئے ان کی مصیبت سے کہیں زیادہ پریشان کُن صدمہ کا باعث ان کا وہ ردِّ عمل تھا جو ان حالات کے خلاف ان کے دل سے اُبھر رہا تھا۔ انہوں نے پورے جوش اور شدت سے اپنی داستان کو دہرایا اور ایک ایک شخص نے (جس پر انہیں اس قدر بھروسا تھا) ان سے جس طرزِ عمل کا ثبوت دیا' اسے اس لہجہ سے بیان کیا جس میں مایوسی اور رنج سے کہیں زیادہ غصہ اور انتقام کی جھلک پائی جاتی تھی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کس قدر زخمی دل کی چیخ و پکار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے جگر کے پار ہوتا جا رہا تھا جب ان کے جذبات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا تو میں نے کچھ کہہ کر انہیں تسلی دلانے

کی کوشش کی. میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹوک کر کہا کہ

معاف کیجئے پرویز صاحب! آپ ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں. میں اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دیانت داری اور حق و صداقت کے لئے اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں. اس سکہ کا اس بازار میں چلن ہی نہیں. انہیں اپنا اصول بنا کر دنیا میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا. میری زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے ہے. میں نے پاکستان کے لئے' مسلمانوں کے لئے اور ان "بڑی بڑی سرکاروں" کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں. لیکن مجھے اس دیانت و صداقت' اس محنت اور جاں فشانی کا صلہ کیا ملا؟ یہی کہ جگہ جگہ کے کتے میرے پیچھے چھوڑ دیئے گئے اور جن کی خاطر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے' ان میں سے کسی میں اتنی مروت بھی نہیں کہ انہیں محض زبان سے دھتکار ہی دے. اس کے بعد آپ مجھے دیانت اور امانت کا کیا وعظ سنائیں گے! آپ محض وعظ سناتے ہیں اور میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے. اب میرے سامنے زندگی کا صحیح نقشہ آگیا ہے. اب آپ راشد صاحب کو ایک مختلف انسان پائیں گے. اُف!

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ (IN ROME DO AS ROMANS DO) چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی دنیا میں رہنے کا یہی ڈھنگ ہے.

وہ یہاں تک کہنے پائے تھے کہ باہر سے ایک اجنبی آگیا اور یہ سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا. یہ ہیں راشد صاحب کے وہ تأثرات جن کی بناء پر تم بھی کہتے ہو کہ وہ حق بجانب ہیں اور ہمارے پاس ان کی شکایات کا کوئی جواب نہیں. اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شکایات حق بجانب ہیں. ایک ایسے معاشرہ میں' جو صداقت اور دیانت کی اقدار کا قدردان ہو' ان کی بے لوث خدمات کا صلہ کچھ اور ہونا چاہیئے تھا لیکن اس سے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں' اس سے میں متفق نہیں. میں ان کے اس ردِ عمل کو غلط سمجھتا ہوں. ایسا غلط کہ مجھے اس کا سخت صدمہ ہے. مجھے پہلے اس بات کا افسوس تھا کہ ان ناعاقبت اندیش اربابِ بست و کشاد نے اپنی لااُبالی سے ایک عمدہ افسر کو ہاتھ سے کھو دیا. لیکن راشد صاحب کے ان تأثرات کے بعد مجھے اس کا رنج ہوا کہ ایک عمدہ افسر ہی نہیں انہوں

نے ایک قیمتی انسان کو ضائع کردیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی افسوس تھا کہ راشد صاحب ایک ہی دھچکے میں کہاں سے کہاں آگرے! خدا کرے، ان کا یہ ردِ عمل ہنگامی اور عارضی ہو اور وہ اس کے بعد پھر سنبھل جائیں۔ مجھے ان سے اس کی توقع تو بہت ہے، آئندہ خدا جانے!

اب میں تمہارے اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مقامات میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ان دھچکوں سے بچنے کی کیا صورت بتاتا ہے۔ (واضح رہے کہ جو کچھ میں اب کہنے والا ہوں اسے میں نے مختلف نشستوں میں راشد صاحب کے کان میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں۔ خدا کرے کہ انہوں نے اس کا اثر لے لیا ہو۔ بہرحال، تم غور سے سنو!) قرآن، سلیم! انسان کو اتنا اونچا لے جاتا ہے کہ وہ ان دھچکوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو سکھاتا یہ ہے کہ وہ آئینِ وفا کو اس لئے اختیار نہ کرے کہ اسے اس کا "نخوت پرستوں" کی طرف سے کچھ صلہ ملے گا۔ وہ وفا کو وفا کی خاطر اختیار کرے۔ اس کے لئے اس نے ایک ایسا گُر بتایا ہے جو لفظی اعتبار سے جس قدر سمٹا ہوا ہے، معنوی اعتبار سے اسی قدر پھیلا ہوا ہے۔ وہ گُر یہ ہے کہ تم جو کام بھی کرو لِلّٰہ (اللہ کے لئے) یا فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ الفاظ سُن کر جی میں کہو گے کہ میں نے یہ کیا "مولویانہ" سی بات کہہ دی! تم ایسا خیال کرنے میں سچے ہو، اس لئے کہ ہمارے مروجہ مذہب میں یہ الفاظ اپنی حقیقت سے دُور ہٹ کر ایسے "عامیانہ" سے ہو گئے ہیں کہ انہیں سُن کر ذہن کسی بلند تصور کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن سلیم! سچ مانو کہ یہ الفاظ انسانی تصور و تخیل کو ان بلندیوں تک لے جاتے ہیں جن سے آگے کوئی اور بلندی نہیں۔ یہ مختصر سے الفاظ بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

حضرات انبیاء کرامؑ کی جو داستانیں قرآنِ کریم میں بیان ہوئی ہیں، تم ان پر نگاہ ڈالو۔ تمہیں نظر آئے گا کہ وہ دوسروں کو تباہی سے بچانے کی خاطر طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتے۔ وہ لوگ ان کی سخت مخالفت کرتے۔ انہیں بدنام کرتے۔ سخت سُست کہتے۔ اذیتیں پہنچاتے۔ حتیٰ کہ انہیں گھر بار چھوڑنے تک پر مجبور کر دیتے اور بعض اوقات ان کے خلاف میدانِ جنگ میں بھی اُتر آتے۔ وہ یہ سب کچھ کرتے لیکن اس کے ردِ عمل میں یہ حضرات دل برداشتہ ہو کر اور یہ کہہ کر انہیں ان کے حال پر نہ چھوڑ دیتے کہ یہ اگر تباہی سے بچنا نہیں چاہتے تھے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر ہی تلے بیٹھے ہیں تو ہلاک ہوتے پھریں۔ میں کوئی ان کا ٹھیکیدار ہوں کہ ان کی خاطر اتنی مصیبتیں جھیلتا پھروں۔ وہ اس کے برعکس، ان کی تباہی کے احساس سے

خون کے آنسو روتے اور ان کے غم میں اپنی جان ہلکان کر لیتے۔ قرآنِ کریم نے خود نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸/۶) "ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا"۔ (نیز ۲۶/۲)۔ دوسری جگہ ہے: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵/۸) "تم ان کے غم میں اپنی جان تو نہ گنواؤ"؟ تم سوچو سلیم! کہ وہ جو ان کی خاطر اس طرح اپنی جانوں کو گھلاتے تو انہیں اس سے کیا ملتا تھا؟ کوئی معاوضہ تو ایک طرف، وہ ان کا شکریہ تک ادا نہیں کرتے تھے — شکریہ ادا کرنا کجا' جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے' وہ ان کی جان تک کے لاگو ہوتے تھے۔ تم سوچو کہ یہ حضرات ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کے جواب کے لئے تم قرآن میں بیان کردہ ان کے تذکارِ جلیلہ کو دیکھو۔ ان میں سے ہر ایک کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (۲۶/۱۰۹)

میں تمہاری بھلائی کی خاطر اپنی ان جگر گدازیوں اور دل سوزیوں کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا — کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میں کسی اجر کا متمنی نہیں۔ اس میں "اَسْئَلُكُمْ" کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی میں "تم سے" کوئی اجر نہیں مانگتا — یہ نہیں کہ میں اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا — نفسیاتی طور پر یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے لئے آمادہ ہو جائے جب تک اس کا کوئی جذبۂ محرکہ نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جذبۂ محرکہ اس کے کسی مقصد کا حصول ہوگا۔ اسی کو اس کام کا اجر یا صلہ کہتے ہیں۔ سو اجر یا صلہ کی تمنا اور توقع کے بغیر کوئی کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے ان حضرات (انبیاء کرامؑ) کا اعلان یہ ہوتا تھا کہ "میں اپنے اس کام کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا"۔ یہ نہیں کہ میں اس کام کا کوئی معاوضہ چاہتا ہی نہیں۔ میں اس کا معاوضہ چاہتا ہوں، لیکن تم سے نہیں چاہتا۔ تم سے نہیں مانگتا۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶/۱۰۹)

میں اپنا اجر، صلہ، معاوضہ اس خدا سے چاہتا اور مانگتا ہوں جو ربّ العالمین ہے۔

یہ وہی بات ہے جسے میں نے پہلے لکھا ہے — یعنی میں یہ کام تمہارے لئے کر ہی نہیں رہا جو تم سے اس کا معاوضہ طلب کرنے لگوں۔ جس کے لئے میں یہ کام کر رہا ہوں' وہی مجھے اس کا معاوضہ دے گا۔ اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

انسانی زندگی کے متعلق ایک تصوّر تو یہ ہے کہ اس کی زندگی اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے اور بس! فطرت کے طبیعی قوانین کے مطابق یہ وجود میں آجاتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق اس کی پرورش اور نشو و نما ہوتی رہتی ہے اور انہی کے مطابق آخر الامر اس کی موت واقع ہوجاتی ہے اور جب یہ مرجاتا ہے تو قصہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس تصوّرِ حیات کی رُو سے انسان کے ہر کام کا معاوضہ طبیعی شکل میں ملنا چاہیئے۔ اگر معاوضہ اس شکل میں مل جائے تو کام کرنے والا مطمئن ہوجاتا ہے۔ اگر نہیں ملتا تو وہ دل برداشتہ ہوکر کام چھوڑ دیتا ہے۔ جس مزدور کو مزدوری نہ ملے وہ کام پر نہیں جائے گا۔ وہ کہے گا کہ اُجرت کے بغیر کسی کا کام کئے جانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

زندگی کا دوسرا تصوّر یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ یہ ذات نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہوتی ہے نہ اس کی نشو و نما طبیعی اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے۔ نہ ہی طبیعی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور آگے چلتی ہے۔

لیکن طبیعی جسم کی طرح اس کی ذات کی نشو و نما بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ طبیعی جسم کی نشو و نما طبیعی اشیاء (کھانے پینے وغیرہ) سے ہوتی ہے لیکن اس کی ذات کی نشو و نما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس مقصد کے لئے متعین فرمایا ہے۔ انہیں عام طور پر اخلاقی اقدار (ETHICAL) (VALUES) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق کام کرنے کو "خدا کے ہاں سے صلہ یا اجر ملنا" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجر نہ کہیں خارج سے ملتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی محسوس شکل ہوتی ہے۔ اس کا اجر خود اس کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ اس عظیم حقیقت کو قرآن کریم نے دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کردیا ہے جب کہا کہ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷/۹۰) جو کچھ تم کرتے ہو وہی اس کا بدلہ ہوتا ہے۔ یعنی اس کام کا بدلہ خود اس کام کے اندر پنہاں ہوتا ہے۔ کہیں باہر سے نہیں ملتا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا کرتا ہوں۔ تم کسی قلی (یا مزدور) سے کہتے ہو کہ وہ تمہارا خط تمہارے دوست تک پہنچا دے جس کا مکان دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے لئے اسے ایک روپیہ ملے گا۔ اس قلی کو نہ تمہارے خط سے کوئی واسطہ ہے، نہ ہی اس دو میل کی مسافت سے کوئی تعلق۔ اس نے تمہارا کام کیا اور اس کے بدلے میں اسے ایک روپیہ مل گیا۔ یہ کسی کام کے خارج سے ملنے والے صلہ کی مثال ہے۔ اس

کے برعکس، تم صبح سویرے اُٹھ کر دو میل کی سیر کرتے ہو تو اس لئے نہیں کہ اس کے بدلے میں تمہیں کہیں سے ایک روپیہ ملے گا۔ تم یہ اس لئے کرتے ہو کہ اس سے تمہاری صحت اچھی ہوگی. یعنی سیر کے لئے تمہارا دو میل کا سفر اپنا صلہ خود اپنے اندر رکھتا ہے ــــ یہ جزاء مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کی مثال ہے. یعنی اس میں کام کا صلہ اس کے اندر مضمر ہوتا ہے.

اقدارِ خداوندی کے مطابق جتنے کام کئے جاتے ہیں، ان کا صلہ خارج سے نہیں ملتا. ان کا صلہ خود ان کے اندر مضمر ہوتا ہے. یہ الگ بات ہے کہ آخر الامر ان کا صلہ طبیعی مفاد کی شکل میں بھی سامنے آجاتا ہے لیکن ان اقدار کی پابندی کرنے والوں کا جذبۂ محرکہ طبیعی مفاد کا حصول نہیں ہوتا ــــ طبیعی مفاد کی شکل میں ان کا صلہ مل جانے کے متعلق یوں سمجھو کہ جب، ان اقدار کی پابندی کرنے والے ایک نظامِ معاشرہ قائم کرلیتے ہیں تو اس کے نظام کے جنت بداماں نتائج ان کی طبیعی زندگی کو بھی خوشگوار اور شاداب بنا دیتے ہیں اور انہیں ہر قسم کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو جاتی ہیں. جس طرح، جب سیر کرنے والے کی صحت اچھی ہو جائے تو اس کی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے. اسے پھر سن لو کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو آخر الامر طبیعی زندگی کی خوش سامانیاں حاصل ہو جاتی ہیں. لیکن وہ ان اقدار کی پابندی ان خوش سامانیوں کی خاطر بھی نہیں کرتے. وہ ان کی پابندی اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے. یہ معنے ہیں ان کے اس اعلان کے کہ ہم یہ کچھ کسی خارجی صلہ کی خاطر نہیں کرتے. "خدا کی خاطر" کرتے ہیں. حضرات انبیاء کرامؑ کا مقام تو بہت بلند ہے. ان کے اتباع میں، ان اقدار کی پابندی کرنے والے مومنین کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچاتے ہیں. ان کی مدد کرتے ہیں. تو اس کے ساتھ ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ــــ ہم یہ سب کچھ "خدا کی خاطر" کرتے ہیں؛ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)" ہم اس کے عوض تم سے کسی صلہ کے تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں". یہ اس لئے کہ ضرورت مندوں کو سامانِ رزق مہیا کرنا ایک قدر ہے. لہٰذا جو شخص اس کے مطابق کچھ کرتا ہے وہ ان ضرورتمندوں سے اس کا معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک بھی نہیں چاہتا. ان معذورین کی پرورش، اس کا فریضہ تھا. ان کی پرورش ہو گئی تو اسے اس کا صلہ مل گیا.

اس مقام پر ایک اور لطیف سا نکتہ بھی سمجھ لو. قرآنِ کریم میں ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ

اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ۝ (۵۵/۶۰)۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا اور مفہوم لیا جاتا ہے کہ تم نے کسی پر اس کی ضرورت کے وقت کوئی احسان کیا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تم پر احسان کر کے تمہارے احسان کا بدلہ اتار دے ـــ یعنی احسان کرنے کے بعد، تم منتظر رہو کہ وہ کب تمہارا احسان اتارتا ہے! یہ خود غرضی کی انتہا ہے۔ اس سے تمہارا احسان مند اس وقت تک تمہارے سامنے سرنگوں رہے گا جب تک وہ اس بارِ احسان سے سبکدوش نہ ہو جائے۔ یہ اس ارشادِ خداوندی کا صحیح مفہوم نہیں ـــ احسان کے معنے ہوتے ہیں کسی کی کمی دُور کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس کا حُسن واپس دلا دینا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کرنا چاہا۔ وہ برقرار ہو گیا۔ تمہیں تمہارے کام کا صلہ مل گیا۔ تم جو چاہتے تھے وہ ہو گیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟ تم نے دیکھا کہ خدمت بلا صلہ کا یہ کیسا عظیم اور بلند تصور ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اقدارِ خداوندی کا اتباع کسی خارجی صلہ کی غرض سے نہیں بلکہ محض اس لئے کرے کہ اس سے اس کی ذات میں حُسن پیدا ہو جائے گا۔ اس قسم کا صلہ، جنّت کا وہ چشمہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے: يُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِيۡرًا ۝ (۷۶/۶) وہ اسے اپنے قلب کی گہرائیوں سے بہا کر لائیں گے۔ یہ کہیں باہر سے بہتا ہوا نہیں آئے گا۔ یہ وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے جسے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ان جامع الفاظ میں کہلوایا گیا ہے کہ

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ۙ
لَا شَرِيۡكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝

(۶/۱۶۴-۱۶۳)

تو کہہ دے کہ میرے فرائضِ حیات اور ان کے حصول کے طور طریقے۔ (مختصر الفاظ میں یہ کہ ' میری زندگی اور میری موت، سب اللہ کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ میرے اس مقصد میں کسی اور جذبہ کی آمیزش نہیں۔ مجھے اسی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے ایک مُسلم کی زندگی۔ یعنی اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ لیکن ایسا کچھ کرنا آسان کام نہیں۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کو خود اپنے مفاد پرستانہ جذبات کے ساتھ جنگ کرنی پڑتی ہے جو ہر آن طبیعی مفادات کے تقاضے کرتے رہتے ہیں خواہ ان کے لئے کوئی ساحربہ بھی استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔

اپنی اندرونی جنگ سے آگے بڑھتے تو اس معاشرہ کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے جس میں باطل کا نظام کارفرما ہوتا ہے۔ یہ جو ہم نے دیکھا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی سخت مخالفت ہوتی تھی تو یہ درحقیقت ان کے پیش کردہ اقدار پر مبنی نظام کی باطل کے نظام کے ساتھ جنگ تھی جس کے پیشِ نظر صرف انسان کے طبیعی مفاد ہوتے ہیں، اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کے الفاظ میں حق و باطل کی جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ بڑی صبر آزما اور ہمت طلب ہوتی ہے

حق و باطل کی جنگ

کیونکہ باطل نظام کے پاس مخالفت کے وسیع ذرائع اور نہایت موثر اسباب ہوتے ہیں اور اقدار کی دعوت دینے والا ایک تو شروع میں تنہا ہوتا ہے اور دوسرے اس کے پاس وہ سامان اور ذرائع بھی نہیں ہوتے۔ اس کی قوت کا راز اس یقین (ایمان) میں ہوتا ہے کہ باطل لاکھ قوتوں کا مالک ہو، آخرالامر فتح حق کی ہوگی۔

اس نکتہ پر قرآنِ کریم کے ارشادات بڑے واضح ہیں۔ سورۃ الانبیاء میں ہے: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط (۲۱/۱۸)۔ اس کشمکش میں، خدا کا قانونِ مکافات، باطل کے سر پر حق کے ہتھوڑے مارتا رہتا ہے تاآنکہ وہ باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے — اور اس طرح باطل میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ اس نے کہا کہ جس طرح تاریکی اس وقت باقی رہتی ہے جب تک روشنی نہیں آجاتی، اسی طرح باطل بھی اسی وقت تک غالب رہتا ہے جب تک حق نہیں آجاتا: وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط جونہی حق آتا ہے باطل بھاگ جاتا ہے؛ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ٥ (۱۷/۸۱) باطل کی تو فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ حق کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔

لیکن جو شخص حق کو لے کر اٹھتا ہے۔ یعنی خود بھی اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے، اسے بڑی ہمت اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر وہ راستے میں ہمت ہار دیتا ہے تو پھر اسے حق پرست نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا...... جو لوگ اس داعیہ کے ساتھ اُٹھے کہ سامانِ ربوبیت خدا کی ملکیت میں رہنا چاہیئے۔ انسانوں کی ملکیت میں نہیں۔ اور پھر اس دعوت اور مسلک پر جم کر کھڑے ہو گئے: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوگا جو ان سے کہیں گے کہ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا تم نہ کسی سے ڈرو اور نہ ہی دل برداشتہ ہو کر ہمت ہارو — وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ (۴۱/۳۰)۔ مستقل اقدار کی پابندی کے نتیجے میں خدا نے تم سے جس جنتی زندگی کا وعدہ کر رکھا

ہے وہ آکر رہے گی۔ تم اس تصادم اور کشمکش میں تنہا نہیں ہو۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ۚ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست اور رفیق ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی؛ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَ لَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۞ (۴۱/۳۱)۔ اس جنتی زندگی میں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے تم جو چاہو گے ہو گا۔ جو مانگو گے ملے گا۔ بس تھوڑا سا توقف کرو اور ہمت سے کام لو۔

ان تصریحات کے بعد سلیم! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو راشد صاحب نے کہی تھی یعنی "اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے"۔ دیانتداری اقدارِ خداوندی میں سے ایک قدر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں بددیانتی عام ہو، دیانتداری پر کاربند ہونے والے اور اس کی طرف دعوت دینے والے کی مخالفت بڑی شدت سے ہو گی۔ اس تصادم میں اسے نقصانات بھی اٹھانے پڑیں گے۔ اگر اس نے دیانت داری اس خیال سے اختیار کی تھی کہ یہ پھولوں کی سیج ہے۔ اس پر نہ صرف یہ کہ اسے کانٹا نہیں چبھے گا بلکہ معاشرہ کی طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برسائے جائیں گے، تو اس کا یہ خیالِ خام اور مفروضہ غلط تھا۔ اس لئے معاشرہ کی طرف سے مخالف ردِ عمل سے وہ ضرور دل برداشتہ ہو جائے گا اور آخرالامر یہ کہے گا کہ میں نے غلطی کی جو دیانت داری کا شیوہ اختیار کیا۔ میں بھی اگر دوسروں کی روش پر چلتا رہتا تو بڑے مزے میں رہتا۔

لیکن اگر اس نے دیانتداری کی روش اس لئے اختیار کی تھی کہ یہ ایک مستقل قدر ہے جس کا صلہ خود اس کے اندر مضمر ہے۔ خارج سے اس کا کوئی صلہ نہیں ملے گا بلکہ اس کی شدید مخالفت ہو گی اور اس سے مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑے گا تو پھر یہ صورت نہیں پیدا ہو گی کہ اس مخالفت سے گھبرا کر انسان یہ کہہ دے کہ اِس دَور دیانت دار بننا حماقت ہے اور اس کے بعد باقی معاشرہ کی طرح بددیانتی کا مسلک اختیار کرلے۔

لہٰذا، بنیادی سوال یہ ہو گا کہ آپ دیانت داری کی روش کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کے مطابق آئندہ چل کر آپ کا ردِ عمل ہو گا۔ غلط معاشرہ میں صحیح روش اختیار کرنے کے لئے یہی صبر آزما عواقب تھے جن کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اسی "فیصلہ" کو زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کہتے ہیں اور انسان کے ردِّ عمل کا دارومدار اسی تبدیلی پر ہے ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں : ؎

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود　　　ایں زمین و آسماں دیگر شود

نگاہ کی تبدیلی سے انسان کے نفع و نقصان کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ اس وقت سوال یہ رہ جاتا ہے کہ نقصان جسم کا یا ذات کا۔ قرآنِ کریم نے اس بلند حقیقت کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ اے اربابِ ایمان! تم اپنی ذات کے تحفظ، نشوونما اور استحکام کا خیال رکھو۔ یاد رکھو، لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ (۵/۱۰۵) اگر تم صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستے پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ جو نقصان بھی پہنچائیں گے اس کا تعلق ہماری طبیعی زندگی سے ہوگا۔ تمہاری ذات کو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے تم خود ہی نقصان پہنچا سکتے ہو۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم نے کہا کہ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔ غلط راہوں پر چلنے والے خود اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں پہنچاتا۔ لہٰذا، اگر تمہارا مقصودِ حیات اپنی ذات کی منفعت ہے تو غلط بیں معاشرہ تمہیں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا۔ اس راہ میں تو جس قدر طبیعی نقصانات پہنچیں گے وہ تمہاری ذات کے لئے اس قدر منفعت بخش ہوں گے۔ طبیعی نقصانات کا آخری درجہ جان کا نقصان ہے۔ اقدار کے تحفظ کی خاطر جان دے دینے سے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔ انسانی ذات کا اس سے زیادہ نفع اور کیا ہو سکتا ہے؟ اقدار کا تحفظ چاہنے والا تو ہنسی خوشی جان دے دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے کم درجہ کے نقصانات اسے کس طرح ملولِ خاطر کر سکتے ہیں اور وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو روش اختیار کی تھی وہ حماقت پر مبنی تھی۔ وہ تو ہر طبیعی نقصان پر سجدۂ شکرانہ بجا لائے گا کہ اس سے اس کی ذات کو اور تقویت حاصل ہوئی۔

یہی ہیں وہ خوش بخت انسان جن کے متعلق خالقِ کائنات نے کہا ہے کہ

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○ (۲/۱۵۷-۱۵۵)

اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں تمہیں اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ تمہاری

صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ (ٹکراؤ کے بغیر انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر ہی نہیں سکتا (۲/۶۷)۔ اس میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا، کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہوگی، کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا، کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ لیکن آخر الامر فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدّ و جہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصدِ زندگی، نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے (۶/۶۳)۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا (۹/۵۱)۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرینگے۔

یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ انہیں اس کے قانون کی تائید حاصل ہے (۴۳-۵۶/۳۳)۔ انہی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف و اکرام کی بارشیں ہیں اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔

ملخّص جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ملخّص یہ ہے کہ دیانت داری کی روش وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا ایمان ہو کہ

۱۔ انسانی زندگی اس کے طبیعی جسم کی زندگی ہی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسان کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام مومن کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔

۲۔ انسانی ذات کی نشوونما اقدارِ خداوندی کی پابندیوں سے ہوتی ہے۔ دیانتداری بھی انہی اقدار میں سے ایک قدر ہے۔

۳۔ باطل معاشرہ میں اقدارِ خداوندی کی متابعت کرنے والے کو ہر طرح کی مخالفت سے سابقہ پڑے گا۔ اسے مختلف قسم کی تکالیف اور پریشانیاں برداشت کرنی ہوں گی، نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ اگر وہ اپنی روش پر مستقل مزاجی سے جم کر کھڑا رہا تو آخر الامر کامیابی اسی کی ہوگی۔ اس میں وقت تو ضرور لگے گا لیکن آخر کار حق غالب آکر رہے گا۔ یہ خدا کا وعدہ اور اس کا اٹل قانون ہے۔

جو شخص ان امور پر یقینِ محکم رکھے گا، دیانتداری کی روش میں ثابت قدم رہ سکے گا۔ لیکن جو شخص اس روش

گویا تو محض روایتی طور پر اختیار کرتا ہے یا اس لئے کہ اس سے وہ "نیک آدمی" مشہور ہو جائے گا اور معاشرہ میں واہ واہ ہو گی تو چند ہی قدم چل کر اسے نہایت تلخ تجربہ ہوگا اور وہ مخالفتوں اور نقصانات سے گھبرا کر پکار اٹھے گا کہ میں نے دیانت داری کی روش اختیار کر کے غلطی کی۔ اس دور میں دیانت دار بننا حماقت ہے۔

یہ تھی سلیم! وہ قرآنی تعلیم جسے میں وقتاً فوقتاً راشد صاحب کے گوش گزار کرتا رہا' اس توقع کے ساتھ کہ چونکہ ان کے سینے میں قلبِ سلیم ہے اس لئے وہ وقتی جذبات کے ہیجان کے فرد ہو جانے کے بعد جب اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو وہ اس سے ضرور اثر پذیر ہوں گے' تم یہ سنکر خوش ہو گے کہ میری یہ توقع موہوم ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد ان کا ایک خط موصول ہوا جسے تمہاری اطلاع کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ تمہیدی فقرات کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

> مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس دن آپ کی بات کو عجیب بے ہنگم طریق سے کاٹ دیا اور اس کے بعد بھی آپ وقتاً فوقتاً جو کچھ کہتے رہے اسے بے رغبتی اور بے التفاتی ہی سے سنتا رہا۔ میں اس کے لئے اس سے زیادہ اور کسی معذرت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں اِن دنوں جن حالات سے گزر رہا تھا' ان میں جذبات پر قابو رکھنا میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ بالآخر دل ہی تو تھا نہ سنگ وخشت۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میری کمزوری تھی۔
> مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ جو کچھ آپ مجھ سے وقتاً فوقتاً کہتے رہے اسے اگرچہ میں نے بے التفاتی سے سنا لیکن وہ غیر شعوری طور پر میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا اور اب جبکہ ان جذبات کا طوفان تھم گیا ہے' ان کی صداقت ایک ایک کر کے میرے سامنے آرہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی جو کچھ کیا تھا کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کیا تھا۔ اب میں' اس جگر خراش واقعہ کے بعد بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسی مسلک پر قائم رہوں گا۔
> اس حادثہ میں جن دوستوں نے مجھ سے ہمدردی کا ثبوت دیا' میں ان سب کا سپاس گزار ہوں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں' اس لئے کہ آپ نے اس دشوار گزار راستے میں میرا ہاتھ اس طرح تھاما کہ اس نے میرے پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو (یہ حادثہ تو گذر ہی جاتا لیکن) میں ایک مختلف انسان ہو جاتا اور یہ نقصان ایسا

ہوتا جس کی تلافی کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان بہت بڑا احسان ہے اور اس سے بھی زیادہ بڑا احسان یہ کہ اس ضمن میں آپ نے جن قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا' ان سے میرا یہ مسلک علیٰ وجہ البصیرت مسلکِ حق وصداقت قرار پا گیا۔

مجھے راشد صاحب سے اسی کی توقع تھی۔ کس قدر بلند ہیں یہ انسان جو قرآن کا اثر اس طرح سے لیتے ہیں۔ قرآن فی الواقع ایسا ہی انقلاب پیدا کرتا ہے؛ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور قرآن کی رُو سے ہر عمل کا محور یہی نقطۂ توحید ہے کہ جو کچھ کیا جائے للہ کیا جائے۔ یعنی اقدارِ خداوندی کی متابعت کے لئے۔ اس میں نہ کسی معاوضہ اور ستائش کا خیال جذبۂ محرکہ ہونا چاہیئے نہ ہی کسی شخصیت کا پاس' خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

سوچو سلیم! کہ کس قدر جنت بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں فرائض کی انجام دہی کا مرکزی یہ تصور ہو' اور نوعِ انسانی کے لئے کس قدر باعثِ رحمت۔ اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ایک زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے کس طرح خارجی دنیا میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ زاویۂ نگاہ کی اس تبدیلی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ ہر عمل کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے تاکہ یہ عمارت اس قدر محکم ہو کہ خارجی حوادث اس پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اب تم سمجھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کا عمل سے کیا تعلق ہے؟

والسلام۔ پرویز
نومبر ۱۹۵۶ء

سولھواں خط

عمل بلا معاوضہ

سلیم! کل شام احمد بھائی نے ایک دلچسپ بات سُنائی. باہر کے کسی ملک کا ایک وفد ان کی مل (کپڑے کا کارخانہ) دیکھنے گیا. اثنائے گفتگو میں وفد کے لیڈر نے پوچھا کہ تمہارے ہاں ایک کاریگر روزانہ کس قدر کام کر کے دیتا ہے. یعنی اس کی (OUT-PUT) کیا ہے؟ جواب سننے پر اُس نے کہا کہ یہ تو بہت تھوڑا ہے. اس پر اسے بتایا گیا کہ ہمارے پیشِ نظر ایک (INCENTIVE SCHEME) ہے. اس کے بروئے کار آنے پر امید ہے کہ کام کی اوسط قریب دس فیصد بڑھ جائے گی.

تم جانتے ہو سلیم! کہ (INCENTIVE SCHEME) کے معنی کیا ہیں؟ یوں سمجھو کہ ایک کاریگر چھ گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے، اُسے تین روپے روزانہ مزدوری ملتی ہے اور وہ دو گز کپڑا بُن کر دیتا ہے. اس سے کہا جاتا ہے کہ اگر اتنے ہی وقت میں تم دو کی بجائے سوا دو گز کپڑا تیار کر کے دو، تو تمہیں ساڑھے تین روپیہ یومیہ اُجرت دی جائے گی. اس سے وہ زیادہ کام کرے گا. یعنی آٹھ آنے یومیہ کا اضافہ اس کے لئے مہمیز کا کام دے گا. اسی کو (INCENTIVE) کہتے ہیں. بالفاظِ دیگر، زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے جذبۂ محرکہ.

تم کہو گے کہ یہ اسکیم بہت اچھی ہے. جب تک اس قسم کا جذبۂ محرکہ نہ ہو، کوئی شخص زیادہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ "مزدورِ خوش دل کند کار بیش" بہت پرانا مسلّمہ ہے اور ایک مزدور کے لئے اُجرت میں اضافہ سے بڑھ کر "خوش دلی" کا سامان اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر ہمارے ہاں کے آجر (ملازم رکھنے والے) کام کرنے والوں کے لئے اس قسم کے (INCENTIVES) مہیا کرتے رہیں تو دیکھئے کام کی رفتار کس تیزی سے بڑھ جاتی ہے.

ایک تم ہی نہیں سلیم! ہمارے ہاں ہر شخص یہی کہے گا. لیکن تم یہ سُنکر حیران ہو گے کہ اس وفد کے لیڈر نے یہ نہیں کہا. اس نے اس اسکیم کا ذکر سُن کر حیرت سے دیکھا اور بڑے تعجب سے کہا کہ کیا تم لوگ چوری کی حوصلہ افزائی کرتے ہو اور بلیک مارکیٹ کو بُرا نہیں سمجھتے؟ یہ طریقہ بڑا غلط ہے. قومیں اس طرح ترقی نہیں کر سکتیں.

تم یقیناً دل میں سوچتے ہو گے کہ اس نے یہ بات کیا کہہ دی؟ مزدوری میں اضافہ کو چوری اور بلیک مارکیٹ سے کیا تعلق؟ اگر قومیں اس طرح ترقی نہیں کیا کرتیں تو اور کس طرح کیا کرتی ہیں؟ نظر بظاہر تمہاری حیرت بجا اور درست ہے. مزدور کی اُجرت میں اضافہ ایک مستحسن نام ہے. اسے مذموم قرار دینے کے معنی کیا؟ لیکن تم اگر ذرا گہرائی میں جاکر دیکھو تو تمہیں صاف نظر آجائے گا کہ اس نے بات بڑے پتے کی کہی ہے. یہ واقعی چوری اور بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی ہے. سنو! اس نے کیا کہا ہے.

ایک مزدور تم سے معاہدہ کرتا ہے کہ وہ چھ گھنٹے روزانہ کام کرے گا اور اس کے بدلے تین روپے اُجرت لے گا. وہ چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور دو گز کپڑا بُن کر دیتا ہے. لیکن جب تم اُسے آٹھ آنے زیادہ دیتے ہو تو وہ انہی چھ گھنٹوں میں سوا دو گز کپڑا بُن کر دے دیتا ہے. اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اُسے تین روپیہ یومیہ ملتے تھے تو وہ پوری محنت اور توجہ سے کام نہیں کرتا تھا. اس میں سے (یعنی اپنی توانائی یا توجہ میں سے) کچھ بچا کر رکھتا تھا. اگر وہ اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کرتا اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہ ہونے دیتا تو وہ چھ گھنٹے میں دو گز سے ایک انچ زیادہ کپڑا بھی نہ بُن سکتا خواہ اسے دس روپے زیادہ بھی کیوں نہ دیئے جاتے اگر وہ آٹھ آنے زیادہ ملنے پر سوا دو گز کپڑا بُن دیتا ہے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ پہلے وہ اپنی محنت (توانائی، استعداد، توجہ) میں سے کچھ حصہ چھپا کر رکھتا تھا اور اب اسے باہر لایا ہے. اسی کا نام چوری اور بلیک مارکیٹ ہے. یعنی اس کے پاس زیادہ کام کرنے کی استعداد (CAPACITY) موجود ہے لیکن وہ اسے چھپا کر رکھتا ہے (بلیک میں لے جاتا ہے) اور اُس وقت باہر لاتا ہے جب اُسے دام زیادہ ملتے ہیں. اگر آپ اس کی اس طرح چھپا کر رکھی ہوئی استعداد کو زیادہ داموں پر خریدتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ چوری اور بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں.

لیکن یہ چوری دونوں طرف سے ہے. کاریگر چھ گھنٹے میں سوا دو گز کپڑا بُن کر دے سکتا ہے، لیکن وہ دو گز سے زیادہ بُن کر نہیں دیتا. وہ اپنی محنت کی چوری کرتا اور اسے بلیک میں بیچتا ہے. دوسری طرف کارخانہ دار جانتا ہے کہ چھ گھنٹے کی پوری پوری محنت کا معاوضہ ساڑھے تین روپے ہونا چاہیئے، لیکن اس کی بجائے تین

روپے پر معاہدہ کرتا ہے۔ یعنی وہ اُجرت کی چوری کرتا ہے۔ دیانت نہ اس کے ہاں ہے، نہ اِس کے ؎

دونوں کے دل میں چور ہے بیٹھے ہیں سامنے
وہ دل لئے ہوتے، میں تمنا لئے ہوئے

اُس وفد کے لیڈر نے اس "چوربازاری" کا علاج کیا بتایا؟ اس کی تفصیل تو معلوم نہ ہوسکی (اس نے تفصیل سے بتایا ہی نہ تھا) لیکن جو کچھ اس نے کہا اس کا ماحصل یہ تھا کہ تم پیداوار (PRODUCTION) کو (دیگر ذرائع سے) اس قدر زیادہ کردو کہ تمہیں ایک کاریگر سے چھ گھنٹے میں دو گز سے زیادہ کپڑا بُنوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس طرح جب اس کے "بلیک" کے مال کا کوئی خریدار نہیں ہوگا تو اسے بلیک کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

لیکن یہ تو خالص استبداد ہے۔ یعنی طلب (DEMAND) اور رسد (SUPPLY) کا وہی قدیم سرمایہ دارانہ نظریہ جس کے تحت مزدور، اپنی محنت کو تمہارے داموں پر بیچنے کے لئے مجبور ہوجائے۔ یہ کوئی علاج نہیں۔ اس کا علاج قرآن بتاتا ہے اور غور سے سُنو سلیم! کہ وہ کیا علاج بتاتا ہے۔ وہ کام اور اس کی اجرت کے نظریہ ہی کو غلط اور باطل قرار دیتا ہے۔ وہ کام کو فریضہ (DUTY) یا ذمہ داری (RESPONSIBILITY) قرار دیتا ہے جس کی اُجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی تم نے سُنا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فریضہ کو ادا کرے اور اس کے بعد کہے کہ لاؤ میری اُجرت! تم صبح سویرے سیر کو نکلتے ہو اور دو میل کا چکر کاٹتے ہو۔ کیا تم نے کبھی کسی سے اپنی محنت کی مزدوری مانگی ہے؟ فریضہ یا ذمہ داری کی ادائیگی میں معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایسی عظیم اور بنیادی حقیقت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی دعوت کی ابتدا، اسی اعلان سے کرتا تھا۔ سورۂ شعراء کو پڑھو اور دیکھو کہ کس طرح ہر رسول اسی اصول کا اعلان اور اس کا اعادہ کرتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ تشریف لاتے ہیں، قوم کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان پر اس حقیقت کو واضح کردیتے ہیں کہ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ (۲۶/۱۰۹) میں تم سے اس کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ اس کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میری اُجرت اور معاوضہ خدائے رب العالمین پر ہے۔ (اس ٹکڑے کا مفہوم ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔ میں یہ سب کچھ اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھ کر کررہا ہوں۔ (وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۞ ۱۰/۷۲)۔ لہٰذا، اس کی اُجرت اور معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد حضرت ہودؑ آئے اور انہوں نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ

اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۶/۱۲۷) میں اس کے بدلے تم سے کوئی اُجرت یا معاوضہ کا خواہاں نہیں ہوں. پھر قومِ ثمود کی طرف حضرت صالحؑ تشریف لائے تو انہوں نے بھی اسی حقیقت کا اعلان فرمایا کہ وَ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ (۲۶/۱۴۵). یہی حضرت لوطؑ نے کہا (۲۶/۱۶۴). اسی کا اعادہ حضرت شعیبؑ نے فرمایا جب کہا کہ وَ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ (۲۶/۱۸۰). ان تمام حضراتِ کرامؑ کے بعد، نبئ اکرمؐ تشریف فرما ہوئے اور انہوں نے بھی اسی عظیم حقیقت کا اعلان فرمایا کہ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۵۷) میں اس کا کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا. میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ صرف اتنا ہے کہ تم میں سے جو چاہے اپنے نشوونما دینے والے کی طرف راستہ اختیار کرلے. میری دعوت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے، اس لئے میں کسی انسان سے بھی اس کا معاوضہ نہیں مانگتا. (قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۹۱) اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری اس دعوت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم نے اس دعوت کو قبول کرلیا (اور اس طرح گویا میری پارٹی میں شامل ہوگئے) تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں بھی میرا کوئی فائدہ مضمر نہیں، تمہارا ہی فائدہ ہے. مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ (۳۴/۴۷). اسی حقیقت کو دوسری جگہ باندازِ دگر یوں بیان کیا گیا کہ اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ (۵۲/۴۰) کیا تو ان سے کوئی اجر مانگتا ہے جو یہ (بزعمِ خویش) اپنے آپ کو بیگار (یا جرمانہ) کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا سمجھتے ہیں؟

بہرحال، قرآن نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر واضح کردیا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت کا آغاز (اور انجام) اسی اعلان سے ہوتا تھا کہ ہم اس کا کوئی معاوضہ، کوئی اُجرت، کوئی بدلہ تم سے نہیں چاہتے. یہی وہ بنیادی حقیقت تھی جسے (جامع طور پر) سورۂ یٰسٓ میں ایک مردِ مومن نے اپنی قوم سے یوں بیان کیا کہ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۳۶/۲۰) اے میری قوم! تم خدا کے رسولوں کا اتباع کرو. اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۳۶/۲۱) یعنی ان کا اتباع کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور خود راہِ راست پر جارہے ہیں.

---

[1] سورۂ شوریٰ میں جو ہے کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ۭ (۴۲/۲۳) تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ میں تم سے اس کا معاوضہ کچھ نہیں مانگتا. صرف یہ چاہتا ہوں تم عزیز داری کے معاشرتی تعلقات کو قائم رکھو. اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے.

اجر کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل تو وہی ہے جسے ہر شخص سمجھتا اور جانتا ہے۔ یعنی مال و دولت، کسی کام کے معاوضہ میں روپے کی شکل میں اُجرت وصول کرنا۔ قرآن نے اس شکل کی خود ہی وضاحت کر دی ہے جب حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا کہ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ط (۱۱/۲۹) میں تم سے اس کے معاوضہ میں روپیہ پیسہ نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے علاوہ اجر کی کئی شکلیں ایسی ہیں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں اور جنہیں دل کی آنکھیں ہی بھانپ سکتی ہیں۔ ان میں جاہ و منصب اور عزت و تکریم کی خواہش نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ جب فرعون نے اپنے اِن کے مذہبی پیشواؤں سے کہا کہ وہ (حضرت) موسیٰؑ کا مقابلہ کریں تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ٥ (۷/۱۱۳) اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں اس کا معاوضہ تو ملے گا نا؟ فرعون نے کہا نَعَمْ۔ یقیناً ملے گا: وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ٥ (۷/۱۱۴) انعام بھی ملے گا اور تم ہمارے مقربین میں سے بھی ہو جاؤ گے۔ سرکار دربار میں تمہاری عزت ہو گی، خلعت ملے گی، انعام پاؤ گے، جاہ و منصب حاصل ہوں گے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے ایک لفظ میں ان تمام ہوسناکیوں کو کس طرح بے نقاب کر دیا جو بڑے بڑے لوگوں میں "خدمتِ خلق" اور "خدمتِ دین" کے لئے جذباتِ محرکہ (INCENTIVES) بنتی ہیں؟ اس سے آگے بڑھو تو اقتدار اور حکومت کا جذبہ (LOVE FOR POWERS) ان "خدمات" کا معاوضہ بنتا ہے۔ اس لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب (قانون) اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کر لو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ جب حضرات انبیائے کرامؑ (اور ان کے متبعین) کہتے ہیں کہ مَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا) تو اس سے مراد صرف مال و دولت کی شکل میں معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ جاہ و منصب، شان و شوکت، عزت و حقیقت

---

[۱] تم نے غور کیا سلیم! کہ حضرات انبیاء اور ان کے متبعین اور غیر خدا وندی مذہب کے پیشواؤں کی ذہنیت میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا ہے؟ پیشوایانِ مذہب اور اربابِ شریعت مذہبی مناظروں (یعنی "باطل" کو شکست دینے) کے لئے بھی اُجرت مانگتے ہیں اور قیمت پہلے ٹھہرا لیتے ہیں۔ یہی فرعون کے زمانے میں ہوتا تھا، یہی آج ہو رہا ہے!

اور اقتدار و حکومت کی تمام شکلیں اس میں آجاتی ہیں۔ وہ اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی دعوت اور محنت کا معاوضہ ان میں سے کسی شکل میں بھی لینا نہیں چاہتے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں "لِلّٰہ" کرتے ہیں: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (۱۶۳-۱۶۴/۶)" ان سے کہہ دو کہ میرے فرائضِ زندگی اور ان کے حصول کے طور طریقے، حتّٰی کہ میرا مرنا اور جینا، سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں ان میں سے سب سے پہلا ہوں جو اس کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں"۔

تم اس مقام پر پوچھو گے (اور میں نے پہلے ہی اس کی طرف اشارہ کیا ہے) کہ "لِلّٰہ" کے معنی کیا ہیں اور اس کا مفہوم کیا ہے کہ میرا اجر اللہ رب العالمین کے ذمے ہے۔ لو! غور سے سُنو۔

لیکن سنو کیا! یہ چڑیاں کچھ لکھنے تھوڑا دیتی ہیں۔ وہ دیکھو انہوں نے پھر گونسلا بنانا شروع کر دیا اور پھر اس میں سے تنکے گر گر میرے میز اور کاغذات پر بکھرنے لگ گئے۔ تم نے پچھلے سال دیکھا تھا کہ ٹھیک میری نشست کے اوپر، چڑیوں نے گھونسلہ بنانا شروع کیا تھا۔ ایک چڑیا اور ایک چڑا، صبح سے شام تک، دیوانہ وار پھرتے، ایک ایک تنکا اکٹھا کرتے اور اپنا گھونسلا بناتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، کوئی بیس مرتبہ ان کا گھونسلہ اُجڑا ہوگا اور انہوں نے بیس ہی مرتبہ اسے از سرِ نو بنایا ہوگا۔ انہیں نہ کھانے کی سوجھتی، نہ پینے کی، نہ چین کا خیال آتا، نہ آرام کا۔ دن بھر ان کا یہی کام رہتا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے تنکے اٹھا کر لاتے اور گھونسلہ میں رکھتے۔ یہ سلسلہ غالباً مارچ اپریل تک جاری رہا۔ اس کے بعد سال بھر تک یہ کہیں نظر نہ آئے۔ اب جو پھر وہی دن آئے ہیں، تو پھر نمودار ہو گئے ہیں۔ پھر وہی سرگردانی اور دیوانگی، وہی خاشاک فراہمی اور آشیاں سازی۔ میں نے ایک دن چڑیا سے پوچھا کہ تم یہ تمام تگ و تاز اور سعی و کاوش کیوں کرتی ہو؟ اس نے کہا کہ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں اس حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرتی ہوں۔ میں نے کہا کہ اس سے تمہیں ملتا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے سامنے ملنے ملانے (اجر، معاوضہ) کا سوال ہی نہیں۔ (لَاۤ اَسْئَلُ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ) میں یہ سب کچھ (لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) خدا کی ربوبیت عالمینی کے پروگرام کی تکمیل کے لئے کرتی ہوں اور اس کا معاوضہ یہ ہوتا ہے کہ (میں انڈے دیتی ہوں۔ انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ ان بچوں کی اس گھونسلے میں پرورش ہوتی ہے۔ اس طرح) خدا کی ربوبیت کے پروگرام

کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی میرا اجر ہے۔ یہی میرا معاوضہ ہے (اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)۔

تم نے سمجھ لیا سلیم! کہ "لِلّٰہ" کے معنی کیا ہیں اور "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کے ذمہ اجر ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ کائنات کی ہر شے خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل کے لئے مامور اور سرگرداں ہے۔ وہ اس پر مجبور ہے۔ یہی ان اشیاء کی مجبوری اور ان کا جذبِ دروں (INNER URGE) ہے جو انہیں ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود تکمیلِ فرائض میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ انسان کا فریضہ بھی خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل ہے۔ لیکن وہ اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اس سے کہا گیا ہے کہ وہ اس فریضہ کو از خود اختیار کرے۔ ــــــ اس ذمہ داری کو بطیبِ خاطر قبول کرے۔ لہٰذا، انسان کے ضمن میں "لِلّٰہ" کے معنی ہیں؛

> وہ فریضہ، جسے انسان، قوانینِ خداوندی کی رُو سے، بلا خیالِ اجر و معاوضہ، از خود اپنے ذمے لے لے۔

وہ اس طرح خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کا معاوضہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

> اور اس نظام کی تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ خود اس کی اپنی ربوبیت (اس کے جسم اور ذات کی نشوونما) ہو جاتی ہے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ اس جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) کے ماتحت کوئی کام کرنے والا، اپنی سعی و عمل اور تگ و تاز میں، اپنی استعداد اور توانائی کی کسی قسم کی چوری نہیں کرتا۔ اگر ایک چڑیا دن میں سو تنکے فراہم کرنے کی استعداد رکھتی ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ نوے تنکے اکٹھے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ اس لئے کہ وہ اس کام کو کسی خارجی معاوضہ کی خاطر نہیں کرتی۔ یہ اس کے جذبۂ دروں (INNER URGE) کا تقاضا ہوتا ہے۔ اور اس کا معاوضہ اس تقاضے کی تسکین۔ جب تک اس کے تقاضے کی تسکین نہیں ہوتی وہ اپنی سرگرمیوں میں فرق نہیں آنے دیتی۔ (جب تک پیاسے کو پانی نہیں مل جاتا وہ اپنی تگ و تاز کو مسلسل جاری رکھتا ہے) اس میں نہ کسی قسم کے تغافل و تکاسل کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ کام چوری اور بددیانتی کا شائبہ۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے "کام اور اُجرت" کے نظریہ کے بجائے فریضہ اور ذمہ داری کا تصور دے کر انسانی فکر و نظر میں کتنی عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ یہی وہ تصور ہے جس پر وہ اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کے نظامِ ربوبیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاشرے میں ہر فرد اپنا اپنا کام، فریضہ

زندگی سمجھ کر کرتا ہے اور اس میں کسی اجر یا معاوضہ کا خیال اس کے دامنگیر نہیں ہوتا۔ وہ افرادِ انسانیہ کی پرورش اور نشو و نما کو اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اُن سے کچھ نہیں چاہتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶/۷) وہ اپنی ذمہ داریوں (اپنے واجبات، یعنی جن امور کو انہوں نے اپنے اُوپر واجب قرار دے رکھا ہے انہیں) انہیں پورا کرتے ہیں۔ وہ ضرورت مندوں کے رزق کا سامان مہیا کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝ (۷۶/۹)

ہم جو تمہارے رزق کا سامان کرتے ہیں تو خالص فریضۂ خداوندی سمجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ معاوضہ تو ایک طرف ہم تو اتنا بھی نہیں چاہتے کہ تم اس کے لئے ہمارے شکرگزار ہو۔

جب ہم نے اپنا فریضہ ادا کیا ہے تو اس میں تمہارے لئے شکرگزار ہونے کی کون سی بات ہے!

تم نے دیکھا سلیم! قرآن اس باب میں انسان کو کن بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ معاوضہ تو ایک طرف، ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم ہمیں (THANK YOU) بھی کہو۔ شکریہ تو اس صورت میں ہو جب ہم نے تمہارے لئے کچھ کیا ہو۔ تمہاری کمی کا پورا کرنا ہمارا فریضہ تھا۔ ہم نے تمہاری کمی پوری کر دی، سو اُس کا معاوضہ یہ ہے کہ تمہاری کمی پوری ہو گئی اور ہمارا فریضہ ادا ہو گیا۔ اللہ! اللہ! اخیر سلاً؛ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ (۵۵/۶۰) کسی کی کمی پورا کرنے کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی کمی پوری ہو گئی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے، وہ کس قدر غلط ہے۔ قرآن کی رُو سے، جو شخص دوسروں کے لئے کچھ کرتا ہے اس کے دل میں احسان کا خیال تک بھی نہیں آنا چاہیئے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَا اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۲۶۲) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں کھلا رکھتے ہیں اور جو کچھ اس طرح دوسروں کو دیتے ہیں، اس کا احسان رکھ کر انہیں اذیت نہیں پہنچاتے۔ یہ وہ ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

انسان، "احسان کا بدلہ احسان" نہ بھی چاہے، تو بھی کم از کم اتنا تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔

لیکن قرآن "عمل بلا اجر" کے تصور کو اس سے بھی بلند لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی ۙ جو کچھ تم دوسروں کو دیتے ہو اسے احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر باطل نہ کر دو۔ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (۲/۲۶۴) اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کی خاطر دوسروں کو دیتا ہے (اس کا مطلب یہ ہے کہ) اسے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں۔ "اللہ اور آخرت" پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا بدلہ دوسروں سے طلب نہ کرے۔ حتیٰ کہ اس کا جذبۂ محرّکہ بھی یہ نہ ہو کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ ریاء اسی کا نام ہے۔ انفاق کا جذبۂ محرّکہ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (۲/۲۶۵) "قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اور صفاتِ الٰہیہ سے یک رنگی" ہونا چاہیئے جس کا فطری نتیجہ انسانی ذات کا استحکام تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۲/۲۶۵) ہوتا ہے۔

غور کرو سلیم! لوگ کہتے ہیں کہ اگر ذاتی مفاد (PRIVATE ENTERPRISE) اور ذاتی ملکیت (PRIVATE - PROPERTY) کو مٹا دیا جائے تو انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرّکہ (INCENTIVE) کوئی نہیں رہتا۔ یہ ٹھیک ہے۔ جب انسان اپنی زندگی اور اس کی تگ و تاز کا مقصد خود ہی متعین کر لے تو معاوضہ کے سوا کوئی چیز جذبۂ محرّکہ نہیں بن سکتی۔ لیکن جب اس کا مقصدِ حیات قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہو تو پھر کام (فرائض کی سرانجام دہی) خود جذبۂ محرّکہ بن جاتا ہے۔ اس کام میں وہ اپنی پوری پوری توانائی صرف کر دیتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی خارجی مہمیز کی ضرورت ہوتی ہے نہ نگران کی حاجت۔ اسی کو قرآن جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ (۲۲/۷۸) اور سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا (۱۷/۱۹) سے تعبیر کرتا ہے۔ بھرپور کوشش، پوری پوری جدوجہد جس میں ذرا سی کوتاہی اور کسلمندی نہ ہو۔ ان کی اس بے لوث سعی و عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی بھی ابدی خوشگواریوں کے جھولے جھولتی ہے۔ لیکن وہ زندگی کی ان خوشگواریوں کو بھی بطور معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ ان کے عمل کا مہمیز (INCENTIVE) یہ جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ جذبہ صرف (آشیانہ ساز چڑیا کی طرح) قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہوتا ہے۔ (یعنی وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار سے موافقت اور مطابقت)۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں توجّہ دلائی گئی ہے جنہیں میں پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں لیکن اسے ایک مرتبہ پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ (۹/۷۲)

مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ نے اس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ ان پُرآسائش باغات میں وہ خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے۔

یہ سب کچھ ان کے اعمال کی جزا (ان کے اندر چھپا ہوا نتیجہ) ہے۔ لیکن وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (۹/۷۲)، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی، صفاتِ الٰہیہ سے یک رنگی۔ اس سے بھی کہیں بڑا صلہ ہے: ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۷۲)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس کا فطری نتیجہ انسانی ذات (PERSONALITY) کا ثبات و استحکام ہوتا ہے اور یہی مقصودِ حیات ہے۔

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ "عالمِ روحانیت" میں تو شاید یہ باتیں ممکن ہوں، ہم "دنیا داروں" کے ہاں ان کا امکان کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہم "کام اور اُجرت" کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ مزدور کے سامنے سب سے پہلا سوال روٹی کا ہے۔ وہ اس سوال کو فراموش کر کے، بلا معاوضہ کام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ایسا کرے تو وہ اور اس کے بیوی بچے کھائیں کہاں سے؟

تمہارے اعتراضات بالکل بجا اور درست ہیں۔ لیکن قرآن اپنے اس نظام کو "روحانی دنیا" میں نہیں بلکہ خود ہماری "جسمانی دنیا" میں رائج کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ تم دنیا تیاگ کر بن باس اختیار کر لو اور وہاں ترکِ آرزو سے اُجرت اور معاوضہ کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہیں اسی دنیا میں رکھتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی کا سوال قدم قدم پر تمہارے سامنے آتا ہے۔ لیکن وہ انتظام ایسا کرتا ہے جس سے انسان کی ضروریاتِ زندگی اس انداز سے پوری ہوتی رہیں کہ کام کی اُجرت اور معاوضہ کا خیال ہی اس کے سامنے نہ آئے۔ وہ اسلامی نظام سے کہتا ہے کہ تم ہر کام کرنے والے کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دے دو کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس ضمانت سے اُجرت اور معاوضہ کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کام کی حیثیت محض فریضہ اور ذمہ داری کی رہ جاتی ہے۔ کام کرنے والے کو معاوضہ کی ضرورت اُس وقت تھی جب اُس نے اپنی اور اپنی اولاد کی روٹی کی فکر آپ کرنی تھی۔ جب یہ فکر دوسروں نے اپنے سر لے لی تو اس کے ذمے فرائض کی سرانجام دہی

رہ گئی۔ اب یہ اس کام کو، جو اس کے سپرد کیا جائے گا، اپنا فریضہ سمجھ کر پورا کرے گا۔ اس کے لئے نہ کسی خارجی جذبۂ محرّکہ کی ضرورت ہوگی، نہ کسی محاسب و نگران کی حاجت۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے اس مسئلہ کا حل کیا تجویز کیا ہے جو آج دنیائے معیشت میں اس قدر سردردی کا موجب بن رہا ہے؟ شاید تم کہہ دو کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں، ان کی ضروریاتِ زندگی بہرحال پوری ہوتی رہیں گی، تو وہ پوری تندہی سے کبھی کام نہیں کریں گے۔ ان سے مار مار کر کام لیا جا سکے گا۔ لیکن ایسا سمجھنے اور کہنے میں تم اس بات کو بھول گئے کہ قرآن ان لوگوں کا ذکر کر رہا ہے جنہوں نے اس طرزِ زندگی کو اپنے ایمان کی بناء پر اختیار کیا ہوگا۔ ان سے مار مار کر کام لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چڑیا کو کون مار مار کر اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دن بھر تنکے اکٹھے کرتی رہے! وہ یہ کچھ اپنے جذبِ دروں سے کرتی ہے اور انسان کی صورت میں اسی جذبِ دروں کا نام ایمان ہے۔ ایمان کی کیفیت یہ ہے: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

ہم چونکہ ایمان کی حرارت سے محروم ہیں، اس لئے یہ چیز ہمارے ذہن اور خیال میں بھی نہیں آ سکتی (اور اگر کوئی کہے بھی تو اس پر یقین نہیں آتا) کہ کوئی شخص معاوضہ اور اُجرت کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے۔ موجودہ ماحول میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہی ہے کہ جب تک کسی کے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہ ہو، وہ کسی کام کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جن میں ایک شخص (بظاہر) کسی ذاتی مفاد یا غرض کے بغیر کسی "نیک کام" میں مصروفِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جونہی کوئی حادثہ پیش آئے جس سے اس کے مضمر مفاد کو زد پہنچتی ہو، "بے لوث خدمت" کا شیشہ چُور چُور ہو جاتا ہے اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر ہوں یا مذہبی ریفارمر اور پیشوا، ہر ایک یہی دعویٰ لے کر اٹھتا ہے کہ میں کسی ذاتی مفاد کا خیال کئے بغیر محض خدمتِ خلق کے لئے میدانِ عمل میں آیا ہوں۔ لیکن (دل میں چھپے ہوئے مقصد میں) ناکامی کی دھیمی سی آنچ اس سارے ملمع کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ ان حالات میں ایسا باور کرنا فی الواقع مشکل ہو جاتا ہے کہ ذاتی مفاد کے جذبۂ محرّکہ کے بغیر بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جادۂ تاریخ پر ان لوگوں کے نقوشِ قدم بھی (ستاروں کی طرح جگمگاتے) دکھائی دیتے ہیں جو اپنی ساری عمر نوعِ انسانی کی بہبود میں صرف کر دیتے ہیں اور قدم قدم پر اس کا ثبوت بہم پہنچاتے جاتے ہیں کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا کہلاتے ہیں۔ انہی کی بے مزد

اطاعت اس معاشرے کا تخمِ اوّل (FIRST CRYSTAL) بنتی ہے جس سے عمل بلا اُجرت کے عظیم نتائج کے انبار لگ جاتے ہیں۔ یہی وہ انبار ہیں جن کے بھروسے پر' عوام کو اس کی ضمانت دی جاتی ہے کہ ___ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ إِيَّاهُمْ۔ اس ضمانت سے' ان میں عمل بلا اُجرت کا جذبہ بیدار ہونا اور استقامت پکڑتا ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس میں ان کا جذبۂ محرکہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہی ان کا "ذاتی مفاد" ہوتا ہے۔

لیکن یہ کچھ صرف ایمان کے جذبِ دروں سے ہو سکتا ہے اور آج یہ جذبِ دروں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج' دل پریشاں' سجدہ بے ذوق کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

یہ "جذبِ اندروں" ایمان ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ایمان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۶۵) اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور "إِلٰه" نہ ہو۔ تم شاید یہ کہہ دو گے کہ اس معیار پر تو ہم سب کا ایمان پورا اُترتا ہے۔ وہ کون سا مسلمان ہے جو خدا کے سوا اور کسی کی پرستش کرتا ہے؟ ہم میں سے کوئی بھی بتوں کو نہیں پوجتا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن قرآن کی رُو سے توحید (خدائے واحد پر ایمان) کی سطح اس سے کہیں اونچی ہے۔ جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ہو' خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر عمل "اللہ کے لئے" ہو اور اس کے سوا اُس کے سامنے کوئی اور مقصود اور مطلوب نہ ہو۔ اگر اس کے دل میں اپنی خواہشات کا شائبہ بھی آ گیا تو وہ توحید پرست نہ رہا۔ یہ "شرک" کی وہ غیر محسوس و غیر مرئی (لیکن سب سے زیادہ خطرناک) شکل ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط (۲۵/۴۳) کیا تُو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات (وجذبات) ہی کو اپنا إِلٰه بنا لیا؟ یہ ہے وہ إِلٰه جس کا پرستار اپنی خدمات کا معاوضہ جاہ و منصب' تعریف و ستائش' عزت و افتخار' لیڈری اور عہدہ داری' عقیدت و ارادتمندی مانگتا ہے۔ وہ خدمتِ خلق کے کام میں اس وقت تک سرگرمِ عمل رہتا ہے جب تک اس کے اپنے إِلٰه کی پوجا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جونہی اس پر زد پڑتی ہے' وہ یوں پلہ جھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے گویا اُسے اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ نہیں! بلکہ وہ (اپنی علیحدگی کے فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے) خود اُس کام کی مخالفت پر اُتر آتا ہے اور اس کے جواز میں طرح طرح کی دلیلیں تراشتا ہے۔

یہ ہیں وہ "غیر اللہ کے پرستار" جو انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں. یہ منافقت کی بدترین شکل ہے. (لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں)۔

اب تم پھر وہی پرانا سوال لے کر آجاؤ گے کہ یہ ایمان کس طرح پیدا ہوتا ہے اور میں پھر وہی جواب دُہرا دوں گا کہ جس ایمان کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) اُس ایمان کے متعلق یہ پوچھنا کہ یہ کہاں سے ملے گا اور کیسے پیدا ہوگا، بچپن نہیں تو اور کیا ہے؟ ایمان اپنے چاہنے سے پیدا ہوتا ہے اور ؎

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہوں

۸ مارچ ۱۹۵۸ء

والسلام
پرویز

سترہواں خط

غلامی سے بتر ہے بے یقینی

یہ درست ہے سلیم! کہ ہمارے معاشرے کی آج حالت یہی ہوچکی ہے کہ

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

لیکن چیچک کے علاج کے لئے ایک ایک آبلے پر پھاہا نہیں رکھا جاتا. جسم کے اندر ایک (جراثیمی) خرابی ہوتی ہے اس کا علاج کر دیا جائے تو تمام زخم خود بخود مندمل ہوجاتے ہیں. ہمارے معاشرے کی ایک ایک خرابی کا الگ الگ علاج نہیں ہوگا. اس کے مرکزی بگاڑ کا علاج ہوگا جس سے یہ لاتعداد خرابیاں جن کی کثرت ہمیں آج اس طرح ڈرا رہی ہے کہ ہم ان کے علاج کی طرف سے مایوس ہوجاتے ہیں، خود بخود ٹھیک ہوجائیں گی. سوال یہ ہے کہ یہ مرکزی بگاڑ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے. اس لئے کہ اگر اس کی صحیح تشخیص ہوجائے تو پھر مرض کا علاج چنداں مشکل نہیں ہوگا.

مرکزی بگاڑ کے متعلق بھی میں تمہیداً یہی کہوں گا کہ ؎

تفصیلِ معنیٔ غمِ اُلفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اِک دِل میں درد ہے

میرے نزدیک بگاڑ کے اس مرکزی نقطہ کے متعلق مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہماری قوم اپنے ظاہر و باطن میں بے حد تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے. اس سے اس کے تشخص (PERSONALITY) میں تشتت و انتشار (DISINTEGRATION) واقع ہوگیا ہے. اس تشتت و انتشار کو منافقت یا (DUAL-PERSONALITY) کہتے ہیں. یاد رکھو سلیم! ایمان (اسلام) بھی اپنے نتائج رکھتا ہے اور کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے. لیکن منافقت

کا نتیجہ فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تصور و خیال کا فریب، عمل و کردار کا فریب۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب زندگی یکسر فریب ہو جائے تو پھر کون سا گوشۂ حیات ہے جو تعمیری نتائج کا حامل ہو سکتا ہے؟ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم جو کچھ زبان سے کہتے ہیں اس پر ہمیں دل سے یقین نہیں اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں۔ نتیجہ اس کا وہ اطمینان سوز جہنم ہے جس میں ہم من حیث القوم مبتلا ہیں اور جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ آؤ تمہیں دو ایک مثالوں سے سمجھاؤں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب کیا ہے۔ غور سے سُننا کہ یہ بڑی اہم حقیقت ہے جس کے متعلق غالباً میں پہلی بار تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔

ہم نے اوائل بیسویں صدی سے یہ کہنا شروع کیا کہ ؎

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

یہاں تک کہ تہذیبِ حاضر نے جو بُت تراشے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا،

اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ہماری ہمدردیاں کبھی ہندوستان کی چار دیواری کے اندر بسنے والے مسلمانوں تک محدود نہیں رہیں۔ یہ ہمیشہ حدود فراموش اور قیود نا آشنا رہیں۔ ہماری حالت یہ تھی کہ طرابلس کے ریگستانوں میں کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چُبھتا اور ہماری آنکھ کے آبگینہ میں خون جھلک پڑا۔ ایران کے لالہ زاروں میں کسی فرزندِ توحید کی توہین ہوئی اور ہم پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ سمرنا میں کوئی ترک خاتون بیوہ اور اس کا بچہ یتیم ہو گیا تو ہم نے آہِ نیم شبی اور نالۂ سحر گاہی سے آسمان تک کو ہلا دیا۔ تم اُس زمانے میں بچے تھے۔ ورنہ جب یونانیوں نے ترکوں پر حملہ کیا اور ترک موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہو گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے جس کرب و درد سے چیخ و پکار کی تھی۔ اگر تم نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو تم اس کی شہادت دیتے کہ جو کچھ میں نے اُوپر کہا ہے وہ "شاعری" نہیں ایک حقیقت کا بیان ہے۔

غرضیکہ ایک مدت تک ہماری یہی حالت رہی کہ ہم نے اسلام کی عالمگیر برادری کے راستے میں وطن کی چار دیواری کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی گئی کہ

اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی یکسانیت (دین) ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں تھی۔ یہ اُن کی مدتوں کی جانی پہچانی آواز تھی جو عرصہ دراز سے ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر فضائے عالم کو مرتعش کرتی چلی آرہی تھی۔

کامل دس برس تک ہم قرآن کے اس پیغامِ عظیم کو دُنیا کے کونے کونے تک پہنچاتے رہے کہ اسلام میں قومیت کی تشکیل، دین کے اشتراک کی بناء پر ہوتی ہے۔ وطن، نسل، رنگ، زبان کے اشتراک سے نہیں ہوتی یعنی اسلام کی رُو سے، ہندوستان اور مراکش میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں اور ایک شہر میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم دو مختلف قوموں کے افراد۔

دس برس کی اس پیہم پکار کے بعد ہمیں پاکستان مل گیا۔ لیکن پاکستان ملنے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے ایسی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں جو اس امر کی صاف غمازی کرتی تھیں کہ معیارِ قومیت کے متعلق جو کچھ ہم دس برس سے مسلسل کہتے چلے آرہے تھے اس پر ہمیں یقین نہیں تھا۔ وہ ہمارے دل کی آواز نہیں تھی لیکن ہم اس کا کھلے بندوں اعتراف بھی نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے قول اور عمل میں تضاد واقع ہونا شروع ہو گیا۔ مثلاً ہم زبان سے افغانی، ایرانی، عراقی، نجدی، شامی، مصری مسلمانوں کو اپنا بھائی اور ایک برادری کے افراد کہتے تھے۔ لیکن عملاً ان پر پاکستان کی شہریت (CITIZENSHIP) کے دروازے بند کر رہے تھے اس کے برعکس، ہم پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو مسلم قومیت کے دائرے سے باہر بھی قرار دے رہے تھے اور اس کے ساتھ انہیں پاکستانی قومیت کے پورے حقوق بھی دیئے جا رہے تھے۔ یہ اسی دو دِلی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ انتخابات جداگانہ ہوں گے اور دوسری طرف ہم مجالسِ قانون ساز میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے۔ مختصراً یہ کہ اس دس سال میں حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو کہ مسلمانوں میں قومیت کا مدار اشتراکِ دین ہے، اشتراکِ وطن نہیں۔ لیکن اس کی جرأت بھی شاید ہی کسی کو نصیب ہو کہ وہ اپنے اس عقیدے کا کھلے بندوں اعلان کر دے۔

اس داخلی کشاکش کا سب سے زیادہ مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ ہم پاکستانی نہ تو قرآن کے بلند آئیڈیل کے مطابق ایک عالمگیر مسلم قوم بن سکے ہیں اور نہ ہی نیشنلزم کے عام تصور کے مطابق، پاکستان کی حدود کے اندر ایک قوم کے پیکر میں ڈھل سکے ہیں۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اگر کسی مملکت میں سات آٹھ کروڑ نفوس محض افراد کی

حیثیت سے بستے ہوں اور وہ قومیت کے (بلند قرآنی یا پست وطنی) تصوّر کے تحت ایک قوم نہ بن سکے ہوں تو اس مملکت کی حالت کیا ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں قومیّت کی اجتماعی زندگی کا شعور ہی موجود نہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو کبھی ایک قوم کا جزو محسوس نہیں کیا۔ ہم سب انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ نہ چھوٹے کے سامنے نہ بڑے کے، نہ ادنیٰ کے سامنے نہ اعلیٰ کے، نہ غریب کے سامنے نہ امیر کے، نہ افسر کے سامنے نہ ماتحت کے، نہ مسٹر کے سامنے نہ مولانا کے، نہ دیانت دار[1] کے سامنے نہ بددیانت کے۔ جب تک ہم میں قومی شعور بیدار نہیں ہوتا پاکستان کی فلاح و بہبود کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی۔ ملک کے چند افراد یا خاندانوں کا بے حد دولت مند ہو جانا اور ہوتے چلے جانا ملکی بہبود کا آئینہ دار نہیں ہوا کرتا۔

اس انتشار (CHAOS) سے نکلنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر ہم مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر یقین ہونا چاہیئے کہ مسلم قومیّت کا معیار اشتراکِ دین ہے اور ہمیں اس معیار کے مطابق ایک اُمت اور ایک ملت بننا ہے۔ اور اگر ہم اس پر یقین نہیں رکھتے کہ قومیّت کا معیار اشتراکِ دین ہے تو ہمیں کھلے بندوں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے اور اشتراکِ وطن کی بنا پر پاکستان کی حدود میں بسنے والوں کو ایک قوم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سے اگر ہم امتِ مسلمہ یا ملتِ اسلامیہ نہیں بن سکیں گے تو (کم از کم) دنیا کی دوسری قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل تو ہو سکیں گے۔ یہ حالت بہرحال، ہماری موجودہ حالت سے بہتر ہوگی۔ ہم اسلام کی جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے (اور یہ ہماری انتہائی بدبختی ہوگی) لیکن منافقت کے جہنم کے درکِ اسفل سے تو نکل جائیں گے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ (۴/۱۴۵)۔ قرآن نے منافقین کا مقام جہنم کا درکِ اسفل (سب سے نچلا درجہ) بتایا ہے اور اس کی شہادت خود ہماری حالت دے رہی ہے بشرطیکہ ہمیں قیامتِ امروزہ اور جہنمِ موجودہ کے دیکھنے کی ہمت ہو جائے۔

---

[1] ہماری دیانت داری، مستقل اقدار کے اتباع کی تو کجا، قومی مفاد کے جذبہ کی پیدا کردہ بھی نہیں۔ محض لاشعوری رجحان طبیعت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کو دیانتداروں کی نااہلی اور غلط نگہی سے بھی اسی قدر نقصان پہنچ رہا ہے جس قدر بددیانتوں کی بددیانتی سے۔

یادرکھو سلیم! میں یہ کچھ ملک کے ان لوگوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جو اسلام کی حقانیت اور اس کے اصولوں کی محکمیت پر دل سے یقین نہیں رکھتے. جنہیں ان پر یقین ہے انہیں بہرحال اسی یقین پر زندہ رہنا، اسی کی پکار کو بلند کئے جانا اور یہی کچھ کرتے ہوئے یہاں سے آگے چلے جانا ہے. لہٰذا ان کے لئے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر وہ اسلام کے نصب العین پر یقین نہیں رکھتے تو کفر کے معیاروں کے مطابق زندگی ڈھال لیں.

اب آگے بڑھو. پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ ہم یہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو. یہی وہ دعویٰ تھا جس کی بنا پر ہم متحدہ ہندوستان کے تصور کو یہ کہہ کر رد کیا کرتے تھے کہ اس قسم کی مخلوط حکومت میں ہم اپنے دینی تصور کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے لیکن جب پاکستان مل گیا تو ہم نے اپنے اس دعوے سے گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں. اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ

۱. ہم میں ایک طبقہ ایسا ہے (خواہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو) جو اسلام کی طرف سے قطعاً مایوس ہے اور اس کے قوانین و اقدار کو عہد پارینہ کی داستانیں سمجھتا ہے.

۲. دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو حقیقی اسلام سے مایوس نہیں، لیکن اسلام کے نام پر جو کچھ ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کے خلاف ہے.

لیکن حالت یہ ہے کہ نہ اول الذکر طبقہ میں یہ جرأت ہے کہ وہ اسلام سے اپنی مایوسی کا اعلانیہ اظہار کر کے کوئی اور روش اختیار کرے اور نہ ثانی الذکر کو یہ بیباکی عطا ہوئی ہے کہ وہ قدامت پسند طبقہ کے خلاف جو کچھ اپنی خلوتوں میں کہتے ہیں وہ کچھ جلوتوں میں بھی کہیں. اتنا ہی نہیں، وہ قدامت پرست طبقہ (یا اُن کے زیر اثر عوام میں "پاپولر" ہونے کے لئے ان تمام رسومات کو ادا کرتے اور ان تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جن کے وہ دل سے خلاف ہیں اور جن کا وہ اپنی پرائیویٹ محفلوں میں مذاق اڑاتے رہتے ہیں.

ظاہر ہے کہ جو لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جرأت سے کام نہیں لے سکتے وہ بڑی بڑی مہمات میں بیباکی اور بلند حوصلگی سے کس طرح کام لے سکتے ہیں؟ منافقت کی زندگی جرأتوں کو مفقود اور حوصلوں کو پست کر دیتی ہے اور یہ وہ مرض ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے میں عام ہو رہا ہے.

ان سے آگے بڑھو تو ہمارا مذہب پرست طبقہ آتا ہے. ان کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک

طرف یہ قرآن کے متعلق یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ یہ دنیا کی بے مثل و بے نظیر کتاب ہے جس میں زندگی کے تمام معاملات کا بہترین اور مکمل حل دیا گیا ہے اور دوسری طرف ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ کتاب (معاذاللہ) تضادات سے بھری ہوئی ہے، نامکمل ہے، مبہم ہے، غیر واضح ہے، غیر مربوط ہے، ناقابلِ فہم ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنی آسمانی کتاب کے متعلق اس قسم کے متضاد عقائد کی حامل ہو وہ زندگی کے دیگر معاملات میں کس طرح یکسو ہو سکتی ہے؟

اب تم ان بلند طبقات سے نیچے اُتر کر، عام لوگوں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ وہ کس بُری طرح بے یقینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم نے اگلے دنوں "چوہدری حاکم علی" کی باتیں سُنی تھیں۔ یہ شخص بڑا دیانتدار ہے۔ تقسیم ہند کے وقت جب یہ لاہور آیا ہے تو اس کا حلقۂ اثر اتنا وسیع تھا کہ اگر یہ چاہتا تو کئی کوٹھیاں الاٹ کرا لیتا اور لاکھوں کا مال سمیٹ لیتا۔ لیکن اس نے ایک تنکا بھی اپنے لئے نہیں لیا۔ یہ بڑی حوصلہ مندی اور ہمت کا کام تھا۔

لیکن تم نے دیکھا کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا؛ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے اس وقت ایسی "حماقت" کیوں کی اور کیوں نہ دوسروں کی طرح لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیا؟ یعنی دیانتدار ہونے کے باوجود، اسے اس بات پر یقین نہیں رہا کہ دیانتداری واقعی اچھا اصول ہے۔ اسے اس پر فخر ہے کہ اس نے ایسے وقت دیانتداری سے کام لیا جب بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل رہے تھے لیکن اسے دیانتداری کی محکمیت پر یقین نہیں رہا۔ اسے اپنی روش کی صداقت پر ایمان نہیں رہا۔ وہ اگرچہ اب عملاً کسی لوٹ کھسوٹ میں حصہ نہیں لے سکتا، کیونکہ اب اس کا موقع ہی نہیں رہا۔ لیکن اسے اس پر یقین نہیں رہا کہ لوٹ کھسوٹ بُرا کام ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔ لہٰذا، وہ دیانتدار ہونے کے باوجود بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا قلب اس صحیح اطمینان سے محروم ہو چکا ہے جو اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو کسی کام کو زندگی کا اصول اور فریضہ سمجھ کر کرے اور اس کے بعد اسے خواہ کتنے ہی نقصانات کیوں نہ ہوں اُسے اس پر کبھی افسوس نہ آتے کہ میں نے اصول پرستی سے کیوں کام لیا!

یاد رکھو سلیم! چوہدری حاکم علی ایک فرد نہیں بلکہ وہ پاکستان کے ایک ایسے عظیم طبقہ کا ترجمان ہے جس نے تقسیم کے وقت بڑی دیانتداری سے کام لیا تھا، جو اب اپنے اُس فیصلے اور عمل پر متاسف ہے اور اس طرح

زندگی کی بلند اقدار سے اس کا یقین اُٹھ چکا ہے۔

تم "حاجی روشن دین" کو جانتے ہو؟ پانچ چھ سال ہوئے اس نے بساط خانے کا مختصر سا کاروبار شروع کیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ وہ حلال کی روزی میں حرام کا چھینٹا بھی نہیں پڑنے دے گا۔ اس کے متعدد اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ کسی کو رشوت نہیں دے گا۔ پچھلے سال جب وہ حج کے لئے چلا ہے تو کاروباری سلسلہ میں اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک سخت غلطی کی تھی جس کا خمیازہ بُری طرح بھگتا۔ تم میرے تجربے سے فائدہ اٹھانا اور ایسی غلطی نہ کرنا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ میں نے تہیہ کیا تھا کہ کسی کو رشوت نہیں دوں گا۔ میں اپنے اس فیصلے پر قائم تو رہا، لیکن اس کی وجہ سے جس قدر پریشانیاں اٹھائیں اور نقصانات برداشت کئے، ان کے پیش نظر اب میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے بڑی حماقت کی۔ تم نے وہی کچھ کرنا جو باقی دُنیا کرتی ہے۔ بڑے آرام سے رہو گے اور نقصان سے بچو گے۔ دس روپے رشوت دے دینے سے سو روپے کا فائدہ ہو جاتا ہے اور انسان بک بک جھک جھک سے الگ چھوٹتا ہے۔ میں تو جب تک ہو سکے گا اپنی بات کو نبھاؤں گا لیکن تم ایسی غلطی نہ کرنا۔

دیکھا تم نے سلیم! کہ ہم میں سے جو شخص اس اصول پر قائم ہے کہ وہ رشوت نہیں دے گا، وہ بھی دل سے اپنے اصول کی صداقت کا قائل نہیں۔ وہ دیانتداری میں بھی بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا سینہ ہر وقت کشمکش پیہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ اصول پرستی اس کے لئے "سانپ کے مُنہ میں چھپکلی" کی طرح ہو چکی ہے کہ "اُگلے تو لاجوں مرے، نگلے تو کوڑھی بنے۔"

میں نے تمہیں دو چار مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ کس طرح بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ان مثالوں پر غور کرنے کے بعد تم اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ کتنے ہیں جن کے قلب و زبان میں ہم آہنگی اور عقیدہ و کردار میں یک رنگی ہے۔ کتنے ہیں جو زبان پر وہ کچھ نہیں لاتے جو دل میں محسوس کرتے ہیں تاکہ عوام میں (UN-POPULAR) نہ ہو جائیں۔ کتنے ہیں جو غلط باتوں سے اجتناب کرتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ وہ باتیں اصولاً غلط ہیں بلکہ اس لئے کہ اس سے مقبولیت بڑھتی ہے۔ کتنے ہیں جو بددیانتی سے بچتے ہیں لیکن دل میں اس پر متاسف ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس، کتنے ہیں جو ہر قسم کا نقصان برداشت کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مطمئن ہیں کہ ہم نے اصول پرستی کی خاطر یہ نقصانات برداشت کئے

ہیں اور ایسے نقصانات برداشت کرتے رہیں گے، لیکن اصولوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ سوچو سلیم! کہ ہمارے معاشرے میں کتنے ہیں جو زندگی کی مستقل اقدار پر اس قسم کا یقین رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو معاشرہ اس طرح بے یقینی کے جذام میں مبتلا ہو جائے اس سے کسی صحت مندانہ اقدام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ اس سے کوئی تعمیری کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے

جس ملت کے افراد کی یہ حالت ہو کہ انہیں نہ کسی اصولِ زندگی پر یقین ہو، نہ ضابطۂ حیات پر ایمان۔ وہ زبان سے جس روش پر عقیدہ ظاہر کرتے ہوں دل سے اس کی صداقت کے قائل نہ ہوں۔ وہ کہتے کچھ ہوں اور چاہتے کچھ اور۔ سوچو! کہ ایسے افراد کے ہاتھوں ملت کی بہبود کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ جس معاشرے میں نہ لیڈر اپنی سیاست پر یقین رکھتا ہو، نہ مولوی اپنی شریعت پر ایمان۔ نہ "دیانت دار" اپنی دیانت کی صداقت کو دل سے مانتا ہو، نہ "اصول پرست" اپنے اصولوں کی سچائی پر مطمئن۔ نہ کام کرنے والا افسر یہ کہہ کر سکھ کی نیند سوئے کہ میں نے اپنے فرائض کو پوری دیانت داری سے سرانجام دے دیا۔ نہ ایماندار کاروباری اس پر خوش کہ اس نے نقصان اٹھا لیا لیکن دیانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُس معاشرے سے یہ امید رکھنا کہ وہ مفادِ خویش سے آگے بڑھ کر اجتماعی مفاد کی خاطر بطیبِ خاطر قربانیوں کے لئے تیار ہو جائے گا، خود فریبی کے سوا اور کیا ہے؟ جس معاشرے میں ہر "نیکوکار" کو اپنی نیکوکاری پر افسوس آ رہا ہو اور ہر "دیانتدار" اپنی دیانت داری پر متاسف ہو، اس سے ان حسنات کی توقع رکھنا جن کا سرچشمہ دل کا یقین اور قلب کا اطمینان ہوتا ہے، اپنے لئے سامانِ حسرت خریدنا ہے۔ اس قسم کے معاشرے میں قومیں زندگی سے محروم اور سرفرازیوں سے بے گانہ رہ جاتی ہیں۔ نہ ان کی کشتِ امل پر سحابِ کرم کی گہرباری ہوتی ہے، نہ ان کے کاشانوں پر رحمتوں کا نزول۔ قرآن نے رحمتوں کے نزول کے لئے ایک ہی جاذبہ بنایا تھا اور وہ یہ کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰) "جن لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا نشو ونما دینے والا اللہ ہے اور پھر (اپنے اس عقیدہ پر) استقامت سے جم کر کھڑے ہو گئے ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف اور حزن نہ کرو اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔" یعنی وہی قوم خوف و حزن سے محفوظ اور زندگی کی خوشحالیوں اور سرفرازیوں سے شادکام ہوتی ہے جس کے افراد اپنے عقیدہ پر جم کر کھڑے ہو جائیں۔

اس کی صداقت پر یقینِ محکم ہو۔ ان کا یقین سکون و طمانیت کی ہزار جنتیں ان کے سینوں میں آباد کر دیتا ہے اور اس کے زندہ و تابندہ نتائج زندگی کی فردوس بداماں خوشگواریوں کی شکل میں ہر آن سامنے آتے رہتے ہیں۔

یہ ہے سلیم! ہمارا اصلی مرض اور یہ ہے اس مرض کا صحیح علاج۔ یعنی اپنے نظریاتِ حیات پر محکم یقین اور اپنے تصوراتِ زندگی پر غیر متزلزل ایمان۔ جب قوم کے افراد کے دل میں اپنے تصورات و نظریات کے متعلق اس قسم کا کوہ آسا یقین پیدا ہو جائے تو پھر دیکھو کہ ان کا یہی ساز و سامان کس قسم کے کہکشاں گیر نتائج پیدا کرتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس قسم کے یقین کے بغیر نہ ہم ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوششیں کوئی نتیجہ مرتب کر سکتی ہیں۔ قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے۔ ایسا یقین جس میں کسی قسم کا ریب و تشکیک اور تذبذب و تزلزل نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، ہمارا کوئی عمل بارآور نہیں ہو سکتا۔

اب تم یہ پوچھو گے کہ موجودہ حالات میں افرادِ قوم کے دل میں اس قسم کا یقین پیدا کیسے کیا جائے؟ تفصیل اس اجمال کی بھی طویل ہے لیکن ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ یقین پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم سے، اور ہمارے ہاں ؏

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

کہنے والے نے غلط نہیں کہا تھا کہ ؏

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

خود قرآن نے بھی داعیٔ انقلاب کا بنیادی فریضہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ بتایا تھا۔ لہٰذا، اگر ہم نے مسلمان قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن کی تعلیم کو عام کر دیں۔

لیکن قرآن کی تعلیم سے مراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مذہبی مدارس میں "دینی علوم" کی شکل میں دی جاتی ہے اور جو طلباء کو قرآن سے بیگانہ ہی نہیں بنا دیتی، بلکہ اس پر ان کا ایمان بھی ختم کر دیتی ہے۔ قرآن کی تعلیم ایسی ہونی چاہئیے کہ متعلم، علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلا شک و شبہ یہ کتاب عظیم نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل اس کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

اس کا دل اس پر گواہی دے کہ اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے سے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں اور کامرانیاں نصیب ہوتی ہیں اور اس کے خلاف جانے سے فرد (اور قوم) کی انسانی زندگی کی اسی طرح موت واقع ہو جاتی ہے جس طرح سنکھیا کھانے سے اس کی طبیعی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے یقین کے بغیر ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں جن میں ہمارا معاشرہ گھر چکا ہے۔

اگست ۱۹۵۸ء

والسلام

پرویز

کتبہ عبدالجبار

سلیم کے نام خطوط (جلد دوم) کے موضوعات

۱۔ خدا کا تصوّر
۲۔ مقامِ محمدؐی
۳۔ کائنات کے دو عظیم اِنقلاب!
۴۔ عید میلاد النّبیؐ
۵۔ رحمتہ اللعالمینؐ
۶۔ درُود کا مفہوم
۷۔ اطاعتِ رسُولؐ
۸۔ اِسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ
۹۔ پاکستان میں قانون سازی کا اُصول
۱۰۔ جشنِ نزولِ قُرآن
۱۱۔ اندھے کی لکڑی
۱۲۔ فرقے کیسے مِٹ سکتے ہیں؟

ضخامت ۳۴۰ صفحات

سلیم کے نام خطوط (جلد سوم) کے موضوعات

ضخامت ۳۳۴ صفحات